

اداریہ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

منی ناول

افسانے

عورت کہانی

خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200

پبلشر و پرنٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



قارئین کرام
السلام علیکم!

یہ ایک آفاقی کلیہ ہے کہ کوئی بھی قوم صرف مذہب، زبان، رنگ یا نسل کی بنیاد پر ایک مضبوط قوم نہیں بنتی بلکہ ایک ہی جذبے کے حامل افراد ایک مکمل قوم کہلاتے ہیں کہ جن میں تعمیری سوچ، مادر گیتی سے محبت اور مثبت طرز فکر مشترکہ طور پر موجود ہو۔ قوموں میں جذبۂ حمیت و غیرت جبھی پروان چڑھتا ہے جب اپنی سرزمین کی ترقی اور امن کی بہتری کے لیے مشترکہ طور پر دل سے خواہاں ہوں۔ انسان تو کیا اپنے آس پاس کی جاندار حتیٰ کہ بے جان مخلوق کی بھی حفاظت کی ذمے داری محسوس کرتے ہوں۔

کسی بھی قوم میں مختلف النسل، رنگ، زبان اور مذہب کے افراد شامل ہوتے ہیں اگرچہ انفرادی طور پر ان کی سوچیں اور مقاصد جدا، جدا ہوں مگر اجتماعی طور پر وہ اس زمینی حدود جسے "ملک" کہتے ہیں کے وفادار ہوتے ہیں جہاں وہ آزادی سے اپنے امور انجام دیتے ہیں اور اس کی فلاح و بہبود، نیک نامی اور عزت و وقار کے لیے ہمیشہ یک زبان، یک جان اور یک قدم نظر آتے ہیں اور یہی دراصل ایک مضبوط اور مستحکم قوم کی نشانی ہے۔

آج شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے ایک سو اکتالیسویں یوم پیدائش کی مناسبت سے اتنا ضرور کہیں گے کہ ہمیں اس عظیم شاعر کی بیدار اور پیغام خودی دیتی شاعری کے مفہوم کو عملی طور پر اپنانے کی اشد ضرورت ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

مدیرہ
نزہت اصغر

کیا وہ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے، اور وہ خود ہی پیدا کیے جاتے ہیں۔(۱۹۱) اور نہ وہ ان (شریک ٹھہرانے والوں) کی مدد کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، اور نہ وہ اپنی ذات ہی کی مدد کرتے ہیں۔(۱۹۲) اور اگر تم انہیں راہِ راست کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پیروی نہیں کریں گے۔ تمہارے لیے (دو باتیں) برابر ہیں خواہ تم ان کو بلاؤ، یا تم خاموش رہو...... (۱۹۳) یقیناً وہ جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو تمہاری ہی مانند بندے ہیں۔ پس تم ان کو پکارو، اور اگر تم سچے ہو تو چاہیے کہ وہ تمہیں جواب دیں۔(۱۹۴) کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں۔ یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ گرفت کرتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔ (اے رسول) کہہ دو کہ تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، پھر مجھ سے چالیں چلو۔ اور مجھے مہلت نہ دو۔(۱۹۵) بے شک میرا سرپرست وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے کتاب نازل کی۔ اور وہی نیکوکاروں کی سرپرستی کرتا ہے۔(۱۹۶) اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو، وہ تمہاری مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور نہ وہ اپنی ذات ہی کی مدد کرتے ہیں۔(۱۹۷) اور اگر تم ہدایت کی طرف بلاؤ گے، تو وہ نہیں سنیں گے۔ اور تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں، حالانکہ وہ کچھ نہیں دیکھتے ہیں۔(۱۹۸) تو عفو کو اختیار کر اور نیکی کا حکم دیتا رہ۔ اور جاہلوں سے منہ پھیرے رکھ(۱۹۹) اور جس وقت شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ تمہیں ابھارے تو تم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے۔(۲۰۰) بے شک وہ لوگ جو پرہیزگاری کرتے ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے۔ تو وہ (احکامِ خدا کو) یاد کرلیا کرتے ہیں۔ پھر وہ اسی وقت سوجھ والے ہو جاتے ہیں۔(۲۰۱) اور ان کے بھائی بند انہیں گمراہی میں کھینچے لیے جاتے ہیں۔ پھر وہ کوئی کمی نہیں کرتے۔(۲۰۲) اور جب تم ان کے پاس کوئی آیت نہ لاؤ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ تو خود چن کر کیوں نہیں لے آتا۔ کہہ دو کہ ماسوا اس کے نہیں ہے کہ میں تو اسی بات کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں بصیرت کی باتیں اور ہدایت اور رحمت ہیں(۲۰۳) اور جس وقت قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو، اور (خاموش رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔(۲۰۴) اور اپنے دل میں اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ، اور ڈرتے، ڈرتے اور بات کو اونچی آواز سے کہنے کے سوا صبح اور شام یاد کرتے رہو اور بے خبر دل میں سے نہ ہونا۔(۲۰۵) بے شک جو لوگ تمہارے پروردگار سے قربت رکھتے ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور وہ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور اسی کو سجدے کرتے ہیں۔(۲۰۶)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۹۔ آیات ۱۹۱ تا ۲۰۶)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ مَّنْ وَّعَدْتَّہٗ اَنْ یَّرْضٰی ؕ

سید کونین، خاتم النبیین، سید المرسلین، افضل الانبیا نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام۔ سیدنا مرتضیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم برگزیدہ و پسند کیے گئے کے ہیں۔

تفصیل مفہوم: علامہ زرقانی نے اس اسم پاک کے معنی یہ لکھے ہیں۔ وہ مقدس ذات جس پر اللہ راضی ہو یعنی ان سے محبت فرمائے اور ان کو پسند فرمائے کیونکہ اس کا مادہ، ارتضیٰ سے ہے جس کا مفہوم برگزیدہ، محبوب اور پسند کیے ہوئے ہے۔

1۔ القرآن: ترجمہ: اور عنقریب تمہارا پروردگار تمہیں وہ کچھ دے گا کہ تم راضی (خوش) ہو جاؤ گے۔ (سورۂ ضحیٰ آیت ۱۳۰)

2۔ الحدیث: حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اثنائے کلام میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کے پروردگار نے کہا کہ میں نے تجھے اپنا حبیب اور خلیل بنایا اور تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا اور تیرا سینہ کھولا اور تیرا بوجھ اتارا اور تیرے ذکر کو بلند کیا۔ میری توحید کے ساتھ تیری رسالت و عبدیت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے اور تیری امت کو خیر الامم اور امتِ متوسطہ، عادلہ و معتدلہ بنایا۔ شرف اور فضیلت کے لحاظ سے اولین اور ظہور و وجود کے حساب سے آخرین بنایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سے کچھ لوگ ایسے بنائے کہ جن کے دل اور سینے انجیل ہیں۔ یعنی اللہ کا کلام ان کے سینوں اور دلوں پر لکھا ہوا ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وجود نورانی و روحانی کے اعتبار سے اول النبیین اور بعثت کے اعتبار سے آخر النبیین بنایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سورۂ فاتحہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حوضِ کوثر عطا کی اور آٹھ چیزیں خصوصی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو دیں، اسلام اور مسلمان کا لقب، ہجرت اور جہاد، نماز، صدقہ، صوم رمضان اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور آپ کو فاتح اور خاتم بنایا یعنی اول الانبیاء اور آخر الانبیا بنایا۔ (خصائص الکبریٰ)

3۔ الرائے: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں خدا کی مرضی کی تنفیذ و اشاعت کے لیے سب سے بڑے ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ انہوں نے اپنے پیش رو انبیاء کی طرح محسوس کرلیا تھا کہ تمام بنی نوع انسان ایک دن ایک ملتِ واحدہ بن کر رہے گی۔ ایک خدا کے ماتحت ایک حکومت وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ (سپالڈنگ)

4۔ الفضائل: نماز عصر کی ادائیگی کے بعد سو مرتبہ یہ اسم پاک سیدنا مرتضیٰ پڑھنے والا تمام آفات ارض و سماء سے محفوظ رہے گا۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس)

...... پہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یا رہاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .
آج کا انسان بہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا . . .
عبادات، معاملات . . .
جنت گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 28

''محترمہ...... آپ سے گزارش ہے کہ ذرا سا غور کرلیں کہ آخر'' شوہر'' خریدے کیوں جاتے ہیں...... بیچارے خریدنے والے کی کوئی مجبوری ہوتی ہوگی۔'' ساحل جیسے تیز طرار ...... مستعد، حاضر دماغ و حاضر جواب کے سامنے زارا جیسی کم عمر، خرد ماغ اور بے سوچے سمجھے بولنے والی لڑکی کیا ٹکتی تھی...... زارا تو جیسے سناٹے میں رہ گئی۔

جب انسان اپنی ذات کے اچھوتے پن سے نا آشنا دوسروں کی نظر سے خود کو دیکھنے کا عادی اور اپنے بودے پن کے خوف میں مبتلا ہو تو ویسے بھی ہر وقت اپنی طرف اٹھتی غائبانہ انگلیوں کو محسوس کر کے ایک خیالی جنگ و جدل میں مصروف رہتا ہے۔ ایسے لوگ بہت زور شور سے لڑتے ہیں...... اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ سامنے والے کو

بس شور مچا کر خاموش کرادیں اس کے اندر رگ، رگ میں ساحل نے بارود جھونک کر تیلی دکھادی تھی۔

"what do you mean...?" وہ لڑنے مرنے کو تیار ہوگئی۔

''میں اندھی، کانی، لولی، لنگڑی، جاہل، غریب، بیمار ہوں...... جو میری اماں نے مجبوراً تمہاری ''خریداری'' کی ہے؟''

''یار نکاح کے بعد کون لڑتا ہے......؟ شادی کے بعد لڑتے ہیں...... ساری زندگی تم نے یہی کام کرنا ہے...... اتنی جلدی میں کیوں ہو؟'' ساحل نے بڑے اعتماد سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا...... اب وہ بہت پُرسکون نظر آرہا تھا۔

''یہ تو تمہیں کلیئر کرنا پڑے گا کہ تم نے کیوں کہا کہ اماں نے مجبوری میں تمہیں خریدا ہے......'' زارا نے بڑی پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر اگنیشن سے چابی کھینچ لی۔

''بہت برداشت کر رہا ہوں...... یہ لفظ ''خریدنا'' آج ہی اپنی ڈکشنری سے نکال دو...... ورنہ......'' ساحل نے اب اطمینان سے بیک سے ٹیک لگا کر سینے پر بازو لپیٹ لیے۔

''ورنہ......؟ تم...... تم مجھے ''ورنہ'' کہہ رہے ہو؟'' ایسی تپ چڑھی تھی کہ اعصاب پگھلنے لگے۔

''حالانکہ...... میں تو کسی ''وظیفے'' کی طرح صرف اور صرف ''میری جان'' کہنا چاہتا ہوں۔'' ساحل کا سکون، نرمی، مسکراہٹ دیدنی تھی۔

زارا کا بس نہ چلتا تھا کہ چابی چاقو کی طرح اس کے بھیجے میں اتار دیتی۔

''زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں......'' وہ طیش کی حالت میں بہ مشکل کہہ پائی۔

''میرے فری ہونے کی کوئی limit نہیں ہے...... ابھی اسی وقت تمہیں کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے لگژری سوئٹ میں پہنچا سکتا ہوں...... مجھے پتا تھا ''مہم جو'' کے ساتھ جارہا ہوں احتیاطاً نکاح نامے کی فوٹو کاپی جیب میں رکھ لی تھی۔ ہر عورت کا غرور ایک دن تو ٹوٹتا ہی ہے ناں، تمہارا غرور توڑنے کی ذمے داری اب سائیں نے مجھے دی ہے...... اس لیے مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔'' ساحل کا لہجہ ذومعنی اور شعلوں کو ہوا دینے کے مصداق تھا۔

''اب چلیں......!'' اس نے کھولتی، بھڑکتی زارا کی طرف یوں پیار سے دیکھ کر کہا گویا وہ پیار کی باتیں کرنے ذرا کی ذرا رک گئے تھے۔

زارا کار کی چابی مٹھی میں دبوچے اپنی سانسوں کو کنٹرول کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

''وقت ضائع کر رہی ہو...... اگر چابی نہیں دوگی تو میں بچوں کی باتیں شروع کردوں گا...... مثلاً اگر ہمارا پہلا بیٹا ہوا تو اس کا نام التمش فرعون رکھیں گے...... اگر بیٹی ہوئی اوج ثریا قلابہ......''

اس سے پیشتر کہ اس کا جملہ مکمل ہوتا زارا نے key ring اس کے بازو پردے ماری۔

''لگتا ہے تمہیں فرعون سن کر غصہ آگیا...... یہ تو بنی اسرائیل کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا، اصلی نام تو ان کے اتنے مشکل ہوتے تھے کہ کوئی لیتا ہی نہیں تھا۔ جیسے کہ طلش، ازطلش، وزطلش......''

"stop......" زارا اب چلا اٹھی۔

ساحل اس دوران انجن اسٹارٹ کرچکا تھا زارا کی آواز شور میں دب گئی۔

''اتنی مغرور ماں کی اولاد کیا فرعون سے کم ہوگی...... میں تو این آئی سی بنتے ہی عاق کردوں گا۔'' ساحل بڑبڑاہٹ کے انداز میں کہہ رہا تھا اور احتیاط سے مڑ کر دیکھتے ہوئے واپس روڈ پر گاڑی ڈال رہا تھا۔

شدید اعصابی ٹوٹ پھوٹ سے گزرنے کے بعد زارا نے یہی نتیجہ برآمد کیا کہ ساحل کو خاموش کرانے کا ایک



ہی طریقہ ہے کہ مکمل خاموشی اختیار کی جائے۔

خاموش رہنے کی نیت کی تو نگاہ اپنے ''بلند مقاصد'' یا اہداف کی طرف چلی گئی۔

''مجھ سے جیت کر دکھانے...... یہ مجھے جانتا ہی نہیں ہے۔'' وہ کسی انتہا پر جانے کی نیت تو سرے سے رکھتی ہی نہیں تھی کہ تاجور کے ساتھ ہونے والی کٹ منٹ ایک پل کو نہیں بھولتی تھی...... اس نے تاجور سے عہد لیا تھا کہ وہ کسی کو یا کبھی سفینہ کو بھی نہیں بتائیں گی کہ وہ ان کی لے پالک اولاد ہے...... اور اسی عظیم رسوائی سے بچنے کے لیے تو اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ساحل اسے مسلسل کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

''ہم سفر کو کم از کم منزل کا آئیڈیا تو دیں......'' اس کے انداز میں ہنوز شوخی تھی...... خوب صورت، طرح دار، مال دار بیوی پہلو میں تھی تو ملی مسائل پر تو بات کرنے سے رہا۔

''ڈولمن کلفٹن۔'' اس مرتبہ اس کی آواز دھیمی اور لہجہ مفاہمت آمیز تھا۔

☆☆☆

''میں فرائی ڈے کی شام کراچی جارہی ہوں...... چلنا ہے تو بولو......'' سفینہ نے ریک میں کوئی کیک تلاش کرنے کے دوران ماہین کو متوجہ کیا جو کانوں میں ہینڈ فری لگائے ڈانس کرتی چٹکیاں بجاتی ادھر ادھر ٹہل رہی تھی...... اسی وجہ سے سفینہ نے معمول سے اونچی آواز میں اسے متوجہ کیا تھا۔

''تم نے مجھ سے کچھ کہا؟'' ماہین نے ایک کان ہینڈز فری سے آزاد کیا اور بے مزہ ہو کر بولی۔

''نہیں، تمہاری بدروح سے بات کر رہی ہوں۔'' سفینہ نے جل کر کہا۔

''اوہ سوری، میں نے ٹھیک سے سنا نہیں...... پھر سے بولو......''

''friday کو کراچی جا رہی ہوں...... منڈے مارننگ واپس آجاؤں گی، تم بور ہو جاؤ گی...... تمہاری سیٹ کنفرم کرا دوں......؟'' سفینہ کو بک مل گئی تھی اس لیے اعصاب پُرسکون تھے اور مسکرا رہی تھی۔

''بور تو کراچی جا کر بھی ہوں گی...... تمہاری تو پرنس کے ساتھ dates چلیں گی...... اور مجھے ممی کی لمبی لمبی advises سننا پڑیں گی۔ یار تم ہی میری ممی کو سمجھاؤ یورپ میں لڑکیوں کا سلیقہ شعار، سگھڑ ہونا ضروری نہیں ہوتا...... ہاف فرائی بنا لیتی ہوں...... بٹن لگا لیتی ہوں...... کسی کو فلو ہو جائے تو پینا ڈول، ماسک دے سکتی ہوں۔''

''مائی گاڈ...... الیکٹرک انجن کی طرح تمہاری زبان چل پڑتی ہے...... نہیں جانا تو بولو نہیں جانا......'' سفینہ دھپ سے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی...... اور کتاب تکیے پر رکھ دی۔

''پڑھائی میں تمہارا دل نہیں لگتا...... ظاہر ہے ایک دل ہے کہاں، کہاں لگاؤ گی...... شادی کو رد مانس بکلر بولتے ہیں...... اب بھی سوچ لو......'' ماہین نے دوبارہ ہینڈز فری کان میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

''یہ سب کچھ میرے لیے بہت انوکھا اور نیا ہے...... جو کچھ ہونے جا رہا ہے، میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا، اسے پتا تھا میوزک کے شور میں اس کی آواز دب گئی ہوگی...... مگر اس نے تو گویا خود کلامی کی تھی۔

''اور یہ تو میں کسی سے شیئر بھی نہیں کر سکتی کہ صبح ہونے سے پہلے میرا دل اتنا بے چین ہوتا ہے کہ پھر میں دوبارہ سو نہیں پاتی...... جی چاہتا ہے بس ایک ڈائریکشن میں دوڑنا شروع کر دوں...... اور یہ اتنا زیادہ ہونے لگا ہے کہ میں ڈر گئی ہوں...... اور اسی وجہ سے میں نے شادی سے انکار نہیں کیا...... تو یہ کتنا واہیات خیال آتا ہے کہ اُڑ کر بس پرنس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے دیکھوں تو چین و سکون ملے...... یوں جیسے کوئی ذہن پر ہلکی سی دستک دے کر مجھے اٹھا کر بٹھا دیتا ہے۔'' سفینہ گہری سوچ میں تھی...... اپنی کیفیات پر شرمسار بھی تھی پریشان بھی...... ماہین فرصت کے لمحات سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ آنکھیں بند کیے تھرک رہی تھی۔

☆☆☆

لاکھوں میں دو برائیڈل ڈریس...... ساحل تو مل کر رہ گیا...... بارات کے دن کا قندھاری اناری یاد دلاتا سرخ لہنگا سوٹ...... جس کے فیبرک پر سیلز مین اور ڈیزائنر نے پورے بیس منٹ تک زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے اور اصلی ریشم کی گارنٹی دی تھی جو چائنا سے امپورٹ کیا جاتا تھا۔

''ایسی شاہانہ شاپنگ کر زندگی کا مزہ آگیا......'' ہاتھ نوٹ کو نہیں چھوڑ رہے تھے اور لاکھوں کی خریداری ہو رہی تھی۔

ساحل آن کی آن میں اپنا ماضی بھول کر یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اس کا تعلق عربوں کے کسی شاہی خاندان سے ہو اور وہ بے دریغ ''تیل'' کی دولت لٹا رہا ہو...... اس نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی سپریم کوالٹی کے ڈریسز انتخاب کیے...... جی تو چاہ رہا تھا کہ ہاتھ کے ہاتھ راڈو یا رولیکس بھی لے، لے پھر سوچا ہو سکتا ہے تا جور سلامی میں اور زیادہ قیمتی رسٹ واچ پیش کریں......

کئی لاکھ کی payment کے بعد تو وہ زارا سے زیادہ اس ویزا کارڈ کی دیکھ بھال کر رہا تھا جو زارا پرس سے یوں نکالتی جیسے سرکس کا انٹری ٹکٹ نکال رہی ہو پھر واپس یوں رکھتی جیسے مونگ پھلی کا چھلکا پھینک رہی ہو بیگ میں......

ویزا کارڈ تو وہ بھی استعمال کرتا تھا مگر بات لاکھوں تک نہیں جا سکتی تھی بالفرض بینک سے قرض لے بھی لیتا تو

واپس کیونکر کرتا......؟ چاروں طرف سے سنہری روپہلی شعاعیں برس رہی تھیں...... کسی وقت تو یوں بھی محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو...... زارا بھی سب کچھ بھلا کر دل کھول کر ارمان ٹھنڈے کر رہی تھی...... روکنے ٹوکنے والی آوازیں آج اس کا پیچھا نہیں کر سکتی تھیں۔ اپنی دھن میں کئی مرتبہ اس نے ساحل کی طرف مسکرا کر بھی دیکھا تھا۔ ایک موقع پر ساحل نے بلا ارادہ اس کا بازو تھاما تو زارا نے بھی اس کا بازو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

مادیت کی چکا چوند سے خیرہ آنکھوں میں بیزاری تھی نہ اجنبیت......

☆☆☆

''وقت بالکل بھی نہیں ہے...... میں سفینہ کے برائیڈل ڈریسز کے لیے بہت فکر مند ہوں...... برسوں کے بعد خوشی نے اس گھر کے دروازے پر دستک دی ہے...... میرا بس چلے تو سارے شہر کو اس شادی میں انوائٹ کروں...... یہ آج میں نے تمہاری ماں کا ایک بہت قیمتی جیولری سیٹ بھوز مین کھود کر برآمد کیا ہے...... اس میں ڈائمنڈ، نیلم، زمرد، روبی اور گارنیٹ جڑے ہیں...... یہ میں نے میکسیکو کے ایک جیولر سے خریدا تھا جو ایک زلزلے میں اپنا پورا خاندان گنوا بیٹھا تھا اور نیم پاگل ہو چکا تھا وہ ہر شے کی ویلیو بھول جاتا تھا۔ میں جس ہوٹل میں رہ رہی تھی اسی ہوٹل میں اس کی چھوٹی سی شاپ تھی......'' وہ بتا رہی تھیں۔

''ڈائننگ ہال میں آتے جاتے، میں اس کی شاپ پر رک جاتی تھی اور اس سے کچھ بات چیت ہو جاتی...... ایک دن مجھے ایک ring بہت پسند آئی، تازہ انار کے جوس کے رنگ جیسا بڑا سا روبی جڑا ہوا تھا اس نے جو قیمت بتائی وہ میں نے قبول کی اور فوراً خرید لی...... اور اسی وقت پہن لی پھر پتا نہیں کیا ہوا اس نے ایک بہت چھپا کر رکھا ہوا باکس نکالا اور یہ سیٹ مجھے دکھاتے ہوئے کہا...... ''یہ میری مرحومہ بیوی نے ڈیزائن کیا تھا میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے سیل کروں...... مگر آپ کو دیکھ کر مجھے لگا یہ آپ کے لیے ہی بنایا گیا تھا، آپ اسے پہن کر دنیا کی خوب صورت ترین عورت دکھائی دیں گی...... یہ آپ کو لینا ہوگا۔'' میں اس کی بات سن کر حیران ہو گئی...... وہ اونر تھا مگر سیلز مین کی طرح کنونس کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ بہت قیمتی ہے، فی الحال میں ہیوی اماؤنٹ پے نہیں کر سکتی...... پتا ہے اس نے کیا کہا؟'' لیڈی صوفیہ بولتے، بولتے پرنس کے پہلو میں صوفے پر بیٹھ چکی تھیں۔ بچوں کی سی روحانی مسرت آنکھوں سے شعاعوں کی صورت پھوٹ رہی تھی۔

''کیا کہا؟'' پرنس نے ثابت کیا وہ مکمل ہمہ تن گوش ہے۔

''کہنے لگا آپ جو دیں گی وہ میں لے لوں گا...... کیونکہ اسے تو سیل کرنے کا میں نے سوچا ہی نہیں تھا...... آپ کو دیکھ کر خیال آیا کہ پتا نہیں میری موت کے بعد جانے کس ناشکرے کے ہاتھ لگے۔ میرا دل کہتا ہے آپ اسے کبھی re sale نہیں کریں گی...... یہ ایک asset (اثاثے) کی طرح آپ کے پاس محفوظ رہے گا۔ I was very surprised'' لیڈی صوفیہ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کانوں کے آویزے، باکس سے نکالتے ہوئے کہا...... پرنس بڑے پُرشوق انداز میں دادی کی ایک، ایک ادا کی طرف متوجہ تھا۔

''اُف وہ واقعی خبطی تھا...... سرخ بال یوں بکھرے رہتے تھے جیسے برسوں سے اس نے combing نہ کی ہو۔ جیسے wheat (گندم) load ہونے سے پہلے کھیتوں میں بکھری ہوتی ہے ناں......'' یہ کہہ کر لیڈی صوفیہ نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا...... پرنس بھی مسکرا دیا۔

لیڈی صوفیہ آویزے چٹکی میں پکڑے پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''میں نے یہ سیٹ نہیں پہنا...... تمہاری دادی کو گفٹ کر دیا، اس نے بھی نہیں پہنا، تمہاری ماں کو گفٹ کر دیا......

''میں نے تمہاری دادی سے پوچھا کیا تمہیں پسند نہیں آیا......؟ تو بولی۔ ''یہ بہت ہی قیمتی اور خوب صورت ہے یہ میری بہو پہنے گی......اس لیے کہ gem stone (جواہرات) استعمال کرنے کے بعد کسی کو نہیں دینے چاہئیں یہ اثرات ٹرانسفر کرتے ہیں...... ماشاءاللہ بہت knowledge تھی اس کی...... اس نے تمہاری ماں کو گفٹ کیا تو اس نے بھی اپنی بہو کے لیے سنبھال رکھا...... میں حیران ہوں کہ ہم تین عورتوں نے یہ سفینہ کے لیے سنبھالا تھا؟ sixty years پہلے یہ اس بوڑھے خبطی جیولر کی بیوی نے سفینہ کے لیے ڈیزائن کیا تھا...... my good ness۔'' لیڈی صوفیہ نے ابرو چڑھا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے معصومانہ حیرت کا اظہار کیا......

''جب سفینہ یہ پہنے گی تو کوئین لگے گی......''

"verymuch thank's to late oldman and his blessed late wife"

(شکریہ بزرگوار مرحوم اور اس کی مرحومہ بیوی)

پرنس نے یہ کہہ کر لیڈی صوفیہ کے شانوں پر بازو پھیلا دیا......

"what do you mean ?say to me bundle of thanks "

لیڈی صوفیہ نے گردن موڑ کر مصنوعی خفگی کے ساتھ ظرافت کا مظاہرہ کیا۔

"thank you my grand mom" پرنس نے سرخوشی کی کیفیت میں دادی کے سر پر بوسہ دے کر کہا۔

''تم کل لاہور چلے جاؤ...... سفینہ کے لیے کراچی آنا اتنا convenient نہیں ہے...... برائیڈل ڈریس دو تین دن میں تیار نہیں ہوسکتے۔ تم اپنے ڈریسز کے لیے آج سے تیاری شروع کردو...... جیولری کا تو کوئی مسئلہ نہیں نکاح اور ولیمے پر سفینہ صرف ہماری خاندانی جیولری ہی پہنے گی...... اور لوگ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔'' وہ باکس بند کرتے ہوئے لاہور جانے کی بات یوں کررہی تھیں جیسے دو قدم دور پان شاپ سے پان لانے کی بات کررہی ہوں......

''میں اس طرح بغیر پلاننگ کے لاہور کیسے جاسکتا ہوں گرینڈ مام...... سفینہ سے بات کرنا ہوگی بلکہ اس سے بھی پہلے تاجور آنٹی سے اجازت لینا ہوگی۔'' پرنس کو اپنے پرسکون معمولات منتشر ہوتے محسوس ہوئے تو اس نے بہت متفکر انداز میں جواب دیا۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں...... میں آج ہی تاجور سے بات کرکے یہ سب باتیں طے کرلوں گی...... تم سفینہ سے ڈسکس کرلو...... میں نے بلیو برڈ پریس سے کانٹیکٹ کیا تھا...... ان کا آدمی شام تک آئے گا...... کارڈ کا ڈیزائن تم پسند کرو گے......''

''کارڈ......؟ لیکن date تو ابھی fix نہیں ہوئی۔'' پرنس نے حیرت سے دادی کی طرف دیکھا جو جیولری باکس بند کرنے کے بعد دوبارہ کھول رہی تھیں۔ اور قدرے غیر حاضر دماغ محسوس ہورہی تھیں۔

''تاجور آج کل میں ڈیٹ بتادیں گی...... ڈونٹ وری......'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر جیولری سیٹ کی زیارت کرتے ہوئے قدرے بے پروائی سے جواب دیا تھا۔

''خیال تو بہت اچھا ہے...... سرسبز ہرے بھرے شہر میں شاپنگ کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے...... جبکہ محبوبہ بھی ہمراہ ہو......'' وہ سفینہ کو فون کرنے کی نیت کرتے ہوئے زیر لب مسکرانے لگا۔ بالآخر لیڈی صوفیہ بھی باکس بند کرکے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

دور لاؤنج میں گہری سوچ میں گم انجیلا پریشانی کی کیفیت میں پرنس کے بیڈروم کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے ادھ کھلے دروازے سے لیڈی صوفیہ، پرنس کے ہاتھ پر بوسہ دیتی نظر آرہی تھیں۔

☆☆☆

ساحل نے بڑے ذوق وشوق سے زارا کو ڈنر کی آفر کی تھی کہ اس کے اپنے پیٹ میں بھی چوہے دوڑ رہے تھے زارا نے بھی بھوک لگنے کا شور مچا دیا تھا۔

''چلو فوڈ کورٹ میں بیٹھ کر کچھ کھاتے ہیں......''

''فوڈ کورٹ میں؟ اتنے رش میں...... تیز لائٹس، شور، what nonsense-queue'' ساحل تو بری طرح سٹپٹا گیا...... بھوک کی شدت میں اتنا شدید اعتراض......

''یہ کوئی ڈنر کرنے کی جگہ ہوتی ہے...... ایسی واہیات جگہ ڈنر کیا جاتا ہے؟''

''واہیات......؟'' ساحل کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی...... اچھے بھلے کھاتے پیتے لوگ یہاں بیٹھے نظر آتے ہیں...... اسے تو آج پتا چلا کہ یہ واہیات جگہ ہوتی ہے۔

''لال قلعہ میں بوفے کرتے ہیں...... ویٹ بھی نہیں کرنا پڑے گا...... اور ورائٹی بھی بے حساب......''

ٹیکس سمیت دو بندوں کا بوفے تقریباً سات ہزار کی چٹی پڑنے کی بات ہورہی تھی۔

ایک وقت کا کھانا...... سات ساڑھے ہزار میں...... سیلری اچھی مل رہی تھی مگر سوچ تو ابھی تک جوڑ توڑ والی ہی تھی۔

وہ بہت آرام سے سات ہزار کا ڈنر افورڈ کرسکتا تھا...... ظاہری بات تھی وہ ڈنر کی ادائیگی کے لیے زارا سے ویزا کارڈ تو نہیں مانگ سکتا تھا......

''منت'' کی شاپنگ کا آدھا مزہ کرکرا ہوگیا......

''ایسا کرتے ہیں کہ روسائی چلتے ہیں......'' اس کا خیال تھا کہ روسائی میں آدھے پیسوں کا فرق پڑجائے گا......

''بہت خوب صورت enviroment ہے...... کبھی گئی ہو؟'' ساحل نے ترغیب دلانے کی آخری حد تک کوشش کی۔

''ہوں...... اسٹوڈنٹس پلیس ہے...... جاتے رہتے ہیں...... کبھی کسی سے ٹریٹ لینا ہو...... یا کسی کی برتھ ڈے ہو...... مگر بوفے والا مزہ تو نہیں ملتا...... اب جلدی چلو...... کیا سوال جواب کرنے لگ گئے، مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔'' زارا نے شاپرز سنبھالتے ہوئے بھنا کر کہا۔

ان سے زیادہ شاپرز ساحل کے پاس تھے۔

''کہاں چلیں......؟'' ساحل نے موہوم سی امید کے سہارے تصدیق چاہی۔

''ارے...... کیا پرابلم ہے...... دس مرتبہ تو لال قلعہ کا نام لے چکی ہوں...... اب جلدی کرو...... نیچے پارکنگ تک جانا ہے...... وہ کون سا سامنے ہے۔ چلتے، چلتے تھک مروں گی......''

زارا نے شاپنگ بیگز سے ساحل کی پشت پر دباؤ ڈال کر ایک طرح سے اسے دھکا دے دیا......

ساحل منہ لٹکا کر یوں چلا جیسے گاڑی کا چالان جمع کرانے جارہا ہو۔

☆☆☆

''اماں گیارہ بج رہے ہیں...... اب کون سا عید کا سیزن ہے کہ سحری تک مال کھلے رہیں گے۔'' سفینہ کی آواز میں تفکر و تشویش تھی۔

تاجور تو پہلے ہی فکر مند تھیں مگر سفینہ پر ظاہر نہیں کررہی تھیں مگر سفینہ کی فکر سے ان کی فکر میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''میں نے کہا بھی تھا کہ آج صرف آرڈرز دینے والے کام نپٹا لینا...... باقی شاپنگ بعد میں کرتی رہنا...... میرا خیال ہے وہ راستے میں ہوں گے...... اس شہر میں ٹریفک کے بھی تو بہت مسئلے ہیں۔'' تاجور نے بظاہر

سفینہ کو مطمئن کیا در حقیقت خود کو سمجھا رہی تھیں۔

''ویسے اماں...... زارا سیٹ ہو گئی، یہ بہت اچھا ہوا......''

وہ پیسہ خرچ کرنے سے ہی سیٹ رہتی ہے...... اس کے باپ......'' روانی میں کہتے ہوئے ایک دم ٹھٹکا گئیں...... اور دل ہی دل میں گویا اپنا سر ہی پیٹ لیا...... وہ کہنے جا رہی تھیں کہ اس کے باپ کی آنکھوں پر بھی دولت کی پٹی بندھی رہتی تھی...... پیسے کے لیے جس نے جگر کا ٹکڑا الگ کر دیا تھا۔

''اماں...... آپ پاپا کی بات کر رہی ہیں...... مگر اس طرح تو آپ نے کبھی پاپا کا ذکر نہیں کیا...... آپ کی ٹون بہت چینج ہے......'' سفینہ بری طرح حواس باختہ محسوس ہوئی، آواز پر استعجاب غالب تھا۔

''ارے نہیں...... میں دراصل یہ کہہ رہی تھی کہ اس کے باپ کی زندگی بہت مختصر رہی، وہ ہوتے تو بہت اچھی طرح اس کو سنبھالتے...... مجھے تو جلدی غصہ آ جاتا ہے۔'' بات بنانے کے چکر میں وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں۔

''یہ تو ہے...... سب لوگ کہتے ہیں پاپا بہت humble تھے بہت برداشت تھی ان میں، انہوں نے کبھی شاؤٹ نہیں کیا۔''

''تم بالکل اپنے پاپا پر گئی ہو......'' تاجور کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''لیکن زارا تو آپ پر بھی نہیں گئی......'' سفینہ بولی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سفینہ کی مترنم ہنسی نے واضح کر دیا کہ وہ زندگی کی بہاروں کے موسم میں روحانی مسرتوں سے سرشار ہے۔

''اللہ میری بیٹی کو نظرِ بد سے بچائے......'' وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگیں۔

زارا کے کھلے حسد سے وہ بہت پریشان رہنے لگی تھیں جبکہ وہ بہت بھونڈے انداز میں پرنس سے محبت کا اعتراف بھی کر چکی تھی۔

☆☆☆

سحر زدہ کر دینے والی خوابناک مدھم روشنیوں میں ڈنر کرتے ہوئے ساحل خود کو سمجھا رہا تھا کہ کوئی بات نہیں، پیسے تو وصول ہی ہو جائیں گے...... بقول جون ایلیا کے...... یہ لڑکی بوسیدہ لباس میں ہوتی تو کتنی بدصورت ہوتی...... پیسے کی تام جھام نہ ہو تو بہتیری پھر رہی ہیں۔ روڈوں پر اس جیسی ہزاروں لاکھوں......

کھانا من پسند تھا...... payment بھی ایڈوانس ہو چکی تھی...... اب اچھا سا دل کو سمجھا کر کھانے سے لطف اندوز ہوا جا رہا تھا۔

کیسی عجیب بات تھی نوخیز حسین دوشیزہ جو اس کی منکوحہ بھی تھی سامنے تھی وہ رومانی تصورات سے عاری ہو کر کھانا کھانے میں جتا ہوا تھا۔

زارا بھی مٹن چانپ آدھی، آدھی کتر کر پھینک رہی تھی...... خوب صورت جوان شوہر مقابل بیٹھا تھا مگر اس کی نظریں مسلسل کھانوں کی ڈشز کی جانب طواف کر رہی تھیں جیسے سوچ رہی ہو کہ اب کیا تراکی کرنا چاہیے؟ مادہ پرستی کی انتہاؤں پر تعلق ترتیب پاتے ہیں تو ایسے ہی مناظر تخلیق ہوتے ہیں۔

پُرتعیش زندگی کا پرستار...... اس کا مسئلہ بے حساب دولت تھی، لڑکی نہیں، آزادی اور دولت کا بلا روک ٹوک استعمال کرنے کی تڑپ رکھنے والی لڑکی ہر رشتے کو پھلانگ کر رستہ بنانے کا ہنر جانتی ہے۔ رشتے اس کے لیے بوجھ ہوتے ہیں۔

دونوں ایک دوسرے پر نادیدہ، غائبانہ چار حرف بھیج کر بھوکوں کی طرح کھا رہے تھے...... مگر یہ وہ بھوک نہیں تھی جو غذا سے مٹ جاتی ہے یہ وہ بھوک ہوتی ہے جو پیٹ بھرنے سے مائی جیراں کے ''بھاڑ'' کی طرح بھڑکتی ہے۔

☆☆☆

سفینہ جمعے کی شام ماہین کے ہمراہ کراچی پہنچ گئی تھی...... ایک طرح سے اس نے ماں اور پرنس دونوں کو...... سرپرائز دیا تھا جبکہ پرنس خود اگلے ہفتے لاہور جانا پلان کر چکا تھا۔

کراچی تو وہ آتی رہتی تھی مگر اس مرتبہ کراچی ائرپورٹ سے باہر آتے ہوئے یوں لگا جیسے ہوائیں معطر ہوں...... چاروں اور رنگ بکھرے ہوئے ہوں...... وہ اتنی زیادہ خوش نظر آ رہی تھی کہ اپنی کیفیات سے شرما رہی تھی۔

ماہین کا ڈرائیور انہیں لینے آیا ہوا تھا ماہین نے ہی اسے گھر ڈراپ کرنا تھا...... دونوں پلین میں بھی ساتھ تھیں اور اب کار کی بیک سیٹ پر بھی خوش گپیوں کن باتوں میں مصروف تھیں۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ممی، پاپا کی اینورسری میں فیوچر کا ایک شاندار کپل پلان ہو رہا ہے۔'' ماہین دوست کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی، اس کی بات سن کر سفینہ بے ساختہ مسکرائی۔

''اور مجھے اسی دن پتا چل گیا تھا کہ کچھ خاص ہونے جا رہا ہے۔''

''ہوں...... اور مجھ پر ایسے ظاہر کرتی رہیں جیسے تم سے بڑی راہبہ کوئی نہیں......'' ماہین نے سفینہ کے بازو پر چٹکی بھری۔

''پرنس کی نظر میں کچھ ایسا تھا کہ اس دن سے آج تک مجھے ایک پل سکون محسوس نہیں ہوا...... تم نے نوٹ کیا ان کی آنکھیں باتیں کرتی ہیں...... اسی لیے وہ خود بہت کم بولتے ہیں......''

''میں نے کچھ نوٹ نہیں کیا......'' ماہین نے قطع کلامی کی۔

''بس اتنا ضرور محسوس کیا ہے کہ ان کی پرسنالٹی میں ایسا کچھ ہے جو عام بندے میں محسوس نہیں ہوتا......'' وہ مزید گویا ہوئی۔

''آہا...... ہا......'' ماہین نے آہِ سرد بھری تو سفینہ نے اس کی طرف شرارت سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں کیا ہوا......؟''

''میں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے...... یہ میں نے اپنی نانو سے سنا تھا ورنہ میری اردو اتنی اچھی نہیں ہے...... نانو کا کوئی جاننے والا مہینے میں ایک بار ضرور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتا تھا...... ان کے سوشل سرکل میں بہت سے لوگوں کا ایک پاؤں کٹ چکا تھا......'' ماہین کی شوخی انتہا کو چھو رہی تھی۔

''میں نہیں سمجھی......'' سفینہ کے چہرے سے لاچاری ٹپکنے لگی۔

''میں نے ہی تو تمہیں پرنس سے ملوایا تھا...... جو کچھ دنوں بعد فائنلی تمہیں مجھ سے چھین لے گیا۔ کیا میں تمہارے شولڈر سے تھوڑا سا سر ٹکا کر رو سکتی ہوں؟'' اس نے مصنوعی منہ بسور کر سر لگانا چاہا تو سفینہ دور ہٹ گئی۔ ماہین کا گھر پیچھے ہو گیا اب دونوں ہنس رہی تھیں، سفینہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

ایک راستہ پرنس کے آشیانے کو جاتا تھا جس پر ایک نور کی چادر تنی ہوئی تھی...... گلاب بکھرے ہوئے تھے، سفید کبوتروں کے غول تھے۔

☆☆☆

''سرپرائز......'' پرنس مسکراتا ہوا لیڈی صوفیہ کے قریب آیا...... دونوں اس وقت اسٹوڈیو میں موجود تھے...... پرنس متوقع عالمی جنگ کے ناقابلِ تلافی نقصانات کو اداس رنگوں سے اجاگر کر رہا تھا...... اسے ایک عالمی مقابلۂ مصوری میں حصہ ڈالنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا اور توقع تھی کہ یہ تقریب اس کی شادی کے بعد ہی منعقد ہو گی اسے پوری امید تھی کہ اس مرتبہ سفینہ اس کے ہمراہ ہو گی...... نہایت سنجیدہ موضوع کو کینوس پر نقش کرتے ہوئے وہ سفینہ کی ہمراہی کے تصور سے شاد تھا اور اسی دوران جبکہ لیڈی صوفیہ ایک البم دیکھنے میں محو تھیں اور وہ اپنے کام میں

کہ سامنے رکھے آئی فون پر روشنی کا جھماکا ہوا، اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑے پُرشوق انداز میں آئی فون اٹھایا تھا کہ سوائے سفینہ کے اس وقت اس آئی فون پر کسی اور کا میسج آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے میسج دیکھا۔

"I am in karachi" یہ مختصر سا میسج نہال کردینے کو کافی تھا۔ اس نے لیڈی صوفیہ کو فوراً مطلع کیا...... وہ بھی خوشی سے کھل اٹھیں۔

"یہ تو بہت اچھا ہو گیا...... وہ ویک اینڈ پر آئی ہے اب تم اس محدود وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا...... میں تاجور سے کہتی ہوں وہ پہلی فرصت میں date confirm کرے تاکہ کارڈز کی پرنٹنگ کا کام شروع کرا دیا جائے...... میں بہت یادگار انویٹیشن دینا چاہتی ہوں...... انویٹیشن کے ساتھ ایک گفٹ بھی جائے گا...... لوگ شادی کے موقع پر گفٹ دیتے ہیں ہم انویٹیشن کے ساتھ گفٹ دیں گے......" وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں۔

"کیسا......؟" پرنس پر واضح نہیں تھا کہ گفٹ کی نوعیت کیا ہوگی......

"مسز کے لیے گولڈ کا لاکٹ اور مسٹر کے لیے رسٹ واچ...... میرے خاندان کی واحد نشانی...... میں خوشی منانے کی انتہا پر جانا چاہتی ہوں...... شہر میں پورے سات دن کھانا تقسیم ہوگا...... جتنے بھی فلاحی، رفاعی ادارے ہیں سب کو کھانا پہنچائیں گے...... اپنی دولت میں دوستوں کو بھی حصہ دیں گے اور غریبوں کو بھی تب ہی یہ خوشی مکمل ہوگی...... میں ابھی تاجور سے بات کرتی ہوں...... انجیلا کو کال کرو، میں اب اپنے بیڈ روم میں جانا چاہوں گی......" لیڈی صوفیہ فرطِ مسرت سے کانپ رہی تھیں۔

پرنس اپنا کام بھول چکا تھا۔

"آپ میرے ساتھ آیئے......" اس نے سہارا دے کر دادی کو اٹھنے میں مدد دی...... لیڈی صوفیہ اپنی چھڑی تھام کر پرنس کی طرف دیکھنے لگیں۔ دہ پوتے کے چہرے پر پھیلتے خوشی کے رنگوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ پھر انہوں نے پرنس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

"میرے چندا...... میں تمہارا دل خراب نہیں کر رہی...... تمہارے بھائی صاحب کی بات پہنچا رہی ہوں...... وہ تو پانچ لاکھ کا سن کر اتنے پریشان ہوئے کہ رات کو ٹھیک سے سوئے بھی نہیں...... یہی کہہ رہے ہیں کہ اس طرح تو کوئی حرام کا مال بھی نہیں دیتا...... لڑکی کی چھان بین کرو...... آپ نے اسے چلتا پھرتا تو دیکھ لیا ہے...... لنگڑی ہے یا نابینا...... سن گلاسز لگا کر دوڑیں لگاتی ہے؟"

ساحل بے محل اعتراض پر بدمزہ ہو گیا...... عجیب ہیں بھائی صاحب بھی پانچ لاکھ راستے میں پڑے مل جائیں تو لوگ خوشیاں مناتے ہیں...... آپا کو تو بہت عزت کے ساتھ پیش کیے گئے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے...... ارے کہیں مطلقہ، بیوہ تو نہیں...... وہ لوگ چھپا رہے ہوں......؟" آپا کے لہجے میں تشویش تھی جو شوہر کے وسوسوں کا خلاصہ تھی۔

"لاحول ولاقوۃ...... مشکل سے بیس سال کی عمر ہے...... اتنے سارے کام اتنی سی عمر میں کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"ارے ہٹاؤ...... تیرہ سال کی لڑکی بالغ کہلاتی ہے......" آپا نے ساحل کا جملہ اچک لیا...... شوہر کے خدشات کا بھرپور غلبہ تھا۔

"لڑکی کو گولی ماریں......"

"ارے، رے...... بیوی ہے وہ تمہاری...... تم گولیاں مارنے لگے......" آپا نے پھر ساحل کو بولنے سے روک دیا۔

"افوہ...... میرا مطلب ہے...... لڑکی کو چھوڑیں...... آپ کو میری میڈم فراڈی، دھوکے باز نظر آتی ہیں......؟" ساحل کو فضول کے اعتراضات پر شدید غم و غصہ تھا۔

"میڈم...... ساس ہیں وہ تمہاری......" آپا نے اصلاح کی۔

"جب سارے رشتے مان رہی ہیں تو پھر اتنی دور بیٹھ کر میرا دل کیوں خراب کر رہی ہیں......" ساحل نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"ارے...... احتیاط اچھی چیز ہے...... ابھی موقع ہے، گنجائش ہے...... مزید چھان بین ہو سکتی ہے...... لڑکی اپنے گھر میں ہے......" آپا نے اب رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جو ہونا تھا ہو چکا...... اب تو اس کے تین، چار بچے بھی نکل کر سامنے آ گئے تو اسی کو رخصت کرا کر لاؤں گا...... آپ بھائی صاحب سے کہہ دیں...... خدا حافظ......" اس نے اپنی طرف سے فون بند کر دیا۔

"بھائی صاحب جیلس ہو رہے ہیں...... جیلس لوگ ہی دوسروں کی خوشی کرکری کرنے کی کوشش کرتے ہیں...... پانچ لاکھ پکڑے بیٹھے ہیں...... ہمارا موڈ خراب کر رہے ہیں۔"

اس نے سامنے رکھی فائل اٹھا کر زور سے پٹخی۔

وہ کون سا روحانی مسرت سے سرشار تھا...... وہ تو دنیا پر امپریشن ڈال رہا تھا کہ وہ کتنا اہم ہے جو بڑے، بڑے سرمایہ دار اس کا نوٹس لیتے ہیں ایک طرح سے بہنوئی صاحب اسے degrade کرنے کی کوشش ہی کر رہے تھے غصہ تو آنا ہی تھا۔

☆☆☆

"یہ حرکت تم نے پہلی بار کی ہے......" تاجور سرخوشی کی کیفیت میں سفینہ کی پیشانی چومتے ہوئے کہہ رہی تھیں...... اولین رومانس کی نرم پھواری بھیگتی سفینہ کو ماں کے لازوال پیار نے مکمل سیراب کر دیا۔

"اماں...... کوئی بھی کام پہلے پہل کیا جاتا ہے تو پراسس شروع ہوتا ہے......" سفینہ نے بھی ہنستے ہوئے ماں کا رخسار چوم لیا۔

"ارے تمہارے سرپرائز نے تو مجھے سب کچھ بھلا دیا...... پتا نہیں کیا کرنے جا رہی تھی۔" تاجور یادداشت پر زور دیتے ہوئے سوچنے لگیں۔

"بس آپ کچھ بھی کرنے نہیں جا رہی تھیں، آرام سے بیٹھ جائیں اور مجھ سے باتیں کریں۔" سفینہ نے شریر انداز میں انہیں شانوں سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

"تم کب سے اتنی ساری باتیں کرنے لگیں......؟ میں تو انتظار کرتی تھی کہ تم کسی وقت میرے پاس بیٹھو اور اپنی باتیں کرو......" تاجور نے سفینہ کی طرف گردن موڑ کر بہت پیار سے دیکھا جو اُن کے پہلو میں بہت تسلی سے بیٹھ چکی تھی۔

"پتا نہیں...... آج کل میں اتنی باتیں کیوں کرنے لگی ہوں...... ماہین بھی حیران ہوتی ہے۔" سفینہ ہنسی تو تاجور بھی مسکرا پڑیں۔

"ماہین تو خود ہی بہت بولتی ہے...... آج کل تم باریاں لیتی ہو یا ایک ساتھ بولنا شروع کر دیتی ہو۔" تاجور نے سفینہ کو شانوں سے تھام کر خود سے قریب کیا۔

"بس...... بہت مزہ آتا ہے...... جب میں بولتی ہوں تو اسے اتنی حیرت ہوتی ہے کہ مارے حیرت کے بولنا ہی بھول جاتی ہے۔" اس کا انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ تاجور بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ کیونکہ ماہین اپنی

پروفائل...... کے ساتھ تصور میں براجمان ہو گئی تھی۔

''اسے اکیلا چھوڑ آئیں...... بور ہو گی......؟'' تاجور نے کہا۔

''ساتھ لائی ہوں اماں...... وہ بھی بیٹھی اپنی ممی کے کان کھا رہی ہو گی......''

''چلو اچھا...... تم فریش ہو جاؤ گی، ہاسٹل لائف تو بہت بند، بندی ہوتی مگر مجھے پتا ہے تم نے یہ سرپرائز بلاوجہ نہیں دیا...... ضرور پرنس سے کوئی کمٹ منٹ کی ہے......''

''اماں......!'' سفینہ نے شرما کر تاجور کے کندھے پر سر رکھ دیا......

''رخصتی...... بڑی قیامت کی ایمرجنسی ڈکلیئر ہوئی ہے...... کچھ دن بعد زارا کی پھر دو ہفتے بعد تمہاری شادی......'' بولتے، بولتے تاجور کے لہجے سے سنجیدگی چھلکنے لگی۔

''اماں سب نیچرلی ہو رہا ہے...... without planning ہونے دیں۔'' سفینہ سرشاری کی کیفیت میں مسکراتے، مسکراتے ایک دم چونک پڑی۔

''ارے...... یہ زارا کہاں ہے......؟ ذرا اس کی خبر تو لوں...... کل بڑی شاپنگ واپنگ کر کے آئی ہے...... دیکھتی ہوں کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔'' سفینہ یہ کہہ کر اتنی تیزی سے باہر کی طرف دوڑی کہ تاجور الفاظ ترتیب دیتی رہ گئیں۔

☆☆☆

زارا ڈیزائنر کی ویب سائٹ کھولے بیٹھی تھی...... مہنگے ترین ڈریسز دیکھ رہی تھی کہ شادی کے وسیلے سے سارے ادھورے خواب پورے کرنے کا موقع مل رہا ہے تو پیسوں یا قیمت پر کمپرومائز کیوں کرے؟ انتہائی باریک اسٹون ورک سے بوجھل لانگ ڈریس پر اس کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔

قیمت بہت زیادہ تھی...... عام حالات میں وہ خودکشی کی دھمکی بھی دیتی تو تاجور کبھی اتنا مہنگا ڈریس خریدنے کی اجازت نہ دیتیں...... بے حساب دولت کے باوجود تاجور بہت رکھ رکھاؤ اور ظرف کے ساتھ زندگی گزارنے کی خوگر تھیں۔ عام بیگمات کی طرح وہ ہر وقت دھاک بٹھانے کی ٹینشن میں نہیں رہتی تھیں۔

''یہ تو لینا ہی لینا ہے......'' وہ منہ ہی منہ میں منمنائی۔

اسی وقت بڑے زور شور سے دستک ہوئی اور فوراً ہی دروازہ وا ہو گیا...... سفینہ بانہیں پھیلائے بڑے وارفتہ انداز میں اندر داخل ہوئی تھی مگر زارا اسے اچانک سامنے پا کر بھونچکی سی رہ گئی۔ ذہن نے اتنا بھی کام نہ کیا کہ اس کی گرمجوشی کو محسوس کر کے اپنا بھی ردعمل ظاہر کرتی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو......؟ بھوت ہوں...... جلدی سے آیت الکرسی پڑھو......'' اس نے زارا کو شانوں سے تھام کر پورا زور لگا کر کھڑا کیا اور گلے سے لگا لیا۔

''بہت، بہت مبارک ہو...... ساحل بہت پرفیکٹ ٹیک مین ہے...... تمہارا pairi ایسا ہی بننا چاہیے تھا...... بہت اچھی طرح کنٹرول کر سکتا ہے تمہیں۔'' سفینہ کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

''کیا مطلب...... میں آؤٹ آف کنٹرول ہوں...... لوز کیریکٹر ہوں......؟'' زارا کی منفی سوچ نے بڑا دل دکھانے والا مظاہرہ کیا...... سفینہ تو حق دق ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''ارے...... کیا ہو گیا ہے تمہیں...... میں تو سوچ رہی تھی اس وقت تم بہت خوش ہو گی...... بہت اچھے موڈ میں ہو گی...... میرا مطلب تو یہ تھا کہ تمہاری age کم ہے...... تھوڑی لاابالی بھی ہو...... decesion maker نہیں ہو...... ساحل بہت ڈیوٹی فل ہے، میچور ہے...... بیلنسڈ کپل بن رہا ہے، تم نے تو بہت مائنڈ کیا...... سوری! اپنا موڈ ٹھیک کرو......'' سفینہ نے بڑی ہوش مندی و حاضر دماغی سے صورت حال قابو کی اور انا کا مسئلہ بنائے بغیر زارا کو گلے سے لگا لیا...... زارا کو پتا تھا کہ سفینہ اس کی سگی بہن نہیں ہے مگر سفینہ تو لاعلم تھی، اس کے حساب سے زارا اس کی چھوٹی بہن تھی۔ اسے اس کی کوتاہیوں کو اس کی خوشی کے موقع پر نظر انداز کر دینا چاہیے۔

سفینہ کے خلوص و گرم جوشی اور بڑے پن نے زارا کو بے بس کر دیا۔

"its ok" اس نے بھی اب نرمی سے سفینہ کے ہاتھ شانوں سے سرکاتے ہوئے کہا...... اور خود پہ جبر کرتے ہوئے مسکرائی۔

''کب پہنچیں......؟''

''زیادہ دیر نہیں ہوئی بس اماں سے ایک دو باتیں کیں اور تمہیں wish کرنے آ گئی سنا ہے کل تم نے دبا کر شاپنگ کی...... مجھے دکھاؤ کیا، کیا لے کر آئی ہو......''

''as such...... تو کچھ خاص نہیں ابھی تو بس آرڈر والا کام نپٹایا ہے...... چار ڈریسز آرڈر کیے ہیں، مایوں، مہندی، بارات اور ولیمے کا...... دو ڈریسز ویسے ہی لے لیے اچھے لگے تھے...... اماں نے کہا تھا اس سے زیادہ مت لینا...... باقی شادی کے بعد لینا۔''

''ہاں، اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں...... تھوڑا سا بھی ویٹ gain کر لیا تو سارے ڈریسز کا ستیاناس ہو جائے گا۔''

''اچھا مجھے فوٹوز میں تو دکھاؤ ناں...... شاید میں کوئی کام کا مشورہ دے دوں...... ابھی کل ہی تو orders ہوئے ہیں......''

سفینہ بے تکلفی سے اس کے بیڈ پر بیٹھ چکی تھی اور ہاتھ بڑھا کر سیل بھی اٹھا لیا تھا۔

"چلو اچھا ہے تمہاری شادی پہلے ہو رہی ہے...... میری شادی میں بہت شاندار سی ڈریسنگ کرنا...... newly bride...... ہم دونوں کے کتنے مزے کے snaps بنیں گے......" سفینہ چونکہ خود بہت خوش اور مطمئن تھی اس لیے بہن کی خوشی میں دل کھول کر حصہ لے رہی تھی۔
اس بات سے بے خبر کہ چٹانی پہاڑوں تلے لاوا جوش کھا رہا ہے۔ جس نے کسی روز تو باہر نکلنا ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

تاجور تفکرات میں ڈوبی ہوئی تھیں...... ایک اضطراب کی کیفیت تھی......
"پتا نہیں وہ سفینہ سے کس انداز میں ملی ہوگی...... جانے کیا باتیں کر رہی ہوگی......" ان کی طرف سے ہمہ وقت کے اندیشے دھڑکے لاحق ہو چکے تھے۔
ایک منفی سوچ رکھنے والا فرد سارے ماحول پر اور گھر کے افراد پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے وہ زندگی کے ایک نئے تجربے سے گزر رہی تھیں۔
منظر سے زارا کو ہٹا دینے کے بعد کچھ بھی نہیں تھا، ان کی اور سفینہ کی مکمل ہم آہنگی تھی، کاروباری معاملات درست سمت میں تھے۔ گھر کے نوکر ایماندار اور محنتی تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر ایک عقل سے عاری لڑکی نے چاروں اور مسائل اور تفکرات کے جال پھیلا دیے تھے...... جو قدم آگے بڑھتا تھا الجھ جاتا تھا۔
"اللہ کرے وہ ہوش کی باتیں کرے۔ میری بیٹی کو پریشان نہ کرے...... کتنا خوش خوش گھر آئی ہے...... اس کی اس خوشی و مسکراہٹ پر تو میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں...... میری ساری دولت تو یہی اکلوتی بیٹی ہے جو میرے اس مرحوم شوہر کی نشانی ہے جس نے مجھے سکھ دینے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی......"
وہ ہر کام سے رہ گئی تھیں...... سماعتیں سفینہ کے قدموں کی آہٹوں پر لگی ہوئی تھیں...... اس کی کیفیات دیکھنے کے بعد ہی وہ کسی کام کی طرف متوجہ ہو سکتی تھیں۔

☆☆☆

"واؤ...... بڑی شاندار تیاری ہے بھئی......!" سفینہ اس کا سلیکشن دیکھنے کے بعد دل کھول کر تعریف کر رہی تھی۔
"ظاہر ہے ماں کی خوشی کی خاطر سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے......" زارا نے شاپرز واپس وارڈروب میں ٹھونسنے کے انداز میں رکھتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب تم خوش نہیں ہو......؟" سفینہ کو حیرت کا جھٹکا سا لگا۔
"نہیں...... خوش ہوں...... اب تو جو ہونا تھا ہو چکا......" زارا نے ایک گہری سانس لی۔
"تم مجھے کنفیوز کر رہی ہو...... بھئی تمہاری اپنی پسند تو کوئی نہیں تھی...... اس لیے تم نے اماں کی بات مان لی...... اگر تم خود سلیکشن کرتیں تو اماں شاید کبھی کوئی اعتراض نہ کرتیں؟"
"میری پسند......؟" زارا معنی خیز انداز میں مسکرائی۔
"ہاں، ہاں، تمہاری پسند...... اگر تم کسی کو پسند کرتیں تو کم از کم مجھ سے تو ضرور شیئر کرتیں......" سفینہ نے بڑے وثوق و اعتماد سے کہا۔
"leave it کوئی اور بات کرو......" زارا نے ایک دم پینترا بدل کر بیزاری سے کہا اور بیڈ پر آڑی ترچھی ہو کر لیٹ گئی۔
"ہوں...... تم چاہتی ہو اب ساحل کی باتیں کی جائیں...... اب تو دن رات اس سے باتیں کرتی ہوگی۔" سفینہ نے اب چھیڑ چھاڑ شروع کی۔

"تم بھی تو پرنس سے دن رات باتیں کرتی ہوگی......" زارا نے گہری نگاہ سے سفینہ کے تاثرات جانچے۔
"ارے نہیں بھئی...... مجھے ٹائم ہی کہاں ملتا ہے...... میں ہاسٹل میں رہتی ہوں، اتنی آسانی سے پرائیویسی نہیں ملتی......" سفینہ نے مسکرا کر اور نظریں چرا کر جواب دیا تھا...... پرنس کے ذکر پر چہرہ گلگوں ہو گیا تھا اور زارا بہت حسرت سے اس کی خوشی کو برداشت کر رہی تھی۔
"ٹھیک ہے تم ریسٹ کرو...... میں بھی تھک گئی ہوں......" سفینہ نے اس کے موڈ کو محسوس کرتے ہوئے جانے کے لیے پر تولے۔
"تم اتنا بزی رہتی ہو...... میری شادی کے فوراً بعد تمہاری شادی ہے...... تم کب شاپنگ کروگی؟ تمہارے پاس تو ٹائم ہی نہیں ہے۔" زارا کو ایک کھوج نے نئے سرے سے بے چین کیا۔
"بس یہ دو چھٹیاں ہیں...... دیکھتے ہیں پرنس کیا شیڈول بناتے ہیں...... اس ویک اینڈ پر میں آ گئی ہوں...... نیکسٹ ویک اینڈ پر پرنس لاہور آ جائیں گے، کچھ نہ کچھ تو ہو جائے گا...... باقی سارے کام تو اماں نے ہی کرنے ہیں۔" سفینہ نے جاتے، جاتے رک کر جواب دیا۔
"برائیڈل ڈریس تو تمہارا دیکھنے والا ہوگا...... richest (امیر ترین) لوگ ہیں اس شہر کے......" زارا کے سینے سے ہوک اٹھ رہی تھی بظاہر مسکرا رہی تھی۔
"مگر میں بہت زیادہ مہنگا ڈریس نہیں لوں گی...... پیسہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ لاکھوں روپے ہلاک کر دیے جائیں...... کسی غریب لڑکی کی شادی پر help کی جائے تو خوشی کی value بڑھ جاتی ہے، کینسر اسپتال میں ڈونیشن دینے سے بھی بچی خوشی ملتی ہے، مجھے تو یہ زندگی پسند ہے جس میں آپ دوسروں کو خوش رکھنے کے لیے بھی کچھ کریں...... اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں۔" سفینہ نے سادگی سے مسکرا کر زارا کی طرف دیکھا اور سکون سے چلتی باہر نکل گئی۔
"کتنی بے وقوف ہے یہ سفینہ...... یہ سب اتنی شاندار چیزیں استعمال کرنے کے لیے ہی تو بازار میں ملتی ہیں...... یہ تو ہے ہی سدا کی کنجوس...... یونہی بس امپریشن دینے کے لیے چیریٹی کی باتیں کرتی ہے۔" زارا نے بدمزہ ہو کر اپنا سیل اٹھا لیا...... ساحل کے دو واٹس ایپ میسج آئے ہوئے تھے DP پر اس نے زارا کی فوٹو لگائی ہوئی تھی۔
"کچھ بھی کر لو...... love تو ہونے سے رہا...... تم صرف میرا پاسپورٹ ہو...... جو بارڈر کراس کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ہیں پاس کرتے ہوئے آگے جانا ہے...... کہاں؟ یہ تو ابھی مجھے بھی نہیں پتا......" اس نے میسج پڑھنے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ سفینہ کی گھر میں موجودگی کے احساس سے موڈ بہت خراب ہو رہا تھا...... اب وہ چشم تصور میں سفینہ کو پرنس کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھ رہی تھی اور کلس رہی تھی۔
یہ کائناتی سچائی ہے کہ خود غرض ہفت اقلیم پا کر بھی ناخوش ہی رہتے ہیں۔

☆☆☆

"مطلب آپ نہیں چاہتی تھیں کہ میں لاہور آؤں؟" پرنس لان میں ٹہلتے ہوئے سفینہ سے بہت خوشگوار اور محبت سے سرشار لہجے میں بات کر رہا تھا۔
"ہاں...... بس مجھے پتا نہیں کیوں بہت عجیب لگ رہا تھا...... میں بہت سے معاملات اماں کی سوچ کے حساب سے لے کر چلتی ہوں...... میں نے سوچا اماں اعتراض تو بالکل بھی نہیں کریں گی...... لیکن یہ ضرور سوچیں گی کہ شاید میں نے ابھی سے من مانیاں کرنا شروع کر دی ہیں...... اب دیکھیں ناں شادی کے لیے بھی میں نے اماں سے ڈسکس کیے بغیر او کے کر دیا......" سفینہ کے انداز میں اتنی بے ساختگی اور معصومیت تھی کہ چاروں اور دیے سے جل اٹھے۔

پرنس کا قہقہہ بے ساختہ تھا...... اتنا بھرپور، توانا کہ سفینہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں...... وہ اس کے قہقہے کی کشش سے مسحور ہو کر ساکت سی ہو گئی تھی۔

''مجھے ایسی ہی شریک حیات کی تلاش تھی جو اپنی ماں سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہو...... اس دنیا میں انسان کی پہلی کرنٹ ...... اپنے پیرنٹس سے ہی ہوتی ہے اور ماں سے پیار کرنے والی بیٹی تو بہت ہی خوب صورت ہوتی ہے...... میری نظر میں تمہارا حسن و جمال بے مثال ہے۔'' پرنس دل و جان سے اپنی روحانی مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔

سفینہ کے لیے یہ الفاظ غیر متوقع اور حیران کن تھے...... لاجواب سی ہو کر بس مسکرا کر رہ گئی......

''ہیلو......'' پرنس کو اس کی خاموشی نے چونکایا کہ رابطہ تو منقطع نہیں ہو گیا۔

''جی...... میں سن رہی ہوں......'' اس کا انداز شرمگیں سا تھا......

''میں ساری تعریفیں ابھی نہیں کروں گا...... کچھ قیمتی الفاظ میں نے سنبھال کر رکھے ہیں جب تم اس گھر میں ہمیشہ کے لیے آ جاؤ گی تو پتا چلے گا ہمارا ساتھ جادو اور ایڈونچر سے بھرپور ہے...... تمہیں زندگی کا لطف آئے گا......''

''جادو......؟'' سفینہ بری طرح چونک پڑی...... یہ...... کیسا لفظ درمیان میں آ گیا...... جو اس کی اڑان سے بہت بلند تھا۔

''جو کچھ اچانک سامنے آ جائے جو پہلے تصور میں نہ ہو تو اسے جادو کہتے ہیں، ہماری زندگی میں روز کچھ نیا ہو گا...... جب تم میرے ساتھ، ساتھ عبادت کرو گی، مراقبہ کرو گی...... تو بہت انوکھے خواب بھی دیکھا کرو گی...... جن سے تمہیں ایسی انرجی ملے گی جو اسپورٹس مین کا asset ہوتی ہے۔'' پرنس اپنی دُھن میں خواب آگیں مردانہ کشش سے بھرپور لہجے میں بولتا جا رہا تھا اور سفینہ کے ہونٹوں سے آہستہ، آہستہ مسکراہٹ غائب ہو رہی تھی اور آنکھیں تحیر سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

اسے ٹوک کر یہ سوال کرنا بھی معیوب لگا کر آپ یہ کیسی عجیب باتیں کر رہے ہیں...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی......

''جی......!'' اس نے بہ مشکل تھوک نگلا...... اس سے زیادہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں تھی۔

''سفینہ میرے پاس بے تحاشا دولت ہے...... میں تمہارے ساتھ مل کر اس دنیا کے پریشان حال لوگوں میں مسکراہٹ بانٹنے کے لیے کام کروں گا اس سے ہماری زندگی میں بہت برکت ہو گی...... ہماری محبت میں برکت ہو گی...... ہمیں نہیں معلوم ہماری زندگی کتنی ہے...... مگر جتنی بھی ہے بہت شاندار ہونی چاہیے۔'' پرنس کی آواز بہت مدھم ہو چکی تھی...... کیفیات میں تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ سفینہ دم بخود سن رہی تھی۔

''آپ کتنی یونیک باتیں کرتے ہیں......'' سارا رومانس ہوا ہو گیا تھا...... دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا...... منہ سے بلا ارادہ نکل گیا تھا۔

''میری actual age...ninety plus ہے۔'' یہ کہہ کر پرنس نے بھرپور مردانہ قہقہہ لگا کر اس کی دھڑکنوں کو مزید اتھل پتھل کیا۔

''جی......؟'' سفینہ کی حالت غیر ہونے لگی۔

''جی میرے پاس ایک سنچری کی wisdom (دانش) ہے...... اس لیے کہ میری بہترین دوست میری گرینڈ ماما ہیں......'' پرنس، سفینہ کی کیفیت سے بھرپور لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''اوہ......'' سفینہ نے اب کھل کر سانس لی۔

''مطلب یہ کہ شادی کے فوراً بعد میں ninety years کی ہو جاؤں گی۔'' اس نے اب حاضر دماغی کا

مظاہرہ کیا تھا۔

جواب میں پرنس کا جاندار قہقہہ سماعت سے ٹکرایا۔

''یہ جو ہم نے ابھی باتیں کیں...... تمہارا یہ جملہ essence (جوہر) ہے...... good...... میں یہی دیکھنا چاہ رہا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گی یا اس چوئیشن کو wisely face کرو گی...... تم میرا درست انتخاب ہو...... اور یہ حیرت کی بات نہیں...... جب ہم نیچرل ہوتے ہیں تو ہمارے انتخاب درست ہوتے ہیں......'' سفینہ کی حالت اب معمول پر آ رہی تھی۔

اسے اچھا محسوس ہو رہا تھا...... اس کا محبوب کھل کر باتیں کر کے اسے قابو کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا...... کتنا عظیم، کتنا شاندار ہے۔

''ایک منٹ سفینہ، لینڈ لائن نمبر پر کال ہے...... پلیز ہولڈ......!'' وہ سحر زدہ سی کیفیت میں تھی کہ پرنس کی آواز سماعت سے ٹکرائی...... وہ چونک پڑی...... اور چوکس ہو کر انتظار کرنے لگی۔

''ضمانت ہو گئی ہے...... آپ سے ملنا چاہتا ہے......؟'' سفینہ، پرنس کی آواز سن رہی تھی جو دوسری طرف لینڈ لائن نمبر پر بات کر رہا تھا۔ ''میں آپ کو ہرگز allow نہیں کروں گا...... آپ کوئی risk نہ لیں اور اس کی کال اٹینڈ نہ کریں...... گڈ نائٹ......''

''ہیلو......!'' پرنس نے ریسیور رکھ کر اب قدرے سنجیدہ لہجے میں سفینہ کو متوجہ کیا جو اس کی بات سنتے ہوئے متفکر ہو رہی تھی۔

''جی...... جی...... کس کی کال تھی......؟'' سفینہ نے بے اختیار پوچھ لیا۔

''ثوبان کی مدر کی...... او کے...... سفینہ پھر ہم کل ملتے ہیں...... اور اپنے پروگرام شیڈول کرتے ہیں۔''

''جی......'' سفینہ ابھی تک الجھی ہوئی تھی۔

''شب بخیر......'' پرنس کا لہجہ خاصا سنجیدہ محسوس ہو رہا تھا۔

سفینہ لفظ allow میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

''اماں دس بجے گرینڈ ماما گاڑی بھیج رہی ہیں۔'' سفینہ نے ناشتے کے فوراً بعد تاجور کو ان کے بیڈروم میں آ کر مطلع کیا تھا۔

تاجور آفس جانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔

''ہوں......'' انہوں نے ہینڈ لوشن لگا کر مساج شروع کر دیا تھا اور بڑے مصروف انداز میں ''ہوں'' کہا تھا۔

''میں چلی جاؤں ناں......؟'' اس نے قریب آ کر غور سے تاجور کا چہرہ دیکھا...... تاجور اس کی اس ادا پر...... بے ساختہ مسکرا دیں۔

''گاڑی آنے کی اطلاع دینے کے بعد پوچھ رہی ہو......؟''

''وہ اماں ان کے پی اے کا فون ہی ابھی، ابھی آیا ہے...... مجھے پہلے سے پتا نہیں تھا۔'' سفینہ نے قدرے شرمندہ ہو کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... مگر مجھے بھی تم سے ذرا detail میں بات کرنی ہے...... شادی کی تاریخ فائنل کرنی ہے...... انویٹیشن کارڈز شادی سے چار پانچ دن پہلے پہنچ جانا چاہئیں......'' تاجور نے بکھرے بال سمیٹ کر معمول کا سادہ سا جوڑا بنانا شروع کر دیا۔

''ok...... میں لنچ کے بعد تو آ ہی جاؤں گی...... پھر......''

غزل

عشق و محبت نے اے یارو! کب ہم کو آباد کیا
دیکھے جتنے خواب سہانے اتنا ہی ناشاد کیا

سوکھے پھول اور تتلی کو کل پھینکا اپنی کتابوں سے
جن لمحوں میں قید تھے سپنے ان کو بھی آزاد کیا

پہلے تو مہمیز کیا تھا جذبۂ عشق کو دنیا نے
چھل اور کپٹ کے ہاتھوں پھر ہم کو بھی برباد کیا

راہِ وفا میں ہم کو اک احساس تھا خاطرداری کا
تجھ کو بھی ہم بھول گئے اور خود کو بھی نہ یاد کیا

دیکھ کے دل گھبراتا ہے اے یمنیٰ سونی گلیوں کو
کون ہے جس نے اس بستی کو آکر یوں برباد کیا

انتخاب: ذرہ ملک
کلام: یمنیٰ احمد

تاجور چونکہ اس وقت عجلت میں تھیں سفینہ کا جملہ کاٹ کر اپنی بات کرنے لگیں۔

''اچھا...... میں تمہیں کوئی شاپنگ وغیرہ کا پروگرام ہے......''

''اُف...... شاپنگ...... ماں یہ تو بہت long پروگرام ہوتا ہے...... میں تو سوچ کر ہی تھک رہی ہوں......''

سفینہ نے بیڈ پر بکھرا ہوا اخبار سمیٹ کر تہہ کرتے ہوئے برا سا منہ بنایا۔

''ارے عجیب لڑکی ہو...... کسی لڑکی کو پتا چل جائے کہ کل اس نے شادی کی شاپنگ کرنے جانا ہے تو اسے رات کو نیند نہیں آتی...... اس رات کی صبح بہت دیر سے ہوتی ہے۔''

تاجور اب رسٹ واچ کلائی میں ڈال رہی تھیں۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

''کون......؟'' سفینہ نے چونک کر پوچھا۔

''ڈرائیور ہوگا......'' یہ کہتے ہی تاجور نے بلند آواز سے ڈرائیور کو اندر آنے کی اجازت دی۔

''آجاؤ شہباز خان......''

ڈرائیور ان کا آفس بیگ، لیپ ٹاپ وغیرہ اٹھانے آیا تھا۔

ڈرائیور اندر آیا روبوٹ کے انداز میں سلام کر کے سینٹر ٹیبل پر رکھا بیگ اٹھا کر واپس چلا گیا۔

''اوکے...... میری جان...... شام کو ملتے ہیں...... اور دیکھو......'' تاجور، سفینہ کو پیار کر کے آگے بڑھتے، بڑھتے رک گئیں...... سفینہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ڈریسنگ اچھی سی کرنا...... اچھا سا تیار ہو کر جانا...... اپنی گرینڈ ماما سے ہی کچھ سیکھ لو...... جو صبح سے رات تک تین مرتبہ تیار ہوتی ہیں......'' یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی عجلت بھرے انداز میں باہر نکل گئیں۔

غزل

بات کو حد سے بڑھانے کی ضرورت کیا ہے
گھر میں دیوار اٹھانے کی ضرورت کیا ہے
دل سے نام اس کا مٹانے کی ضرورت کیا ہے
عمر بھر خود کو جلانے کی ضرورت کیا ہے
آگئے ہو تو سدا ساتھ رہو بھی ہمدم
ہاتھ پھر ہم سے چھڑانے کی ضرورت کیا ہے
''جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی''
اس قدر شور مچانے کی ضرورت کیا ہے
ہاتھ کو ہم سے ملانے میں تکلف کیسا
تم کو نظروں کو جھکانے کی ضرورت کیا ہے
جو مصیبت میں سدا ہم کو دھکیلے جائیں
ایسے رشتوں کو نبھانے کی ضرورت کیا ہے
اپنے اللہ کو شگفتہ تو بنالے اپنا
رازِ دل سب کو سنانے کی ضرورت کیا ہے

کلام: شگفتہ شفیق

''میری گرینڈ ماما......'' سفینہ کچھ سوچ کر مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

اسٹوڈیو میں کافی عرصے کے بعد قدرے تیز آواز میں ایک گیت گونج رہا تھا۔ کینوس پر برش چلاتے ہوئے پرنس گلوکار کے ساتھ، ساتھ خود بھی گنگنا رہا تھا۔

میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں
تو مجھے زندگی سے پیارا ہے
چھوڑ دوں پکڑ کے ہاتھ تیرا
بھول کر بھی نہ ایسی بھول کروں
جس میں بکھرے نہ ہوں ترے جلوے
ایسی جنت نہ میں قبول کروں
تو محبت کے آسماں پہ صنم
میری تقدیر کا ستارہ ہے
میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں

انجیلا لیڈی صوفیہ کا مخصوص گلاس اٹھانے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تھی۔ پرنس کی گنگناہٹ جو گلوکار کے ہم آہنگ تھی سن کر ٹھٹک کر جہاں تک آئی تھی وہیں رک گئی اور مبہوت ہو کر پرنس کی طرف دیکھنے لگی۔

پرنس اپنے تصورات کی دنیا میں بہت اونچی پرواز کر رہا تھا اسے انجیلا کی آمد کا قطعاً احساس نہیں تھا۔

دفعتاً انجیلا کی آنکھوں میں نمی اتر آئی......

''آپ کتنے معصوم اور نیک ہو پرنس...... God bless you'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے سینے پر صلیب کا کراس بنایا اور دبے پاؤں سائڈ ٹیبل پر دھرے گلاس کی طرف بڑھی...... یہ چاندی کا گلاس تھا جس کے کنارے پر سونے کا باریک سا بارڈر تھا...... وہ ہمیشہ سے اسی میں پانی پیتی تھیں...... گھر میں جہاں، جہاں وہ جاتی تھیں یہ گلاس ہمراہ ہوتا تھا کبھی انجیلا بھول جاتی تو دوڑ کر لے آتی تھی۔

کچھ دیر پہلے لیڈی صوفیہ پرنس کو یہ بتانے آئی تھیں کہ ''سفینہ گیارہ بجے سے پہلے یہاں پہنچ جائے گی تم اچھی طرح ڈریس اپ ہو جانا...... اچھی look's پر رومانس بہت شاندار لگتا ہے۔'' وہ اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر چلی گئی تھیں اور تب سے وہ رومانی گیت سن رہا تھا...... اور برش بھی بہت تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔

انجیلا گلاس اٹھا کر پلٹی تو پرنس کی توجہ اس طرف گئی...... وہ مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دی اور بنا کچھ کہے باہر نکل گئی......

''پرنس کو کوئی تکلیف ہوئی تو لیڈی صاحبہ برداشت نہیں کر سکیں گی۔'' اس کے کانوں میں زارا کے الفاظ ہمہ وقت بازگشت کی صورت گونجتے رہتے۔

''سفینہ میم بہت شاندار ہیں...... but health is wealth'' وہ پلکیں جھپکا کر آنکھوں کی نمی جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے میسجز زارا نے ابھی تک اوپن نہیں کیے تھے...... بلیک ڈبل تیر کے نشان کھلا اعلان کر رہے تھے۔

''مجھے تو لگتا ہے یہ لڑکی نفسیاتی مریضہ ہے...... چلو یہ بھی اچھا ہے...... بیوی پیشنٹ ہو تو سیکنڈ میرج کی ڈیل مکمل ہو جاتی ہے۔ سیکنڈ میرج؟'' وہ اپنی ہی سوچ پر چونک پڑا۔

''شادی کو تو ویسے ہی جوا کہتے ہیں...... دوسری شادی تو ہارے ہوئے جواری کا مزید پاگل پن ہے......

آہ...... ہاں...... مگر یہ دنیا تو امید پر قائم ہے...... ہارا ہوا جواری بھی کبھی گریٹ گیمبلر بھی بن جاتا ہے...... آخری پونجی لگاتا ہے اور سب کچھ سمیٹ لیتا ہے...... دوسرا جوا جیت جائیں تو تیسرا جوا کبھی نہیں کھیلنا چاہیے...... ناک سے لکیر کھینچ کر کانوں کو ہاتھ لگا کر سچی توبہ کر لینی چاہیے......'' اس نے لاشعوری طور پر کانوں کی لویں پکڑ لی تھیں۔

نیا جونیئر اکاؤنٹنٹ کھلے لیپ ٹاپ سمیت اندر آ رہا تھا...... حیران پریشان...... ہو کر ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' ساحل نے اسے دم بخود پایا تو جھینپ کر کانوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔

''کیا انسان سے غلطی نہیں ہو سکتی......'' اس نے اپنی ہوشیاری کا مظاہرہ دبنگ لہجے میں کیا اور خفت مٹانے کی کوشش کی۔

''سر...... کوئی غلطی ہو گئی ہے؟'' پرویز نے ہمدردی سے پوچھ لیا۔

"are you married?" ساحل نے گھورا۔

"no sir" اب درحقیقت وہ پریشان نظر آنے لگا......

''یعنی ابھی تم غلطی سے پاک ہو...... اسی لیے چہرے پر معصومیت ہے یہی معصومیت تم سے غلطی کروا کر رہے گی...... انشاءاللہ...... میری prediction بہت کم غلط نکلتی ہے......'' ساحل نے بہت وثوق سے کہا۔

''سر آپ آسٹرولوجی جانتے ہیں......؟'' مستقبل کے سنہری خوابوں سے جھلملاتی آنکھوں میں شوق کی انتہا نظر آئی......

''ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ تو خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں''

ساحل نے شعر پڑھ کر عالمانہ استغنا سے اپنے جونیئر کی طرف دیکھا۔ ''میں روحانیت کے پوائنٹ آف ویو سے بات کر رہا تھا......''

''جی سر...... جی......'' پرویز نے گھبرا کر کھلا لیپ ٹاپ ساحل کے سامنے سیٹ کر دیا...... بیچارہ بہت ہی مرعوب نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

''پرنس ابھی سیلون سے آ کر فریش ہونے گئے ہیں...... لیڈی صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ آپ دونوں کو لنچ پر جوائن کریں گی......'' انجیلا، سفینہ کو ڈرائنگ روم تک پہنچانے کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔

''اوہ...... گرینڈ مام کی طبیعت کیا زیادہ خراب ہے......؟'' سفینہ سن کر پریشان ہو گئی۔

''نو نو...... مائیگرین...... کی وجہ سے کبھی، کبھی ایسا ہو جاتا ہے...... ویسے تو فٹ ہی رہتی ہیں...... پرنس ہر تیسرے مہینے ان کا پراپر میڈیکل چیک اپ کراتے ہیں، وہ دو تین دن اسپتال میں ہی رہتی ہیں...... میں ان کو ٹائم سے میڈیسن دیتی ہوں...... آج کل تو ہر تیسرا بندہ diaibtic ملتا ہے...... تھینک گاڈ...... لیڈی صاحبہ کو اس age میں بھی یہ complaint نہیں ہے۔'' انجیلا نے دریچوں سے ریشمی پردے سرکاتے ہوئے بڑی تفصیل سے جواب دیا۔

سفینہ کو آج انجیلا میں کچھ خاص محسوس ہوا...... سائے کی طرح لیڈی صوفیہ کے ساتھ نظر آنے والی انجیلا پر کسی روبوٹ کا ہی گمان ہوتا تھا...... مگر آج وہ بہت بول رہی تھی۔

''ویسے یہ awarness ہونی چاہیے...... ہر ایج میں میڈیکل چیک اپ ضرور کرانا چاہیے......''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا......''

"because health is wealth" سفینہ نے ہاتھ بڑھا کر عام سے انداز میں مسکرا کر کہا تو انجیلا نے چونک کر سفینہ کی طرف دیکھا۔

''میم...... آپ مائنڈ نہ کریں تو پوچھ سکتی ہوں کہ کیا آپ properly اپنا چیک اپ کراتی ہیں۔''

اب سفینہ نے مسکرا کر انجیلا کی طرف دیکھا تھا......

''کیا میں آپ کو بیمار نظر آتی ہوں......؟''

''no, no میم......'' انجیلا ایک دم گڑبڑا گئی...... اسے ایک بے کلی سی تو لاحق تھی...... وہ سفینہ سے اچھی خبر سننے ہی کی خواہش مند تھی مگر زارا کی بات کے بعد اسے سفینہ پر شک ہو رہا تھا کہ وہ بہت مہارت سے جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔

''وہ...... آپ کی سسٹر نے ویسے ہی ذکر کیا تھا کہ شاید آپ کو میڈیکلی issues آ جاتے ہیں...... کبھی، کبھی fits بھی پڑتے ہیں...... یہ تو پھر نیورولوجی پرابلم ہے...... آپ proper میڈیسن لیتی ہیں......؟''

انجیلا کے انداز میں عجلت تھی...... نگاہ بار، بار داخلی حصے کی طرف جاتی تھی جہاں سے پرنس نے نمودار ہونا تھا۔

انجیلا جیسی جان نثار خادمہ جو ایک شاندار لگژری طرز زندگی کی خوگر تھی جو اسی خاندان کا مرہون منت تھا، اس ''دھوکے بازی'' کو ہضم نہیں کر پا رہی تھی یا اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی کہ اگر سفینہ کو کوئی پرابلم تھی تو اب نہیں ہے۔

سفینہ ہکا بکا انجیلا کی طرف دیکھ رہی تھی...... اور اس طرز نگاہ سے انجیلا کو یقین ہو چلا کہ پول کھلنے پر سفینہ shocked ہے۔

''یہ...... یہ آپ سے زارا نے کہا تھا؟''

اس کے حلق سے بہ مشکل آواز نکلی تھی۔

''yes...... میں تب سے بہت worried ہوں...... آپ بہت اچھی ہیں میری خواہش ہے آپ ہمیشہ فٹ اور healthy ہیں...... یہ شکایت آپ کو کس age سے ہے......؟ I am sure ٹریٹ منٹ تو ہوئی ہوگی......'' سفینہ کی جان ایک عذاب میں پھنس گئی تھی۔

پرنس کی خادمہ کے سامنے زارا کی بے عزتی نہیں کر سکتی تھی...... اور یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس نے خدا معلوم یہ بکواس کیوں کی ہے......

''اللہ کا شکر ہے میرے تو کبھی سر میں درد بھی نہیں ہوتا......'' وہ چھوٹی سی تھی تو تاجور کے منہ سے اکثر سنتی تھی کہ بچوں کی health اور ایجوکیشن پر کبھی کمپرومائز نہیں کرنا چاہیے۔ اتنی جاگتی ہوئی ماں ملی تھی...... جو چاکلیٹ، آئس کریم کھانے کی وجہ سے ان دونوں کو اکثر ڈینٹسٹ کے پاس چیک اپ کرانے لے جاتی تھیں۔

''میں بس اتنا ہی کہوں کہ میں پرفیکٹ healthy ہوں اور اللہ کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے......''

''you mean now?'' انجیلا نے سکون کی سانس لے کر اپنی مزید تشفی چاہی...... سفینہ نے منہ سے جواب دینے کے بجائے بڑی بے بسی کی کیفیت میں اثبات میں سر ہلایا۔

اسی وقت مہکتے ہوئے پرنس نے اندر قدم رنجہ فرمایا تھا...... انجیلا بڑی پھرتی سے باہر نکل گئی جیسے کوئی چوری پکڑے جانے کا خدشہ ہو، بلیک جینز اور سرخ ٹی شرٹ میں پرنس کا سراپا بہت نمایاں تھا۔ نفاست سے سنورے ہوئے بال گھنی مونچھوں تلے مسکراتے لب اندھیرے میں چراغوں کی طرح گہری روشن آنکھیں......

انجیلا، سفینہ کے دماغ میں تو طوفان اٹھا کر چلی گئی تھی۔

''پی......'' کی چھب اس وقت ایسے ہی تھی جیسے بھوکے کے سامنے پورا چاند اسے روٹی کی طرح گول نظر آ رہا ہو...... خالی پیٹ کے ساتھ عارت شدہ رومانس...... ذہنی کیفیات پر نظاروں کے عنوان طے ہوتے ہیں...... وہ جبراً مسکرانے کی بھرپور سعی کر رہی تھی۔

پرنس نے بڑے دل موہ لینے والے انداز میں پیشانی چھو کر سلام کیا تھا جواب میں سفینہ پھر خود پر جبر کر کے مسکرائی۔

اسی وقت ملازم فریش جوس لیے حاضر ہو گیا جو یقیناً انجیلا کی ہدایت و تاکید کا نتیجہ تھا ورنہ اسے آئے خاصی دیر ہو گئی تھی اور انجیلا سے بات چیت کے دوران پانی کا گلاس بھی نہ آیا تھا...... یوں لگتا تھا انجیلا، سفینہ کی آمد کی تاک میں بیٹھی تھی اور گھر کے کسی نوکر کو مہمان کے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔

''actually سفینہ تم سے بہت ضروری ڈسکشن کرنا ہے...... اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم دونوں ساتھ بیٹھیں...... گرینڈ ماما سے تو اب بالکل بھی صبر نہیں ہو رہا...... کارڈز کے ڈیزائن...... مہمانوں کی لسٹ...... کھانے کا مینیو...... وہ سب کچھ فائنل کر چکی ہیں...... بس اب شاپنگ کے لیے اصرار کر رہی ہیں۔''

پرنس نے بولتے، بولتے جوس کا گلاس اٹھا کر سفینہ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بڑی شوخ ادا سے پیش کیا...... سفینہ نے غائب دماغی کی کیفیت میں فوراً تھام لیا اور آہستہ سے شکریہ ادا کیا۔

''میرے پاس صرف دو دن ہیں...... جو کچھ پاسبل ہو دیکھ لیتے ہیں......'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرا

کر جوس کا گھونٹ بھرا۔

''ویسے ایک لحاظ سے یہ بڑی امیزنگ قسم کی شادی ہونے جا رہی ہے...... سب کچھ ہو رہا ہے...... بس ابھی تک ڈیٹ فائنل نہیں ہوئی۔'' پرنس نے ایک محتاط نگاہ سفینہ کے چہرے پر کی...... دریچوں سے چھن کر آنے والی قدرتی روشنی میں سفینہ کے چہرے کی کشش و جاذبیت بہت نمایاں ہو رہی تھی۔

''اگر انجیل، اگر گرینڈ ماما یا پرنس سے سب کچھ شیئر کر لیتی...... تو اس وقت سچویشن کیا ہوتی؟''

ایک خیال سمندر کی لہر کی طرح اچھل کر جھاگ بناتا تھا پھر بیٹھ جاتا تھا۔

''کیا بات ہے سفینہ...... کوئی پریشانی ہے...... کچھ کنفیوزڈ لگ رہی ہو......؟'' پرنس نے دل کی نگاہ سے بہت کچھ پکڑ لیا۔

سفینہ ایک دم ٹپٹا گئی۔

"oh no I am so fine"

''میری طرف دیکھ کر دوبارہ سے کہو......'' پرنس کو نظر کے دھوکے کے احتمال کبھی نہیں ہوتے تھے وہ بہت اعتماد و وثوق سے بات کرنے کا خوگر تھا۔

''وہ actually صبح سے کچھ عجیب سی طبیعت ہو رہی ہے...... پلین میں بن کے ساتھ تھوڑا سا قیمہ کھایا تھا...... بس اس کے بعد سے کچھ اچھا فیل نہیں ہو رہا...... سوری...... میں نے تو آپ کو پریشان کر دیا۔''

سفینہ پر سخت پڑی تھی، معاملہ بہت حساس تھا...... اس کا تو ماں کے گلے لگ کر جی بھر کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

''good God...... ایسی بات تھی تو مجھے فون پر بتا دیتیں...... اب ہمارے درمیان سے یہ فضول قسم کی formalities ختم ہونی چاہیے...... سفینہ میرے پاس چھپانے کو کچھ نہیں ہے...... میرے دل میں جو ہوگا تم بے خبر نہیں رہوگی...... اور میں تم سے امید کروں گا کہ تم مجھ پر مکمل اعتماد کرتی رہوگی...... تم نے تکلف میں اتنی تکلیف اٹھائی...... حالانکہ تمہیں ریسٹ کرنا چاہیے تھا۔''

پرنس تو جیسے اس کی بے آرامی کے خیال سے تڑپ اٹھا......

''its ok...... آپ پریشان نہ ہوں...... میں تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی......'' سفینہ پرنس کو مطمئن کرنے لگی۔

''no, no تمہیں اسی وقت چیک اپ کرانا چاہیے...... میں خود تمہیں لے کر چلتا ہوں......''

اس آؤ بھگت نے تو سفینہ کو پریشان کر کے رکھ دیا۔

''میں ٹھیک ہوں...... البتہ شاید مجھے واقعی ریسٹ کی ضرورت ہے...... آپ plan کر لیجیے کہ ہمیں شاپنگ کہاں کرنی ہے...... پھر شام کو چلتے ہیں۔'' سفینہ کی ذہنی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ جسے ملنے، ایک نظر دیکھنے کی لگن بے چین کیے رکھتی تھی...... وہ دل جو مقابل بیٹھا تھا...... جس کی چھب کے سامنے وہ اپنی چھب بھول بیٹھی تھی۔ اب یہ حال کہ اٹھ کر بھاگ جانے کی تڑپ تھی...... وہ بھرے دل کو بہ مشکل کنٹرول کر پا رہی تھی...... ایک آنسو بھی پرنس کے سامنے ٹپک جاتا تو اس نے شہر ہلا کر رکھ دینا تھا۔

''میں ڈرائیور سے کہتا ہوں وہ آپ کو ڈراپ کر دے...... شام کا پروگرام ہم فون پر فائنل کر لیتے ہیں...... ok!'' پرنس نے فکر مندی اور مسکراہٹ کے بیچ کی کیفیات میں اپنا چمکتی ہتھیلی والا صحت مند ہاتھ سفینہ کے سامنے پھیلایا...... سفینہ نے ہچکچاتے ہوئے اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

☆☆☆

راستے بھر وہ تصوراتی تصور میں زارا سے چلاّ، چلاّ کر رو، رو کر لڑتی رہی آنسوؤں کو بہنے سے روکتی رہی، احتیاطاً

سن گلاسز لگا لیے تھے مگر گالوں پر پھسلنے والے آنسو... تو ڈرائیور کی نگاہ میں آ سکتے تھے۔

''یہ کیا حرکت کی نزارانے......؟''

''کیوں کیا یہ سب......؟''

''یہ کیسی بہن ہے؟''

''کیا بہنیں ایسی ہوتی ہیں؟''

''آج تو فائنل اماں سے کہوں گی اس سے پوچھیں اسے کیا پرابلم ہے؟ میری فیورٹ کار چھن گئی میں نے تو تب بھی اس سے اونچی آواز میں لڑائی نہیں کی۔''

''آخر......اسے یہ disinformation پھیلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''یہ تو مذاق میں بھی نہیں کہا جا سکتا......''

''وہ یہ کہہ کر جان نہیں چھڑا سکتی کہ......it was only a joke'' رونے کی خواہش کو شدت سے دبانے کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے دل پھٹ جائے گا......آدھے گھنٹے کی ڈرائیو......صدیوں پر محیط ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''suddenly......اچانک طبیعت خراب ہوگئی......؟'' انجیلا بھونچکا سی رہ گئی۔

''ہاں کبھی، کبھی routine چینج ہونے سے بھی چھوٹی، موٹی پرابلم ہو جاتی ہے آپ گرینڈ مام کو مت بتایئے گا وہ پریشان ہو جائیں گی۔'' یہ کہہ کر پرنس آگے بڑھ گیا۔

انجیلا جو کچن میں مینیو فائنل کر کے باہر آئی تھی اور پرنس کو باہر سے آتا دیکھ کر رک گئی تھی اس کے سوال کرنے سے پہلے جو شاید وہ کرتی بھی نہیں پرنس نے خود ہی سفینہ کے واپس جانے کا بتا دیا تھا۔

''اچانک طبیعت خراب ہوگئی...... جب میم آئی تھیں تو ہمیشہ کی طرح بہت فریش اور اسمارٹ فیل ہو رہی تھیں۔''

پرنس منظر سے اوجھل ہو چکا تھا......انجیلا الجھن میں پڑی تھی۔

''میم کی سسٹر نے یہی تو بتایا تھا کہ کبھی، کبھی اچانک fits پڑ جاتے ہیں، کیا پرنس کو پتا ہے؟ کیا اسی وجہ سے وہ لیڈی صاحبہ کو بتانے سے منع کر رہے تھے؟''

انجیلا کی تشویش اپنی جگہ تھی۔ اس کے نزدیک تو یہ اس کا اپنا ''فیملی میٹر'' تھا۔

☆☆☆

تاجور تو ششدر آنکھیں پھاڑے سفینہ کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ جو بچوں کی طرح سسکیاں بھر رہی تھی۔

پرنس کے ہاں سے آ کر اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور ماں کے گھر آنے کا [illegible]

اتنی جذباتی وہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی...... حال یہ تھا کہ صبر محال تھا......ایک ناقابل برداشت اذیت تھی......اس نے تاجور کے گھر آنے کے بعد اتنا صبر بھی نہیں کیا کہ وہ change کر کے فریش ہو جائیں...... تنہائی میں تو وہ خوب رو چکی تھی...... ماں کا سامنا ہوتے ہی پھر خود پر قابو نہ رکھ سکی......اتنا روئی کہ بات کرنے کے قابل نہ رہی......تاجور نے بہ مشکل سنبھالا...... چمکارا......منت کی تو پھر اس نے بتا کر دیا۔

''بہت ہو گیا...... اس سے زیادہ پر تو پھر زہر کھا کر مر جانا چاہیے...... آج ہی اس کا حساب کرتی ہوں......ساحل سے کہتی ہوں آج کی تاریخ میں ہی اسے اس گھر سے لے جائے......'' بیٹی کے آنسوؤں نے تاجور کو شعلہ جوالہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

(جاری ہے)





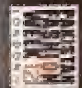
اک بات جو کرنا باقی ہے

افشین نعیم

''حیدر انکل کب تک گھر واپس آجاتے ہیں آنی......؟'' ارباز نے سموسہ کھاتے ہوئے بینا سے پوچھا۔

''کوئی وقت نہیں ہے ان کے گھر آنے کا، کبھی چھ بجے ہی آجاتے ہیں کبھی رات کے دس، گیارہ بھی بج جاتے ہیں۔'' بینا نے چائے کا سپ لیا۔

''ہاں' پرائیویٹ جابز میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔'' ارباز نے سر ہلایا۔



بینا کی نظر زونیہ
پر پڑی جو میاں کو چائے کے لوازمات سے لطف اندوز ہوتا دیکھ رہی تھی۔

"یہ میرا اچٹورا پن ملاحظہ کر رہی ہے۔" ارباز بھرے ہوئے منہ کے ساتھ بولا۔

"جی نہیں، میں آپ کا ندیدہ پن ملاحظہ کر رہی ہوں، ایسے ٹوٹ کر چیزوں پر پڑتے ہیں جیسے پہلی دفعہ یہ سب دیکھا ہے۔"

"تو تم بھی ٹوٹ پڑو، تمہیں منع کیا ہے کسی نے......" ارباز نے اس کی بات کا ہرگز برا نہیں منایا۔

"لو ناں زونی، ٹھنڈی ہو جائیں گی ساری چیزیں......" بینا نے کباب زونیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے پلیٹ میں شامی کباب رکھا، سائڈ پر ہری چٹنی ڈالی اور پہلا نوالہ منہ میں رکھا۔

"زبردست آپی......" بے ساختہ منہ سے نکلا...... "بہت ذائقہ ہے آپ کے ہاتھ میں۔"

"پتا چلا تمہیں میں کیوں مریدوں کی طرح کھا رہا ہوں۔" زونیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ کھانے میں مشغول رہی۔

"آپی، یہ بتایئے ان سب چیزوں میں سے گھر میں کون، کون سی چیز بنائی ہے آپ نے۔"

بینا نے ایک نظر ٹیبل پر سجے لوازمات پر ڈالی۔

"ان میں سے......" تھوڑا توقف کیا۔

"ایک تو شامی کباب میں نے خود بنا کر فریز کیے ہوئے ہیں، دوسرے رول بس...... باقی سب بیکری آئٹمز ہیں۔"

"اور کیک بھی تو خود بیک (back) کیا ہے آپ نے۔" زونیہ نے لقمہ دیا۔

"ہاں، وہ تو تمہارے سامنے ہی کیا ہے ناں......"

"بینا آپی! ایمان سے جادو ہے آپ کے ہاتھوں میں۔" لوازمات سے بھرپور انصاف کرنے کے بعد اب وہ چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

"ارباز، بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپی......" زونیہ نے تائید کی۔

"میری تعریفیں چھوڑو، تم بتاؤ زونی تم نے کیا، کیا کچھ بنایا۔ کس، کس ڈش پر میاں سے داد وصول کی۔"

"ہا، ہا، ہا۔" ایک زوردار قہقہہ ارباز کے حلق سے برآمد ہوا۔

"اس سے کیا پوچھ رہی ہیں، مجھ سے پوچھیں۔" لہجے میں مصنوعی درد بھر کر کہا۔

بینا نے زونیہ کی طرف دیکھا جو کچھ شرمندہ، شرمندہ سی دکھ رہی تھی۔

"زونی نے تو ہر طرف اپنی مہارت اور سلیقے کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ چار دانگ عالم ان کے ہاتھ کے ذائقوں کی دھوم ہے...... یہاں پاکستان سے لے کر امریکا تک ان کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔"

"ارباز!" بینا نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "کیوں تنگ کر رہے ہو میری بچی کو۔"

"آپی! جب سے ہم ہنی مون سے واپس آئے ہیں ناں...... تب سے یہ اسی طرح کا سلوک کر رہے ہیں میرے ساتھ۔" زونیہ نے موقع دیکھ کر فوراً شکایت کی۔

"ذرا سی کوئی چیز خراب ہو جاتی ہے، اتنا شور کرتے ہیں کہ میرے ہاتھ پاؤں مزید پھول جاتے ہیں۔"

"اور تو اور...... امریکا تک فوراً ساری رپورٹ پہنچاتے ہیں۔"

"ذرا سی خراب......؟" ارباز تو بلبلا ہی اٹھا۔

"آپی یقین مانیں، دو ماہ ہونے والے ہیں ہماری شادی کو...... چلیں پہلا مہینہ تو دعوتوں، ہنی مون وغیرہ میں گزر گیا۔ یہ ماہ جو میں نے گزارا ہے ناں، میں جانتا ہوں یا میرا اللہ جانتا ہے۔ محترمہ نے پہلی مرتبہ جو آٹا گوندھا۔ یقین کریں، لئی بنا کر رکھ دی پھر بڑے مسکین لہجے میں مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔" ارباز! اس کی روٹی کیسے بنے گی؟ اور جناب بریانی بنانے کی کوشش میں چاولوں کے لڈو بنا کر کھلائے۔ سبزی بنا رہی تھیں دیگچی پر پلاسٹک کا ڈھکن ڈھک دیا، تھوڑی دیر بعد ڈھکن غائب ہو گیا۔ پھر بھی مجھ سے ہی پوچھ رہی ہیں یہ کیا ہو گیا ہے ارباز......؟" ارباز کے پاس شکایتوں کی ایک طویل فہرست تھی۔ جس کا اختتام اس جملے پر ہوا تھا۔

"آپی......! کم سے کم منیبہ خالہ کی بیٹی کو اتنا پھوہڑ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" بینا نے زونیہ کو دیکھا، وہ عجیب روہانسی سی ہو رہی تھی۔

اس کے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہوئی، معاملہ کچھ گمبھیر تھا۔

☆☆☆

سب سے بڑی الفت آپا پھر منیبہ آپی پھر بینا...... بس تین ہی بہنیں تھیں۔ بھائی کوئی تھا نہیں سو آپس میں ایک مٹھی کے مانند تھیں۔ الفت آپا شادی ہو کر امریکا سدھاریں، ہر تین سال بعد پاکستان آتیں اور ہر بار کہتیں، بس چند سال میں پاکستان شفٹ ہو جائیں گے۔ کم و بیش 23 برس ہو چکے تھے یہ کہتے سنتے......

منیبہ آپی کی شادی چکوال کے ایک دیہات میں ہوئی تھی۔ وہ بے انتہا سگھڑ تھیں۔ پندرہ سال سسرال کے ساتھ گزار کر آخر کہیں خوشی الگ ہونا نصیب ہو ہی گیا۔

پھر بینا...... شادی کے بعد بیاہ کر راول پنڈی آ گئیں۔ اب تو اُن کی شادی کو بھی بارہ برس ہو چلے تھے۔ اولاد کی نعمت سے محروم تھیں۔ الفت آپا کے تین بچے تھے، ارباز، گلناز، مہناز، منیبہ آپی کی ایک ہی بیٹی تھی زونیہ......

الفت آپا نے منیبہ آپی کی زونیہ کو اپنی بہو بنایا تھا۔ ان کے پاکستان منتقل ہونے کا عمل کچھ اس طرح شروع ہوا تھا کہ ارباز تعلیم مکمل کر کے واپس پاکستان

آ گیا تھا۔ جاب بھی پاکستان میں ہی کر رہا تھا۔ شادی کے بعد زونیہ کو لے کر اسلام آباد اپنے آفس کے قریب ہی شفٹ ہو گیا تھا۔ الفت آپا کی منصوبہ بندی کی رو سے اگلے سال تک ان لوگوں نے سب کچھ سمیٹ سماٹ کر پاکستان آ جانا تھا مستقل......

آج کی نشست نے بینا کو خاصا پریشان کر دیا تھا۔ ایک بہن کی بیٹی تھی، دوسری بہن کا بیٹا تھا...... کہیں بچوں کی وجہ سے بہنوں کے آپس کے تعلقات میں دراڑ نہ پڑ جائے۔

بس یہی سوچ بینا کو زونیہ کے گھر آنے پر مجبور کر گئی وہ بھی اس وقت جب ارباز نے یقینی طور پر آفس ہونا تھا۔

☆☆☆

''آنی! بہت زیادتی کی ہے امی نے میرے ساتھ۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہہ کر کام سے دور رکھا کہ تم بس پڑھائی کرو...... کام، وام جب سر پر پڑے گا خود ہی آ جائے گا، چائے تک نہ بنانے دی کبھی۔ میں شوق، شوق میں کچھ کرنا بھی چاہتی تھی تو امی منع کر دیتی تھیں کہ آج کل تو ہر چیز کے ڈبے مل جاتے ہیں بس منگواؤ ترکیب پڑھو اور بنالو...... وہ تو چٹکیوں میں مسئلہ حل کر دیتی تھیں پر اب میری جان مشکل میں آ گئی ہے۔ ارباز، ہر وقت میرے کھانوں میں امی کے ہاتھ کا ذائقہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔'' ایک ٹھنڈی سانس بینا کے حلق سے خارج ہوئی۔

زونیہ ٹھیک کہہ رہی تھی، منیبہ آپی نے اکلوتی بیٹی کو کسی کام کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیا۔

وہ خود زیادہ نہیں پڑھ پائیں۔ ان کی خواہش تھی کہ اُن کی بیٹی بہت پڑھے زونیہ ماشاءاللہ سے ایم فل تھی انگلش میں۔ یونیورسٹی میں ہمیشہ ٹاپ کرتی رہی تھی۔

دوسرے انہوں نے بہت مشکل جوائنٹ فیملی سسٹم بھگتا تھا۔ ان کے ہاتھ کے ذائقے اور سگھڑاپے کی ہر طرف دھوم تھی۔ اسی وجہ سے ان کی زندگی کچن کے کام کرتے ہی گزر گئی۔ بہ مشکل پندرہ سال بعد وہ الگ ہوئیں۔ سو بیٹی کے لیے وہ برملا کہا کرتیں۔ ''زونیہ کو میں جوائنٹ فیملی کے جھمیلوں میں نہیں جھونکوں گی۔''

اب زونیہ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ ماں نے کبھی اس سے کوئی کام نہیں کروایا کہ وقت پڑنے پر سب آ جائے گا۔

اب سب آ تو جانا ہی تھا پر اس دوران جو کچھ زونیہ فیس (face) کر رہی تھی اس نے اسے ماں سے خاصا بددل کر دیا تھا۔

دوسری طرف ارباز بھی بالکل ٹھیک تھا، الفت آپا نے بچوں پر ہمیشہ کڑی نگاہ رکھی، بیٹے کو بیاہ بھی جلدی دیا اور منیبہ کی بیٹی سے بیاہا بھی اسی لیے کہ وہ بھی ماں ہی کی طرح سگھڑ ہوگی۔ ان کے بیٹے کو سکھ دے گی۔ اب اگر وہ زونیہ میں منیبہ خالہ کا عکس ڈھونڈتا تھا تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

''آپی نے تو تمہارا بھلا ہی چاہا تھا۔ مائیں اپنے بچوں کا برا تو کبھی نہیں سوچتیں، یہ تو مانتی ہو ناں......''

''پر میرا کچھ بھی بھلا نہ ہو سکا آنی......'' وہ خاصی آزردہ تھی۔

''آپی نے تمہیں پڑھائی میں کتنا سپورٹ کیا ہمیشہ۔'' بینا نے تسلی دینی چاہی۔

''میرا دل کرتا ہے میں اپنی ڈگریوں کو آگ لگا دوں...... ارباز نہ صرف میری بنائی ہوئی چیزوں کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ فون کر کے ایک، ایک بات الفت خالہ کو بھی بتاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے جتاتے بھی جاتے ہیں۔ میری کون سی لو میرج...... ہے ہیں امی نے خاندان کی بہترین لڑکی میری بیوی منتخب کی ہے، انہیں پتا ہونا چاہیے ان کی بہو کیا سلوک کر رہی ہے ان کے بیٹے کے ساتھ۔ آنی ان سے بہتر تو الفت خالہ ہیں، کبھی کوئی طعنہ مارا، نہ ہی کچھ جتایا۔ میاں، بیوی تو ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں ناں آنی...... کیا ہے جو ارباز میرا مذاق اڑانے کی جگہ تھوڑا وقت مجھے دے دیں، میں کوشش تو کر رہی ہوں ناں۔'' زونیہ بہت دکھی ہو رہی تھی۔

بینا مناسب الفاظ کا چناؤ کر رہی تھیں...... زونیہ کو سمجھانے کے لیے۔

''ویسے زونی آپی غلط تو نہیں کہتی تھیں ناں...... تم بریانی مسالا، قورمہ مسالا، وغیرہ لا کر رکھو، ترکیب پڑھ کر بناتی جایا کرو۔''

''جی، بریانی میں نے ڈبے پر سے ہی ترکیب پڑھ کر بنائی تھی۔ سارے چاول جڑ گئے۔ چاولوں کے لڈو بن گئے تھے۔ ارباز غلط نہیں کہہ رہے تھے۔'' بینا ہنسنے لگیں۔

''یہ تراکیب وغیرہ میرے جیسے کورے لوگوں کے لیے نہیں ہوتیں، جنہوں نے کبھی چاول بھی نہ... ابالے ہوں۔''

''اوکے، مان لیا، اب جو کمزوریاں ہیں وہ تو تمہیں خود بھی سمجھ آ رہی ہیں ناں سو آگے بڑھتے ہیں... اب دیکھو زونی! اگر تمہاری عمر میں کوئی لڑکی یہ سوچے کہ میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کروں، پوزیشن لینا شروع کر دوں جبکہ وہ میٹرک پاس بھی نہ ہو۔ تو کیا وہ ایسا کر سکتی ہے......؟'' بینا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ زونیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو بس، یہ سمجھ لو کہ جس چیز میں تم طاق ہو وہ اب مشکل ہے...... اور جو کام تمہیں سیکھنا ہے وہ آسان ہے۔''

''سادہ الفاظ میں سمجھائیں ناں......'' زونیہ کا موڈ کچھ بہتر ہوا۔

''بھئی یہ کھانا وانا بنانا تو مہینے، دو مہینے کی مار ہے، سال بھر بعد تو تم آپی سے بھی زیادہ مزے کے کھانے پکانے لگو گی۔''

''سچ آنی......!'' زونیہ یوں خوش ہوئی گویا ایکسپرٹ ہی ہو گئی۔

''بس لیکن شرط ہے۔'' بینا نے ہاتھ میز پر جماتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ ہوگا کیسے؟''

''یہ ہوگا چیلنج سے۔'' بینا مسکرائیں...... ''ہم دونوں موبائل پر ایک دوسرے سے تمام رابطے میں رہیں گے۔ اور ویک اینڈ پر تم میرے گھر آ جانا...... بلکہ ایسا ہے کہ ایک ویک اینڈ پر تم آیا کرنا، اگلے پر میں آؤں گی، چھ ماہ کی ٹریننگ سمجھ لو۔''

''ارباز کو راضی کرنا پڑے گا یہ ویک اینڈ والی بات پر۔'' زونیہ پُرسوچ انداز میں بولی۔

''اوکے کرتی ہوں کچھ......'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔

☆☆☆

''آنی! آپ کی ٹریننگ اتنی جادو اثر ہے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔'' ارباز چپاتیوں اور قورمے سے انصاف کر رہا تھا۔

''اور میری محنت......'' زونیہ نے آنکھیں نکالیں۔

''ارے بابا، اس پر تو پورے سو نمبر ہیں تمہارے۔''

''بس خالی خولی باتوں پر ہی ٹرخایا کریں......'' زونیہ نے ننھی گڑیا کو ایک بازو سے دوسرے بازو پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

''یقین مانیں آنی! وہ جو پہلی بہترین اور پرفیکٹ بریانی کھلائی تھی ناں اس وقت سے یہ میرے لیے انعام اناؤنس کر رہے ہیں۔ اب ماشاءاللہ ہماری گڑیا بھی چھ ماہ کی ہو گئی ہے ابھی تک انعامات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ملیں گے...... نہ جانے کب......'' زونیہ نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''بھئی کہاں تو تم ابلے، پھیکے، سیٹھے کھانے کھلاتی تھیں۔ کہاں یہ عالم کہ روز ہی ایک سے ایک بہترین ڈش بنا رہی ہوتی ہو۔ تم پر تو انعامات کی بارش کرنا پڑے گی۔''

''ذرا جلدی کر لو صاحبزادے...... اگلے ہفتے تمہارے سربراہان پہنچ رہے ہیں۔ پھر بہنوں پر بھی کرنا پڑے گی انعامات کی برسات......''

''اوہ یس، یہ تو اچھا یاد دلایا آپ نے......'' ارباز نے سر ہلایا۔

''ویسے ارباز ایک بات ماننے والی ہے۔ تمہاری بیوی ہے بہت محنتی لڑکی جتنی تیزی سے اس نے یہ سب

سیکھا ہے۔ میں اتنا جلدی اتنا بہترین رزلٹ بالکل ایکسپیکٹ نہیں کر رہی تھی۔ وہ بھی ایسی حالت میں جب اس کی اپنی فزیکل کنڈیشن بھی ٹھیک نہیں تھی۔" ہاتھ سے زونیہ کی گود میں سوئی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔

"بس، ان کو تو مجھے الفت خالہ کے سامنے جھوٹا ثابت کرنا تھا اسی جذبے نے اس حالت میں بھی مجھے اتنی محنت کرنے کی ہمت دی۔ اب دیکھ لیجیے گا الفت خالہ آپ کو ہی جھوٹا سمجھیں گی۔ میرے ہاتھ کے اتنے مزیدار کھانے کھا کر۔"

"ہیں......" ارباز اتنا حیران ہوا کہ نوالہ ہی منہ میں ڈالنا بھول گیا۔

"تم نے جو اتنے ذائقے دار کھانے پکانے سیکھے وہ سب مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے......؟"

"تو اور کیا......" زونیہ نے فخر سے گردن اکڑائی۔

اس کے بعد جو ہنسی کا فوارہ ارباز کے منہ سے چھوٹا...... اس نے زونیہ چھوڑ بینا کو بھی حیران پریشان کر دیا۔

"اُف میرے اللہ...... میں نے تو کبھی امی کو کچھ نہیں بتایا۔ اور تم میرے ان جھوٹے فونز کو دل پر لے گئیں۔" ارباز کی ہنسی تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔

"وہ فون کالز جھوٹی تھیں؟" زونیہ کے حواسوں پر بم گرا......

☆☆☆

زونیہ، گڑیا کو چادر اوڑھا کر سیدھی ہوئی تو ارباز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ رہا تمہاری محنت کا انعام......" کلائی میں دو کنگن پہنائے،

"مائی گاڈ...... گولڈ کے کنگن......" زونیہ کے منہ سے خوشی سے چیخ نکلی۔

"جی...... گولڈ کے کنگن وہ بھی ہیرے جڑے......" اس نے ننھے، ننھے ہیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اب ذرا تم مجھے یہ بتاؤ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہارا کوئی ویک پوائنٹ امی یا کسی اور کے سامنے ڈس کلوز کروں گا۔" ارباز نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر لبوں سے لگائے۔

"وہ تو میں تمہیں یونہی تنگ کرتا تھا۔ تمہاری عزت تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔"

ایک آنسو زونیہ کی آنکھ سے ٹپکا۔ جس کو ارباز نے اپنی انگلی کی پور سے چن لیا۔

"اور میں یونہی آپ کو اتنا برا اور خالہ کو اتنا اعلیٰ ظرف سمجھتی رہی۔ وہ ہنسی...... کمرے میں جیسے جلترنگ سا بجا۔

☆☆☆

"حیدر......!" بینا نے پاؤں کا مساج کرتے نظر اٹھا کر مجازی خدا کو دیکھا۔

"ہوں......" انہوں نے اخبار سے نظر اٹھائی۔

"مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی...... منیبہ آپی، اپنی جگہ ٹھیک تھیں، زونیہ اپنی جگہ تو پھر غلط کون تھا؟"

"غلط ہماری سوچ ہے ڈیئر......" حیدر نے اخبار تہہ کر کے سائیڈ پر رکھا۔

"کیا مطلب......؟" بینا نے ابرو اٹھائی۔

"بہت سادہ سی بات ہے کچھ مائیں یہ سوچ کر بچوں یا بچیوں سے کام نہیں کرواتیں کہ آگے ساری زندگی انہوں نے کام ہی تو کرنا ہے چلو جتنا آرام میکے میں کر لیں بہتر ہے۔ حالانکہ کام کو بوجھ سمجھنا ہی غلط ہے، کام تو زندگی ہے اور ہمارے دنیا میں ہونے کا مقصد ہے۔ اسے بوجھ کہنا یا بچیوں کے ذہنوں میں ایسی باتیں ڈالنا یہ غلط سوچ ہے ہماری۔"

بینا نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "ویسے حیدر! ایک بات طے ہے اللہ نے ہمیں اولاد دی تو ہم شروع سے ہی اسے کام کا عادی بنائیں گے۔"

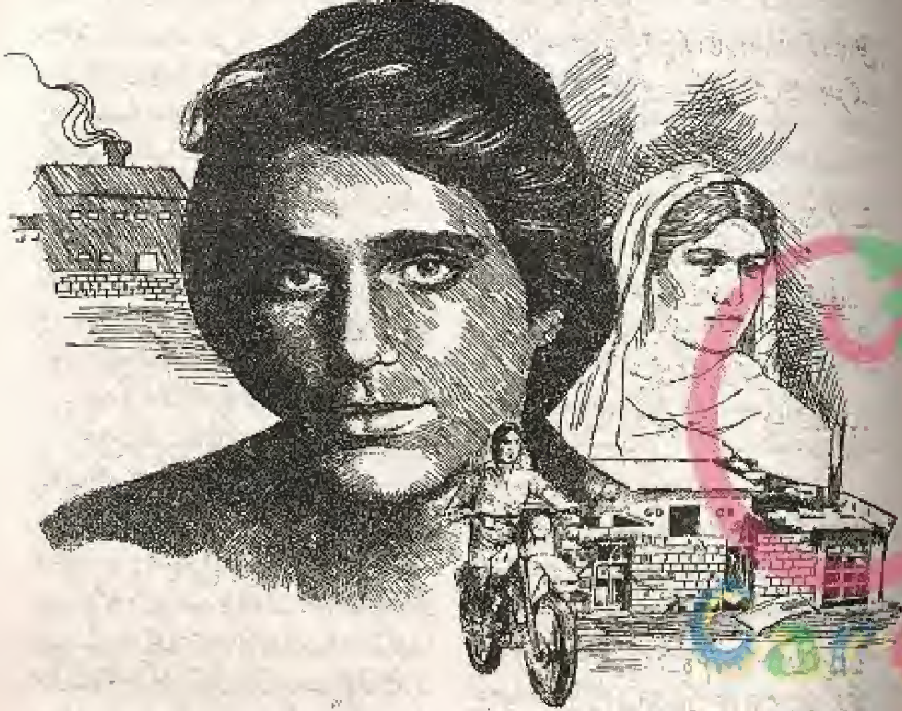
"ضرور...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

بینا نے ایک اطمینان بھری سانس بھر کے شریک سفر کے شانے سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔

▲▲

فصل

صبیحہ شاہ



سالوں سے وہ میرا راستہ ہے۔ بھلا کتنے برسوں سے......؟ اس سوال کے جواب کے لیے انگلیوں پر شمار کرنے بیٹھوں تو شاید کیا یقیناً کر نہ سکوں گا...... یہ اوبڑ کھابڑ پگڈنڈی نما سڑک یا سڑک نما... پگڈنڈی جو میرے گھر سے ذرا آگے جا کر...... بیس منٹ کی مسافت پر...... مجھے میری فیکٹری...... (میرا مطلب ہے کہ اس فیکٹری...... جہاں میں ایک مزدور بھرتی ہوا تھا اور آج شفٹ انچارج ہوں) تک لے جاتی ہے۔

دراصل ان کچے پکے، ادھورے نامکمل جھگیوں نما گھروں کی بستی کے درمیان سے گزرتی ہے اور سائٹ ایریا لے جاتی ہے اور اس راستے کو میں شارٹ کٹ کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ اگر میں اپنے گھر سے نکل کر پکی اور باقاعدہ سڑک سے ہوتا ہوا فیکٹری جاؤں تو مزید آدھا گھنٹا دیر سے پہنچوں گا اور راستے میں جو ٹریفک کا اژدہام ملے گا وہ الگ کوفت و تاخیر کا سامان......

اوہ...... ہاں...... صحیح کہہ رہے ہیں آپ...... بات میں نے درمیان سے ہی شروع کردی تو آپ کی سمجھ میں کیا خاک آئے گی......

چلیں...... کہانی شروع سے شروع کرتا ہوں۔

ہاں کہانی...... ہم سب کی زندگیوں کا ہر نیا دن ایک کہانی ہی تو ہے...... اور جی...... نئی کہانی بھی کیا...... ہمارے جیسے طبقے میں تو بس کردار بدل جاتے ہیں۔ کہانی تو ایک ہی رہتی ہے۔

پیٹ کا کنواں بھرنے کی تگ و دو کی کہانی......

تو بھائی میری کہانی بھی...... دراصل اس اندھے کنویں کو بھرنے کے جتن سے شروع ہوتی ہے۔

بیٹا...... اور وہ بھی بڑا بیٹا ہونا...... کیا آزمائش ہے یہ تو مجھے ابا کے اچانک ہارٹ اٹیک اور پھر انتقال نے بتایا۔

سوئم، جمعراتیں، چالیسواں سب ہی کچھ کرلیا اماں نے...... میں سترہ، اٹھارہ برس کا...... لڑکپن و جوانی کے سنگم پر کھڑا اتنا ہی ہونق اور بے تکا تھا جتنے کہ عام طور پر اس عمر کے لڑکے ہوتے ہیں۔ لیکن وقت سے بڑا کاریگر بھلا کون ہے اور اس کاریگر وقت نے بھی اس ہونق اور بونگے لڑکے کو ایک ذمے دار اور محنتی بیٹے کے روپ میں تراش لیا۔

''بھائی صاحب...... ساجد کو کل تیار رکھیے گا، میں اسے ساتھ ہی لے جاؤں گا فیکٹری......'' فضل چچا...... ہمارے محلے دار جو ابا کے ساتھ ہی فیکٹری میں کام کرتے تھے، انہوں نے دروازے کی اوٹ میں کھڑی اماں سے کہا۔

''جی اچھا بھائی......'' اماں نے سفید اوڑھنی کے آنچل سے اپنے امڈتے آنسو پونچھے تھے۔

''چلو...... شکر ہے...... اللہ نے کوئی وسیلہ بنا ہی دیا۔'' دادی نے آہ بھر کر کہا تھا۔

میں کچھ سمجھ رہا تھا اور بہت کچھ نہیں سمجھ رہا تھا (ہونق اور بونگا جو تھا) میرے استفسار پر اماں اور دادی دونوں ہی چونکی تھیں...... اماں نے نظریں چرالیں...... اور دادی کے پچکے گالوں پر آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ، ٹوٹ کر گرنے لگیں۔

''بیٹا...... تم بڑے ہو اب گھر کے......'' انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور میری پیٹھ سہلائی۔

''شکر ہے کہ فیکٹری مالکان خدا ترس ہیں اور تمہارے بادا کی خدمات کے صلے میں تمہیں ملازمت دینے کو کہا ہے انہوں نے۔''

اور...... پھر میں واقعی بڑا ہوگیا۔

مگر...... فیکٹری میں چھوٹا تھا...... مجھ سے شفقت کا برتاؤ کیا جاتا...... ہلکا کام کرنے کو دیا جاتا...... کہانیاں سب ایک سی ہوکر بھی الگ، الگ ہوتی ہیں۔

ابا مر گئے...... میں بڑا ہوگیا......

لیکن...... ساری ایک سی کہانیوں اور میری کہانی میں فرق یہ تھا کہ فیکٹری مالکان روایتی طور پر ظالم، غاصب اور بے حس نہیں تھے۔ (حیرت کی بات ہے ناں) وہ مہربان مگر بہت سخت منتظم تھے۔ چیزوں کو ایک باقاعدگی اور ترتیب و طریقے سے لے کر چلنے والے۔ یہاں مجھے تجربے نے ایک بات سکھائی کہ جب آپ کو کوئی سسٹم، کوئی ادارہ چلانا ہو تو اخلاص تو ہو مگر جذباتیت نہ ہو...... جذباتی آدمی کوئی ادارہ نہیں چلا سکتا...... ہاں...... تو...... بات ہو رہی تھی میرے بڑا ہو جانے کی...... میں مزدور بھرتی ہوا۔

ابا نے بھی اپنی جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپے کی دہلیز پر بھی اسی ایک فیکٹری میں ہی بیٹھے، بیٹھے قدم رکھ دیے تھے، اب ان کے بعد میں یہاں تھا...... وقت کے تقاضے ابا کے دور کے مقابلے میں بہت تیزی سے بدلے تھے...... اب تو اچھے اداروں میں قاصد......

ہاں...... وہی...... چپڑاسی...... تو اچھے اداروں میں تو چپڑاسی بھی اب کم از کم انٹر پاس بھرتی ہوتے ہیں...... میں پڑھنے میں بھی بہت اچھا نہ تھا...... بس ٹھیک تھا...... اتنا ہی ٹھیک جتنا کہ کسی پیلے اسکول کا اسٹوڈنٹ ہوسکتا ہے...... یہ سیٹھ صاحب کی مہربانی اور فضل چچا کی نگرانی اور راہ نمائی تھی کہ میں میٹرک اور انٹر کرسکا...... کمپیوٹر کی تھوڑی سی بلکہ ضرورت بھر ٹریننگ کے بعد مجھے آفس میں اس شرط پر جگہ دی گئی کہ میں اپنی پڑھائی جاری رکھوں گا...... میں کیا کرسکا...... اور کیا نہ کرسکا وہ ایک الگ کہانی ہے، اس وقت میں آپ کو اپنی آپ بیتی سنانے کے موڈ میں نہیں ہوں بلکہ وہ بتانے جارہا ہوں جو میں روز دیکھتا ہوں...... اور جو میں نے آج دیکھا۔

ہاں...... میں آپ کو بتارہا تھا کہ میں روز اس اونچے نیچے اوبڑ کھابڑ راستے کو شارٹ کٹ کی خاطر استعمال کرتا فیکٹری پہنچتا......

شروع میں ابا کی سائیکل پہ جاتا تھا۔ کچھ بھی تو قابلِ دید نہ تھا......

گھروں کے آگے بہتی، ابلتی، بھری ہوئی نالیاں......

ان نالیوں پر رفع حاجت کرتے بچے...... ٹاٹ کے موٹی پھٹی چادروں کے رنگ برنگے پردے جو دروازوں پر لٹکے، کثیف اور چیتھڑا ہوچکے تھے۔ روز ہی کوئی نہ کوئی چھالی، کوسنے دیتی ماں، جن کا یہ اسٹائل ہی بن گیا تھا۔ بچوں کو پکارنے و بلانے کا...... اور ان گلیوں اور تنگ چھوٹی سڑک پر کھیلتے، لڑتے، شور مچاتے بچے......

یہ میلے، گندے سندے بچے یہاں شور مچانے، کھیلنے میں حق بجانب یوں ہیں کہ یہاں نہ کھیلیں تو کہاں جائیں...... کون سے ان کے لیے پارک اور کھیل کے میدان مختص تھے...... یہ گلیاں...... یہ گھروں کے آگے بنے چبوترے، تھڑے ہی ان کے میدان ہیں، ان کے پارک ہیں، ان کی چوپال اور ان کے دنگل کے اکھاڑے...... یہی ان کے بوڑھوں و جوانوں کی بیٹھکیں ہیں۔ کھیل کے میدان اور چوپال تو ہمہ وقت آباد رہتے، اکھاڑا مہینے میں دو چار بار سجتا، اکثر لیڈیز سیشن بھی ہوتا...... اور یہ ہنگامہ آرائی کبھی بچوں کی خاطر تو کبھی آپس کی کوئی چپقلش ہوتی جو دوپٹے...... پردے سے بے نیاز ان خواتین کو باہر تک لے آتی۔ کبھی لڑکے بالے، لونڈے لپاڑے یا مرد حضرات برسرپیکار ہوتے اور نادر اور ناشنید گالیوں کا ایسا، ایسا شہکار ضیافتِ گوش کا باعث بنتا کہ سماعت سنگ، سنگ جاتی...... شروع، شروع میں تو میں رک جاتا تھا۔ تماشائیوں کے ہجوم کا ایک حصہ بن جاتا تھا...... میں دیکھتا تھا کہ ناظرین و سامعین پہلے تو خاموشی سے صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرتے اور پھر بیچ بچاؤ، صلاح و صفائی کے لیے میدان میں کود پڑتے اور جلد ہی امن و سکون بھی ہوجاتا...... چند ماہ میں ہی میں اس تماشے کا عادی ہوگیا اور اکثر ایسے ہجوم پر نگاہِ سرسری ڈال کر پیڈل تیز، تیز مارتا نکلتا چلا جاتا......

ایک روز کچھ عجیب ہی منظر تھا جب میں نئی، نئی خریدی ہوئی بائیک...... (بائیک تھی تو سیکنڈ ہینڈ جو میں نے قسطوں پر لی تھی مگر لی ابھی چند روز قبل ہی تھی) پر اپنے تئیں اکڑتا، فراٹے بھرتا جارہا تھا بلکہ یوں کہہ لیں کہ فراٹے بھرنے کی کوشش کررہا تھا مگر ہر چند فٹ بعد کوئی نہ کوئی گڑھا...... کوئی نہ کوئی اسپیڈ بریکر یا کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا کہ میرے فراٹوں کو بریک لگانے پڑتے تھے...... میں نے دور ہی سے ایک مجمع دیکھا جو ایک گھر کے آگے...... (اور گھر بھی کیا...... بنا پلستر کے ایک آدھے ادھورے سے چھپر والے جھونپڑے نما گھر) بچوں، بڑوں کا ہجوم لگا ہوا ہے...... اچھا...... ایک اپنے مشاہدے کی بات بتاتا چلوں...... میں نے نوٹ کیا ہے، خوبیاں و خامیاں ہر دو طبقات میں کم و بیش یکساں ہوتی ہیں...... بس ان کے انداز ان کے وسائل کے حساب سے مختلف ہوتے ہیں...... اخلاقی و شرعی و معاشرتی برائیاں ایک تو اپر کلاس میں اور دوسرے سب سے نچلے طبقے غریب اور کم تعلیم یافتہ طبقے میں یکساں

ہوتی ہیں...... دونوں طبقات میں نشہ کرنا عام بات...... (ہاں نشے کی اقسام مختلف ہوسکتی ہیں) دونوں طبقات میں بیویاں شکی اور غیر مطمئن ہوتی ہیں، دونوں طبقات میں اپنے اہداف کو حاصل کرنے کو کچھ بھی کیا جاسکتا ہے، دونوں طبقات میں عورتوں و مردوں کا معاشرتی اختلاط عام بات ہے، درمیانہ طبقہ شاید بزدل ہوگا...... سڑک چھاپ زبان میں کہوں تو تھڑ نہیں ہوگا...... خیر...... میں بھی خیالات کے فراٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہوں...... ہاں...... تو میں کہہ رہا تھا کہ اس روز اس گھر کے آگے مجمع لگا ہوا تھا...... میں یہاں ایک بوڑھی عورت کو اکثر دیکھتا تھا کہ جو اکثر گھر سے یوں نکل رہی ہوتی تھی جیسے ایک خاص وقت میں وہ کسی کام سے کہیں جاتی ہو...... سوتی دوپٹے کی بکل مارے، بغل میں ایک پوٹلی سی، دھیرے، دھیرے چلتی ہوئی وہ مجھے اکثر نظر آتی تھی...... آج وہی بوڑھی عورت ایک اٹھارہ بیس برس کے لڑکے سے پٹ رہی تھی...... کچھ لوگ اس بدمست ہاتھی کی طرح بے قابو لڑکے کو ہائیں، ہائیں کرتے قابو کرنے کی کوشش کررہے تھے...... ایک آدمی نے گالیاں بکتے ہوئے اس لڑکے کے ہاتھ میں تھامی لکڑی جس سے وہ اس عورت کو مار رہا تھا چھین کر دور پھینکی...... اور ایک کرارا سا چھانپڑ رکھ کر اس لڑکے کے منہ پر دیا...... وہ لڑکھڑا کر دور دیوار سے ٹکرایا...... بوڑھی عورت کے سفید خشک بال بکھر کر عجیب وحشت ناک منظر پیش کررہے تھے...... وہ اب ایک گھر کے آگے بنے چبوترے پر بکھری ہوئی سی بیٹھی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی...... دو چار عورتیں اس کے اردگرد بیٹھی اسے دلاسا دے رہی اور لڑکے کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

''ابے...... تیرا کوئی پکا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

تھپڑ مارنے والا آدمی چلا رہا تھا۔

میرے پاس وقت کم تھا...... گھر میں بہن کی شادی کا سلسلہ تھا میں اس سارے منظر نامے کے دی اینڈ کا انتظار نہیں کرسکتا تھا سو پاس کھڑے آدمی سے صورت حال کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ''بوڑھی عورت اس لڑکے کی دادی ہے، ماں مرگئی ہے، دادی نے بہت لاڈ سے اس بچے کو پالا ہے اس لاڈ دلار کا نتیجہ یہ نکلا یہ نشے کا عادی ہونے کے علاوہ کچھ کر نہ پایا...... اس کو جب اپنی ضرورت پوری کرنی ہوتی ہے دھونس، زبردستی سے دادی سے پیسے اینٹھ کر لے جاتا ہے، دادی اس کی دو چار گھروں میں جھاڑو پونچھا کردیتی ہے، یہ پچھلے طرف والے بنگلوں میں...... آج شاید دادی کے پاس پیسے نہ ہوں یا اس نے دیے نہ ہوں گے...... تو بدبخت نے آج دادی پر ہی ہاتھ اٹھالیا۔''

اوہ...... مجھے اپنی دادی کا خیال آگیا۔

''بڑی اماں......!'' ہاں دادی کو ہم بڑی اماں ہی کہتے تھے...... بڑی اماں کے پاس دینے کو کچھ نہ ہوتا تھا...... صرف دعائیں...... ہاں دعائیں ہوتی تھیں۔

اور ہم سب ان سے جی بھر کر فیض یاب ہوتے۔

توبہ استغفار کرتے میں نے بائیک کو کک لگائی اور اس منظر نامے سے باہر نکل آیا۔

زندگی رکتی نہیں۔

ہر نیا دن گزرے دن کے پیچھے بے قراری سے دوڑا چلا آتا ہے اور ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا لیکن کبھی، کسی دن کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ ہمیں اچانک اور اک ہوتا ہے کہ ''اوہو...... اتنا وقت گزر گیا۔'' ہاں...... اتنا ہی وقت گزر گیا...... کہ میں سجاد لیبر سے سپروائزر بنا، سپروائزر سے شفٹ انچارج بنا...... کام کے بعد شادی ہوئی اور دو بچوں کا باپ بھی بن گیا...... اپنی دادی اور پھر اپنے بچوں کی دادی کو بھی سپرد خاک کر آیا۔

رضائے الٰہی، قانونِ کارخانۂ قدرت...... زندگی کا سائیکل یہی ہے...... آج وہ، کل ہماری باری ہے، میرا بغیر پلستر والا ڈھائی کمرے کا گھر پلستر ہوگیا، رنگ و روغن بھی ہوگیا...... آسائشات زندگی مناسب حد تک دسترس میں آگئیں...... الحمد للہ...... اور اس سب کے ساتھ، ساتھ میرے سر میں چاندی کے تار بھی روز کے حساب سے بڑھ کر اور چمک رہے تھے...... لیکن جب تک بھی مجھے وقت کی تیز رفتاری کا اندازہ نہیں ہوا...... اور...... ہوا بھی تو کس دن......؟

اس دن جب میں اپنے اسی لگے بندھے معمول کے مطابق، معمول کے راستے پر بائیک پر سوار ہر اسپیڈ بریکر پہ اچکتا، ہچکولے کھاتا، ٹریفک کی بے ترتیبی سے الجھتا چلا جارہا تھا...... ہاں دیکھیے تو...... یہ تو میں نے ذکر نہیں کیا کہ اب یہ پگڈنڈی سڑک نما ہوچکی تھی...... صفائی کی صورت حال تھوڑی سی اس علاقے میں بہتر ہوئی تھی کیونکہ کھلی ہوئی نالیاں پاٹ دی گئیں...... بہرحال ہوا یوں کہ اس روز بہت دنوں بعد اس راستے پر کچھ ہلا گلا محسوس ہوا...... پُرشور آوازیں اور مجھے دیکھ کر بھاگ، بھاگ کر آتے اور مجمع میں سر ڈال کر گھس کر جگہ بناتے بچے، توبہ، توبہ کرتی عورتیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس جگہ...... اس گھر کے آس پاس ہی پہلے بھی کچھ ایسا ہی مجمع میں دیکھ چکا ہوں......

''آج کیا ہوا ہے بھائی؟'' میں رک گیا......

بائیک سائڈ پر کرکے اترا اور جگہ بناتا ہوا آگے بڑھا...... اوہ خدایا...... پھر وہی منظر...... بس کردار ہی تو بدلے تھے۔ اُف...... ایک اڑے، اڑے روکھے، بے ترتیب سفید ہوتے بالوں والا شخص اپنے آپ کو ایک نوجوان کے ہاتھ میں تھامی وکٹ کے واروں سے بچانے کی سعی لاحاصل کررہا تھا اور ہائے واویلا کررہا تھا...... لڑکا جس نے شوخ سے رنگ کی برینڈ شرٹ اور تنگ سی مہنگی پتلون پہنی ہوئی تھی جو شاید گزشتہ مہینہ بھر سے اس کے بدن کی زینت تھی...... (اس کی کثافت اور چیکٹ تو یہی بتارہی تھی) وہ شخص وکٹ کے ہر وار پہ ہائے کرتا اور مارنے والا لڑکا چلاتا...... ''دے...... دے...... میں کہتا ہوں دیتا ہے یا نہیں؟''

کچھ گھروں میں...... کچھ لوگوں کے اردگرد زندگی اگر رکتی نہیں کہ...... زندگی تو نام ہی حرکت کا ہے...... لیکن کچھ لوگوں کے اردگرد زندگی ایک گول چکر میں ضرور گھومتی ہے اور گھوم کر بار، بار وہیں آکھڑی ہوتی ہے جہاں اس چکر میں گھومتے کردار بھی کھڑے تھے۔

(پتا چلا یہ بوڑھا وہی لڑکا ہے جو کبھی اپنی دادی سے دھونس دھڑی، مار پیٹ کرکے الٹے تللوں کے لیے پیسے اینٹھا کرتا تھا...... دادی اسی کی خاطر محنت مزدوری کرتی...... لاڈ اٹھاتی اور بیچاری مار بھی کھاتی...... بھانت، بھانت کی بولیاں...... لعنت ملامت جانے کیا، کیا تھا اس سارے منظر میں اور میں سوچ رہا تھا۔ پھر...... پھر اب کیا ہوگا؟ ایک دن اسی نکھے، دھرتی پر بوجھ کی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح شادی کردی جائے گی......

اس امید پر کہ ''ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ تو کیا ٹھیک ہوگا شادی کے نام پر قید عذاب میں آنے والی دو چار بچے جنے گی اور...... یہ سائیکل یعنی چکر یونہی چلتا رہے گا۔ اس لونڈے کی دادی گزر گئی...... اس کی شادی کردی...... وہ چھوکرا جوان سے بڈھا ہوا اور آلو پیاز کا چھوٹا سا ٹھیا لگاتا رہا...... کاروبار کرتا رہا...... اتنا کہ روز کنواں کھودتا پھر پانی پیا جاتا...... اور اس جھونپڑے کے اندر بیٹھی ایک عورت پیاسی ہوگی اور پیاسی ہی مرجائے گی۔ اور اب یہ...... یہ چھوکرا اسی بڈھے کا جو جوانی میں دادی سے زور زبردستی سے پیسے وصولا کرتا تھا اب...... یہ بھی بالکل ایسے ہی باپ سے، ماں سے پیسے اینٹھتا ہے جیسے کبھی اس کا باپ اینٹھا کرتا تھا۔

زندگی میں ہمارے تجربے میں بڑی ہی عجیب، عجیب باتیں آتی ہیں۔

وہ حکایتیں، وہ باتیں جو ہم بزرگوں سے سنتے، کتابوں میں پڑھتے، سوشل میڈیا پر گردش کرتے میسج میں پڑھتے ہیں...... اس روز مجھے پتا چلا کہ صرف حکایتیں، باتیں اور کہانیاں محض لفاظی نہیں ہوتیں...... تجربات کا نچوڑ ہوتی ہیں۔

انسان جو بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔

جو ہم زندگی کو دیتے ہیں، زندگی وہی ہمیں لوٹاتی ہے...... اور یہ لوٹانا کم نہیں...... البتہ زیادہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ چاہے نیکی ہو یا بدی......



ناولٹ

بارھواں حصہ

محبت لفظ ہے لیکن.......

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کے بولا کرو کیونکہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برا یا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

خوب صورت جذبوں کی بازگیاں بیان کرتی حیا بخاری کی ایک دل نشیں تحریر

باباجی شہر سے واپس آ چکے تھے اور اب اسے اور گل مینے کو واپس شہر جانا تھا۔ شام تک نکلنا تھا انہیں اور وہ جانے سے پہلے کچھ وقت ضرور اللہ لوک کے پاس گزارنا چاہتی تھی لیکن رات سے پہلے یہ کسی طرح خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ رات دن حویلی کے سارے اندرونی و بیرونی مورچوں پہ سخت نگرانی ہوتی تھی۔ رات کو پھر بھی اس طرف ویرانی اور اندھیرا ہو جاتا تو وہ فائدہ اٹھا لیتی... لیکن دن کے وقت وہ یہ رسک نہیں لے سکتی تھی۔ کیونکہ دن کی روشنی میں وہ آسانی سے کسی کی بھی نظر میں آ سکتی تھی اور پھر شاید وہ اس زیر زمین زندان اور اس لال حویلی کے چھپے راز کبھی نہ جان پاتی۔ اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے باباجی کی شخصیت میں کچھ تو غلط تھا۔ وہ ویسے نہیں تھے جیسا نظر آتے تھے۔ کچھ پرت چڑھی تھی ان کے کردار پہ اور یہ پرت اس وقت اس کے سامنے اگر کوئی کھول سکتا تھا تو وہ صرف اللہ لوک ہی تھی۔

رات ان سے کئی گئی داستان میں وہ اتنا تو جان ہی گئی تھی کہ جو دلہن بنی وہ گل تھیں۔ کیونکہ نسرین پھپھو کے بارے میں اس نے سنا تھا وہ گھر سے بھاگ گئی تھیں اور اس کے بعد آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ لیکن یہ بات اس کے لیے اب بھی اچنبھے کا باعث تھی کہ اگر گل کی شادی اتنی دھوم دھام سے ہوئی تو وہ خود کو نوچ، نوچ کے اجاڑنے والی وہ دلہن لڑکی کون تھی؟ اللہ لوک سے آج اسے بھی جاننا تھا۔ اور اسے اسی بے صبری کے باعث دن کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ اوپر سے اب ماہ جی کا نیا حکم۔ وہ حقیقتاً پریشان ہو کے رہ گئی تھی۔

"جو بھی ہو بہر حال اللہ لوک سے ملے بغیر میں ابھی نہیں جا سکتی۔" اس نے جیسے تہیہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ خود بھی جانتی تھی یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔ کافی دیر تک وہ کمرے میں بند ادھر سے اُدھر ٹہلتی اللہ لوک سے ملنے کا راستہ تلاش کرتی رہی اور پھر اچانک ہی اسے ابراہیم کا خیال آیا تھا۔ ابراہیم وہ شخص تھا جس پہ وہ اعتبار کر سکتی تھی۔ وہ قابل بھروسا تھا۔ جس طرح کی چوکشن تھی وہی ایک آدمی تھا جو نہ صرف اس پہ اعتبار کرتا بلکہ مدد بھی کرتا۔ اس نے فوراً اسے تلاش کرنا شروع کیا۔ وہ حویلی کے پچھلے صحن میں اپنے کوارٹر میں موجود اپنے سامان کی پیکنگ میں مصروف تھا۔

"ابراہیم!" اس نے دروازہ ہلکے سے بجاتے ہوئے آہستگی سے پکارا۔ ابراہیم کے ہاتھ اس کی آواز پہ یک دم رکے۔

"خان زادی.....؟" وہ مڑے بغیر دھیرے سے بولا تھا۔ گل مینے سے تو اسے اس قسم کی حرکت کی ہمیشہ امید اور ڈر رہتا تھا لیکن اوزگل اس کے کمرے تک آجانے کی ہمت کر لے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے پریشانی گھیرنے لگی۔

"مجھے جانے سے پہلے حویلی کے ویران بیرونی حصے میں ایک ضروری کام ہے۔ تم بس میری یہ مدد کر دو کہ اس طرف والے مورچے کے لوگوں کو آدھے گھنٹے کے لیے دوسری طرف مصروف رکھو۔ میں شہر جا کے تمہیں سب بتا دوں گی۔ میں چار بجے تمہارا انتظار کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ رکی نہیں۔ واپس بھاگ گئی۔

ابراہیم حیران سا دروازے تک آیا تو وہ پچھلا صحن عبور کرتی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"خان زادی کو بھلا اس ویرانے میں ایسا کیا کام کہ انہیں میری مدد کی ضرورت پڑ گئی۔" وہ اب پلٹتے ہوئے پریشانی سے سوچ رہا تھا۔ ہو نہ ہو کوئی بڑی بات تھی ورنہ ایسی بے باکی کی توقع گل مینہ سے کی جا سکتی تھی لیکن اوزگل.....؟

وہ جس مزاج کی لڑکی تھی۔ ابراہیم حیات اچھی طرح جانتا تھا۔ کسی بھی صورت وہ کسی مرد کو کبھی مخاطب نہیں کرتی تھی۔ گھر کے مردوں کو بھی ہچکچاتے ہوئے مخاطب کرتی..... اور ایسے میں اس قدر اچانک اسے تقریباً حکم سنا کے اس کا چلے جانا، کام کے واقعی اہم ہونے کا پتا دے رہا تھا.....

گل مینہ ہوتی تو وہ یقیناً ٹال جاتا لیکن اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ٹھیک چار بجے وہاں ضرور اس کی مدد کرنے جائے گا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ مطمئن ہو کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو رات ہونے لگی تھی۔ اس کا سر سہلاتی ویدے بالکل اسے قریب بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پہ اس کے لیے پریشانی تھی۔ وہ شرمندہ سی ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"آئی ایم سوری پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔" اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے اس نے معذرت کی تھی اور لب دانتوں تلے کچلتے ہوئے اپنے آنسوؤں پہ ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آنسوؤں کو روکنا نہیں چاہیے۔ انہیں بہہ جانے دیا جائے تو زیادہ اچھا ہوتا ہے..... اس سے من کے اندر کا سارا میل دھل جاتا ہے۔ جیسے بارش کے بعد پتے، پتے پہ جمی گرد صاف ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی من کے کئی درد، کئی گھاؤ ان کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔"

انہوں نے نرمی سے اس کا کومل سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ لالہ کی پلکیں اس بار آنسوؤں کا بوجھ نہیں سہار پائیں۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی۔

"تم اور باری، زندگی کے کس موڑ پہ آ چکے ہو میں نہیں جانتی اس کے باوجود بھی کہ باری مجھے سب حالات بتا چکا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کیا وجہ تھی جو تمہیں یوں رسوا کر گئی لیکن باری نے ایک مرد ہونے کے ناتے جو کچھ کیا وہ میرے لیے فخر کی بات ہے پھر بھی لالہ....." انہوں نے اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے تھوڑا توقف کیا۔

"پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ تمہاری زندگی مکمل ہو اور میرے باریال کی بھی۔ وہ لاکھ بڑا ظرف کر لے..... ہے تو ایک مرد ہی ناں..... اور اس طرح تو تم دونوں ہر دن اذیت میں گزارو گے..... میں چاہتی ہوں کوئی ایسا راستہ تلاش کروں کہ تمہارا اور باری دونوں کا راستہ سہل ہو جائے لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب تم مجھے ساری حقیقت بتا دو....." لالہ سسکنے لگی تھی۔

"میرا یقین کرو میں تمہارا پردہ رکھوں گی بالکل تمہاری ماں کی طرح۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اسے یقین دلایا تھا اور وہ بکھر کے رو دی تھی۔

درد اور کرب سے اس کی آواز پھٹی جا رہی تھی۔

اسے خود میں بھینچتے ہوئے ویدے نے اسے کھل کے رونے دیا تھا۔

کل اس کی حالت سے ہی وہ سمجھ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ جو بھی حادثہ ہوا تھا وہ ابھی تک اندر ہی اندر گھٹ رہی ہے۔ اندر ہی کہیں پلنے والے درد کو باہر آنے کا راستہ نہیں ملا تھا۔ سب اپنوں کو جیسے اپنی عزت اور وقار کی پڑ گئی تھی۔ کسی نے اس کا دکھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تبھی وہ اندر ہی اندر بھر رہی تھی۔ ویدے کی ذرا سی محبت پہ وہ سارا درد آتش فشاں سے نکلتے لاوے کی طرح باہر آیا تھا۔

"وہ گناہ گار ہے میرا..... اللہ گواہ ہے میرا، میں اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ بس حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اس وقت مجھے وہ ٹھیک لگا..... ورنہ لالہ تو مرد کے سائے سے بھی دو گز دور بھاگتی تھی۔" وہ روتے، روتے بتانے لگی تھی۔

ویدے اس کی کمر سہلاتی رہیں.....

اور پھر اس نے ساری بات بتا دی تھی۔

"مجھے ضیا کے ہاتھ اور اس بوڑھے شخص کی زہریلی نظریں نہیں بھولتیں۔ انہوں نے میری زندگی برباد کر دی۔ اس دن اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو خدا کی قسم لالہ، ضیا کا بڑھا ہاتھ ہمیشہ کی طرح جھٹک کے چلی جاتی۔ عزت کے ڈر سے میں خود مکڑی کے اس جال میں پھنس گئی جو نہ جانے کب سے میرے لیے بُنا جا رہا تھا اور یہ سب امی کا دل دکھانے کی وجہ سے ہوا میرے ساتھ۔ میں ماں کو بدکردار اور خود کو بلند کردار کہنے والی لڑکی..... دیکھیں کتنی غلیظ ہو گئی ہوں میں..... کتنا بدبودار ہو گیا ہے میرا وجود....." وہ اپنے آپ کو پیٹنے لگی تھی۔

"مجھے مار دیں، میں اسی قابل ہوں....." اس پہ پھر وہی جنونی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ویدے نے بہت مشکل سے اسے سنبھالا۔

"میں چاہتی ہوں لالہ تم بھی ایک مکمل زندگی جیو۔ یہ تمہارا حق ہے لیکن اس طرح خود کو تباہ نہ کرو۔ یہ بچہ تمہیں نہیں چاہیے ہم اس کا بھی کچھ کریں گے۔ میں تمہیں خود لے کے جاؤں گی جہاں تم کہو گی۔ میں تمہارا مکمل ساتھ دوں گی لالہ لیکن اس طرح خود کو اذیت پہنچا کر تم اپنے رب کی نافرمانی کرو گی۔ اس کی نافرمان نہ بنو لالہ۔ اس آزمائش پر بھی اس کو پکارو تم اسے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی بیٹا....." وہ اس کے نرم بال سہلاتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے بہتا گرم پانی ان کی گردن جلائے جا رہا تھا۔ وہ جیسے اپنا سارا درد ان کو سونپ رہی تھی۔

"زندگی کب ایک سیدھی لکیر کی طرح رہی ہے۔ یہ تو بل کھاتے راستوں کی طرح ہوتی ہے۔ ایک طرف گہری کھائیاں اور دوسری طرف پُرکیف نظارے.....

بھی آسان لمبا سیدھا راستہ تو بھی بل کھاتے پُرخطر موڑ...... گرنے کا خدشہ ہمیشہ رہتا ہے۔" وہ اس کا نم چہرہ اپنے سامنے لاتے ہوئے بولیں......

"میں مانتی ہوں لالہ تم سے کوتاہی ہوئی اور بہت بڑی کوتاہی ہوئی۔ ہمارے بزرگوں کا ماننا ہے ماں' باپ کے سامنے بولا ہمارا ایک اچھا یا برا کلام کبھی کبھی ہماری ساری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے لیکن یہ کس نے کہا لالہ...... کہ غلطی کی معافی نہیں...... پھر ہمارا مذہب تو ایسا مذہب ہے جو ہمیشہ امید اور گنجائش نکالتا ہے۔ مایوس سے مایوس حالت میں بھی یقین کا دامن نہ چھوڑنے کا درس دیتا ہے۔"

وہ کچھ دیر رکی تھیں۔

"لیکن میں تو باعتاب ٹھہری۔ بے اماں ٹھہری...... معافی تلافی کی تو گنجائش ہی نہ بچی آنٹی۔ صرف سزا رہ گئی۔ منہ پہ اس طرح کالک لگی کہ شاید ہی کبھی ڈھل پائے۔" وہ پوری طرح مایوس تھی۔

"ٹھوکر انہیں بھی لگتی ہے لالہ جو اللہ سے ہر معاملے میں ڈرتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اللہ پاک انہیں سنبھال لیتا ہے۔ تمہارا معاملہ ایسا ہے کہ تم ماں کے معاملے میں اس رب کی نافرمان ہو گئیں۔ تم نے ٹھوکر کھائی اور تمہاری روح بھی تار، تار ہوئی لیکن توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ وہ ٹھوکر والوں کو سہارا دے، دے تو وہ ولی بن جاتے ہیں۔ خود سے سوچنا چھوڑ دو اور اس رب کے آگے جھک جاؤ۔ اپنے گناہ تسلیم کرو اور سچے دل سے توبہ کرو۔ وہ بے شک بڑا مہربان ہے۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"نماز پڑھ لو پھر کھانا کھاتے ہیں۔ کل باری کے جانے کے بعد تم اور میں صوفی صاحب کے پاس چلیں گے۔ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔ تمہارے ساتھ، ساتھ اب یہ سب باری کے لیے بھی ضروری ہے۔ تم تو پھر بھی ایک آزمائش سے گزر چکی ہو۔ باریال ابھی امتحان کی زد میں ہے اور میں تم دونوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔" لالہ نے سرخ ہوئی نظروں سے ان کا پُرنور چہرہ دیکھا تھا اور پھر خود کو سنبھالتی وضو کرنے اٹھ گئی کہ بعض اوقات رب کے در کے علاوہ انسان کے پاس اور کوئی در نہیں رہتا کھٹکھٹانے کو جو اصل میں کھٹکھٹانا چاہیے ہوتا ہے...... وہ بھی اسے اٹھتا دیکھ کر مطمئن ہوتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں......

☆☆☆

دن مختصر ہونے لگے تھے۔ تبھی فضا میں بھی گرمی اور تپش کی جگہ نمی اور ٹھنڈک لینے لگی۔ صبح سویرے گھاس پہ ٹھنڈی اوس کے قطرے سردی کی دستک دیتے محسوس ہوتے۔

جب سے لالہ اس جگہ سے گئی تھی۔ وہ بالکل بدل گیا تھا۔ پہلے والا لاابالی، بے پروا سا ضیا کہیں کھو گیا تھا۔ ساری، ساری رات جاگنے اور دوپہر کو صبح کرنے والا ضیا اب سرِشام لیٹ جاتا۔ دواؤں کے استعمال کے باوجود رات کے آخری حصے میں ہی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور باقی سارا وقت وہ پھر سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیتا۔ سورج کی کرنیں دھرتی کا سینہ جگمگانے لگتیں تو وہ باہر لان میں آ جاتا۔ پیروں میں اڑسے آرام دہ چپل برآمدے میں ہی اتار دیتا اور ننگے پیر گھاس پہ آ جاتا۔ ٹھنڈی نرم گھاس اس کے تن من کو شانت سا کر دیتی۔

کافی وقت ادھر ادھر ٹہلنے سے جب وہ تھک گیا تو وہیں ٹالی کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کے جیسے تکیے کی طرح سر اور گردن کو سہارا دیا۔ اور ٹالی کی گھنی لمبی شاخوں پہ نظر جما گیا۔

"خان......" شہباز کی آواز پہ وہ چونکا ضرور تھا لیکن اس نے اس آدمی کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"بولو......"

"خان...... ان لوگوں کا کچھ پتا نہیں چلا۔ محلے والوں نے بھی یہی بتایا کہ نہ تو وہ ان کے نئے گھر کے بارے میں جانتے ہیں نہ ہی اس لڑکے کے بارے میں جس سے اس لڑکی کی شادی ہوئی ہے...... لیکن خان......" بات کے آخر میں وہ ذرا رکا یوں جیسے کچھ تذبذب کا شکار ہو۔

"پوری بات بتاؤ...... شہباز!" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پہ غصے کی لکیریں گہری ہونے لگی تھیں۔

"بڑے خان نے ہم سب کو سختی سے منع کر دیا ہے خان اس لڑکی کے بارے میں کوئی بھی بات بتانے سے، انہوں نے کہا ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی بھی ایسا کرے گا تو وہ اسے مار دیں گے۔" اس آدمی کے لہجے میں خوف تھا۔ ضیا کی بھویں ذرا اوپر سکڑی تھیں۔ پھر جیسے اس نے خود کو کمپوز کیا تھا۔

"اور تم جانتے ہو اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔"

"لیکن خان......" اس کا چہرہ زرد ہونے لگا تھا۔ ضیا علی خان ان سب کی گود میں پلا بڑھا تھا۔ وہ اس کی فطرت' اس کی ایک، ایک عادت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے ضیا علی خان جو کہتا ہے وہ کر دکھاتا ہے۔ اپنی بات سے ایک قدم پیچھے ہٹنا اسے گوارا نہیں ہوتا۔

"تم گاؤں واپس جا سکتے ہو شہباز خان...... بڑے خان کو تمہاری ضرورت ہے۔" اس نے آگے بڑھ کے شہباز کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اور ہاں اپنے دوسرے آدمیوں کو بھی یہاں سے لیتے جانا۔ میں یہ کام خود کر لوں گا۔" اس نے آخر میں سخت لہجے میں کہا تھا جس کا مطلب صاف تھا اب وہ ان کو اپنے فارم ہاؤس میں مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ضیا کے وہاں سے اندر جاتے ہی اس نے سہراب خان کا نمبر ملایا تھا۔ آخری حکم بہرحال انہی کا ہوتا تھا...... دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ وہ منتظر تھا......

☆☆☆

چار بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے باہر بابا جی کا پتا کروایا۔ وہ ابھی کسی کارنر میٹنگ کے سلسلے میں کہیں باہر تھے۔ مطلب ان کے خاص کارندے بھی ان کے ساتھ تھے۔ حویلی میں وہی اکا دکا پہرے دار ہی تھے، باقی ہوتے بھی تو بیٹھک کی طرف ہوتے یا مردان خانے کی طرف۔ سو وہ بے فکری سے حویلی کے ویران حصے تک تو جا ہی سکتی تھی۔ جب تک ابراہیم اس کی مدد کو آتا تب تک وہ کافی اچھی طرح حالات کا جائزہ بھی لے سکتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وقت سے پہلے ابراہیم کے آنے سے پہلے ہی قسمت اس کا کام آسان کر دیتی۔ تب تو اور بھی اچھا تھا۔ وہ یہ بات ابراہیم کو بھی نہ بتاتی اور یہ راز، راز ہی رہتا لیکن بہرحال یہ سب سوچنے میں ضرور آسان تھا، عمل میں اسی قدر مشکل۔

وہ بڑی سی چادر میں خود کو اچھی طرح ڈھانپتی حویلی کی اندرونی راہداری سے ہوتی پچھلی طرف بارہ دری کے قریب کھلنے والی کھڑکیوں میں آ ٹھہری۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کے دور مردان خانے کی چھت کے کونے پہ بنے مورچے پہ نظر ڈالی۔ وہاں دو ہٹے کٹے آدمی گپ شپ میں مصروف تھے لیکن ان میں سے ایک کی توجہ مکمل طور پہ حویلی کے اسی ویران حصے کی طرف ہی تھی۔ یہ ویران حصہ آگے...... پرانی نہر پہ جا کے ختم ہو جاتا تھا اور اس کے دوسری طرف کیکر اور ببول کے پودوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ تبھی اس طرف سے دشمنوں کا خطرہ کم تو تھا لیکن بہرحال کوئی اس صورتِ حال کا فائدہ نہ اٹھا لے اس کے لیے خاص طور پہ یہ مورچہ بنایا گیا تھا۔ یہ واحد مورچہ تھا جو زنانہ حصے سے بھی نظر آتا تھا اور اسی کی وجہ سے وہ اکثر صرف حویلی کے تیسرے حصے میں ہی محصور رہتے تھے۔ سامنے اور اس طرف والے صحن میں جانے کی ان کو اجازت نہ تھی۔

وہ سوچوں میں غلطاں تھی۔ جب سیٹی کی تیز آواز نے اسے چونکایا۔ اس نے سر کھڑکی سے ذرا سا باہر نکال کے دیکھا۔ سیٹی کی آواز یقیناً مردان خانے کی طرف سے آئی تھی۔ مطلب چند لمحوں میں ابراہیم کو اسی مورچے پہ ہونا تھا۔ وہ احتیاطاً پیچھے ہو کر اس طرف دیکھنے لگی۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق صرف چند

لمحوں میں ابراہیم مورچے پہ چڑھتا دکھائی دیا تھا۔ سفید رنگ کے کاٹن میں اس کا خوبرو سراپا چمکتی دھوپ میں چمکنے لگا تھا۔ آستینیں فولڈ کیے اوپر آتے ہوئے وہ ان دونوں آدمیوں سے کچھ بولا تھا۔ ان کی توجہ ابراہیم کی طرف ہو چکی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی مورچے کے ساتھ لگی لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اتر گیا تھا۔ دوسرا اب مکمل طور پہ ابراہیم کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا۔ ابراہیم نے اس کی تلاش میں نظریں دوڑائی تھیں اور اس نے تیزی سے باہر آ کر خود کو ظاہر کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ابراہیم آہستگی سے یوں ہاتھ ہلا کے سر کے پیچھے لے گیا تھا جیسے بال سیٹ کر رہا ہو۔ اس کا اشارہ ملتے ہی وہ تیزی سے ویرانے کی طرف بھاگی۔ مطلوبہ جگہ تک پہنچنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔ اس جگہ پہ پہنچتے ہی اس نے تیزی سے ہاتھ مار کے گھاس پھونس ہٹائی۔ راستہ سامنے تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر تیزی سے اندر پھسل گئی۔ حیران کُن طور پہ آج اللہ لوک بالکل پُرسکون تھیں اور پوری شدت سے اس کی ہی منتظر تھیں۔ آج نہ انہوں نے کوئی عجیب لفظ بولے تھے نہ ہی چلائی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اطمینان سا ان کے چہرے پہ پھیل گیا تھا۔

''تو آ گئی...... مجھے پورا یقین تھا تو ضرور آئے گی۔''

''لیکن میں آج بس جانے کے لیے آئی ہو اللہ لوک۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں آج شہر کے لیے نکلنا ہے اور باہ جی بھی بس آنے ہی والے ہوں گے۔'' وہ تیزی سے انہیں بتانے لگی۔

''آپ نے کہا تھا مجھ سے۔ آپ نے مجھے بہت کچھ دینا ہے۔'' اس نے اس طرح ان کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا جیسے وہ واقعی اسے کچھ دینے والی تھیں۔

''لیکن تیری ہتھیلی تو بہت چھوٹی ہے اور بھار (بار...... وزن) بہت زیادہ...... تو کیسے اٹھائے گی اتنا بھار......؟'' اللہ لوک نے مایوس لہجے میں کہا۔ اوزگل نے مایوسی سے اپنے پھیلے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ جیسے واقعی اب اس کا آنا ضائع ہو جائے گا۔

''جا چلی جا...... اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے...... اس سے پہلے کہ حرص کا شیطان تجھے بھی قید کر لے۔ تنہائی اور بھوک تیرا بھی مقدر بن جائے...... بھاگ جا یہاں سے......'' انہوں نے اس کی طرف پشت کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں پھر بھی اوزگل نے ان کے گال پہ بہتے پانی کی لکیر دیکھ لی تھی۔

''لیکن اتنا تو بتا دیں اللہ لوک...اس دلہن کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ بس اتنا بتا دیں پلیز ورنہ یہ سوال مجھے چین سے نہیں رہنے دے گا۔'' اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اللہ لوک بے آواز رونے لگیں۔

''تیرے باپ کے پاس ایک رتی ڈیری (سرخ ڈائری) ہو گی۔ جا اسے ڈھونڈ لے سب جان لے گی۔ دوبارہ اِدھر نہیں آنا......'' انہوں نے سختی سے آنسو رگڑتے ہوئے اسے کہا تھا۔

''لیکن کیوں اللہ لوک؟'' وہ ان کے یوں صاف جواب دینے پہ تڑپ گئی۔

''مُردوں کو اگر انسانوں کی عادت ہو جائے ناں تو قبر تنگ پڑنے لگتی ہے۔ جا میری قبر تنگ نہ کر...... چلی جا......'' وہ منہ پھیر گئی تھیں۔ اب ان کی مکمل پشت تھی۔ وہ ان کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی......

''اللہ لوک!'' وہ بے بسی سے انہیں پکارتی رہی۔ پھر جواب نہ پا کر مجبوراً اٹھ کر باہر آ گئی۔ ہاتھوں سے اس جگہ کو دوبارہ ڈھکا اور حویلی کے حصے میں آتے ہی ابراہیم کو دیکھا۔ وہ ابھی وہیں تھا اس کا منتظر...... اس آدمی کو اس نے خوب باتوں میں لگا رکھا تھا۔ اوزگل پہ نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پہ اطمینان دوڑتا چلا گیا تھا۔ اوزگل نے ہاتھ ہلا کے اسے اشارہ کیا اور اندر آ گئی۔ ہر چیز سے اس کا دل سخت اچاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے باہ جی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ اسے اب ہر حال میں وہ سرخ ڈائری ڈھونڈنی تھی......

☆☆☆

''میرے ہر اک کل ہر اک لمحے میں......
تو لکھ دے میرا اسے......
ہر کہانی میں،
سارے قصوں میں......
دل کی دنیا کے......
سچے رشتوں میں......
زندگانی کے......
سارے حصوں میں......
تو لکھ دے میرا اسے......
اے خدا...... اے خدا......
جب بنا اس کا ہی بنا......''

بارش جس قدر تیز ہوتی جا رہی تھی اس کے اندر کی گھٹن مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے تیز ہوا اور بارش کی پروا نہ کرتے ہوئے سارے شیشے گرا دیے تھے۔ ہوا پہلے ہی جھونکے میں اس کے بال بکھیر گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سختی سے سینے کو مسلا تھا۔ پھر شرٹ کے اوپر کے دو تین بٹن اسی ہاتھ سے کھول لیے تھے۔ سانس لینے میں آسانی ہوئی تھی لیکن درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے میوزک اور تیز کر دیا......

''اے خدا...... اے خدا......
جب بنا اس کا ہی بنا......
ہر اک لمحے میں
ہر اک پتے پہ......
تو لکھ دے میرا اسے......
اے خدا...... اے خدا......''

سب کچھ اس کے خلاف تھا۔ رب گواہ تھا۔ اس کا رواں رواں اس کا طلب گار تھا۔ وہ اس سے نفرت کا دعوے دار اس کی عزت کا دشمن کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ نہ سکا اس کی عزت اسے عزیز تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ بس چھوٹا سا تماشا ہو گا۔ اس کے باپ کا سالوں سے انتقام میں جلتا دل کچھ ٹھنڈک پائے گا، وہ چپ چاپ اسے گھر چھوڑ آئے گا اور اس کے اور لالہ کے راستے ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے۔ بات ختم ہو جائے گی لیکن...... لیکن بات ختم کہاں ہوئی تھی بات تو جیسے ابھی شروع ہوئی تھی۔ سب کچھ پلٹ گیا تھا۔

اس کے باپ کا دل بھلے سکون پا گیا تھا لیکن اس نے سکھ چین سب کھو دیا تھا۔ وہ کٹورا آنکھیں اور اس کے مضبوط ہاتھوں میں قید...... نرم کومل ہاتھ...... اس کے وجود سے لپٹ کے رہ گئے تھے۔

اس کا وجود فنا ہو گیا......
اور لالہ جیسے اس کی نس، نس میں سما گئی تھی......
وہ کہیں نہیں رہا تھا......

وہ تو انتقام کی جلتی بجھتی چنگاری کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کرنے چلا تھا۔ اور...... اس کا خود کا تن من جل کے سوا (راکھ) ہو گیا تھا۔

انتقام کی چنگاری نے نہ جانے کب بھڑکتے ہوئے عشق کے شعلے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کبھی کسی سے نہ ہارنے والا ضیا علی خان۔

''اس کا، اس میں ہوں، اسے ہوں اسی کا رہنے دے......
میں تو پیاسا ہوں ہے دریا وہ ذریعہ وہ جینے کا میرے
دل مجھے دے اگر
درد دے اس کا پر
اس کی وہ ہو ہنسی
گونجے جو میرا گھر......
اے خدا...... اے خدا
جب بنا اس کا ہی بنا......''

اسے لگا درد سے اس کا دل پھٹ جائے گا...... اس نے گیت بدل دیا تھا اور گاڑی روک کے باہر نکل آیا تھا......

''یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا''

بارش اسے بری طرح بھگونے لگی تھی۔ نئے موسم کی کھلتی سردی بھی اس کے اندر کی تپش نہیں کم کر پا رہی تھی۔

''کہیں وہ بادشاہ تخت نشیں
کہیں کاسہ لیے گدا دیکھا......

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا......"
سفید پاکیزہ آنچل تھا جو اس کے دل کو اپنے ساتھ لپیٹے اڑا تھا۔
تخیل کامل ہونے لگا تھا......
درد بڑھنے لگا تھا......
دونوں ہاتھ بالوں میں پھنساتے ہوئے وہ درد سے چلاتا زمین پہ بیٹھتا چلا گیا۔ بارش اور تیز ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو بھی......

☆☆☆

یہ کمرا اس حویلی کا سب سے بڑا کمرا تھا۔ پہلے تین اطراف کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ اور درمیان میں چھوٹا سا لان جس کے اوپر درمیان سے کھلی چھت تھی......
لیکن اب یہ سارا حصہ ایک بڑے لاؤنج کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ دو کمروں کو یکجا کر کے، باء جی کا یہ کمرا بنایا گیا تھا اور اس کی ہر چیز بہترین تھی۔ پردوں سے لے کر نفیس سے شو پیس تک امپورٹڈ تھے۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کھڑکی کھول دی تھی۔ یہ کھڑکی گیراج کی طرف کھلتی تھی۔ اس طرح باء جی جیسے ہی گھر آتے اسے فوراً پتا چل جاتا اور وہ آرام سے نکل سکتی تھی۔
یہاں سے بے فکر ہو کے اس نے دھیان سے سب جگہیں دیکھنا شروع کر دی تھیں۔ احتیاط سے ساری الماریاں، دراز... چیک کرنے کے باوجود وہ ناکام رہی تھی۔
"ایسا کیا ہوگا اس ڈائری میں۔" وہ سوچتی رہی۔
مایوس سی ہونے لگی تھی جب یونہی اس کی نظر باء جی کی کونے میں رکھی اس میز پہ پڑی جس پہ ان کی زمینوں کے سارے کھاتا جات پڑے رہتے تھے۔ وہ تیزی سے اس طرف آئی اور عین اسی وقت ہی حویلی کا آہنی گیٹ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ وہ کانپ سی گئی۔ اس نے تیزی سے کھڑکی بند کی۔ گاڑی کے انجن کا شور اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھا گیا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی اور بالکل اچانک ہی میز کے کونے پہ پڑی بہت گہرے سرخ رنگ کی ڈائری نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔ اس کا رنگ بے حد عجیب تھا۔ بہت ہی عجیب سرخ......
"یہی ہے......؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ پھر تیزی سے اسے اٹھایا اور دوپٹے میں چھپاتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

آج صبح، صبح ہی باریال اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ کچھ دیر یونہی گاڑی سڑکوں پہ گھمانے کے بعد وہ شہر سے کافی دور ایک قبرستان کی طرف نکل آئے۔ باریال نے گاڑی روکی تو اسے حیرت سی ہوئی۔
وہ نیچے اتر کر اس کی طرف آیا تھا۔
"لالہ باہر آ جاؤ۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے پکارا تھا۔
"یہاں...... یہاں کیوں؟" نہ جانے کیوں اس کا دل ڈوب سا گیا تھا۔
"باہر تو آؤ یار...... بتاتا ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ لالہ نے کچھ سوچتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور گاڑی سے اتر آئی۔ دل اور شور مچانے لگا تھا۔ وہ خود اپنی کیفیت نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ باریال کی ذرا سی توجہ اسے جس قدر خوشی دیتی تھی۔ آج اس خوشی کا احساس مکمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا جو اس خوشی پہ درد کو حاوی کر رہا تھا۔
"ولی بتائیں پلیز......؟" خار دار جھاڑیوں سے خود کو بچاتی وہ اس کا ہاتھ تھامے اس کے پیچھے پیچھے چلتی بار، بار اسے پکار رہی تھی۔ لیکن باریال مسلسل اسے جیسے اگنور کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کا ہاتھ تھامے احتیاط سے اسے آگے بڑھا رہا تھا۔
ایک جگہ پہ آ کے اس نے دھیرے سے لالہ کا ہاتھ چھوڑا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ لالہ اس کے پیچھے بڑھنے کے ساتھ، ساتھ اردگرد کا حیران سا جائزہ بھی لے رہی تھی۔
یہ جگہ قدرے کھلی تھی۔ برگد کا گھنا درخت دور، دور تک چھایا گرائے غرور سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔
تھوڑی دور جا کر باریال رک گیا تھا۔ لالہ اب بھی اردگرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔
"ادھر آؤ لالہ......" اس نے لالہ کا بازو تھامتے ہوئے اسے نرمی سے آگے کیا تھا۔ یہ کچی تازہ قبر تھی۔ جس پر پانی سے تازہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا اور اس پر بکھرے تر و تازہ گلاب کی پتیوں کی مہک ساری فضا کو معطر کر رہی تھی۔ لالہ کا دل بے اختیار سا ہوا تھی۔
"یہ سب کیا ہے ولی؟" وہ پریشان سی اس کے ساتھ جا لگی تھی۔ باریال نے نرمی سے اس کے کندھے کے گرد اپنا بازو پھیلایا اور پھر اسے اس قبر کے قریب لے آیا......
"لالہ......" اس کا ہاتھ تھامے وہ نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اسے بھی ساتھ بیٹھنے پہ مجبور کر گیا تھا۔
"دادو......" اس کے اگلے لفظ پہ لالہ نے بہت بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر بے یقینی تھی کہ باریال نظریں نہ ملا سکا تھا۔
"دادو اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔" اس نے بہت مشکل سے جملہ مکمل کیا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھی لالہ بے اختیار ہی زمین پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ ہاتھ پہ مضبوط گرفت اور سخت ہوئی تھی۔
"دادو......" اس کا لہجہ درد سے پُر تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اس کچی گیلی قبر پہ جمائے اور جیسے اس کی مٹی کو محسوس کر کے یقین کیا کہ وہ واقعی دادو کی قبر ہے؟ وہ پھوٹ، پھوٹ کے رو دی تھی۔ باریال نے اسے خود میں سمو لیا تھا۔ اس کا نازک سراپا کپکپا رہا تھا۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ باریال نے اسے روکا نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا وہ دل بھر کے رو لے سارا درد، سارا غبار نکل جائے۔ آنسو من کا میل اتار لیتے ہیں۔ ہر بوجھ دھو ڈالتے ہیں۔ روح تک شفاف ہو جاتی ہے۔ اس نے بھی لالہ کو رونے دیا تھا...... اسے چپ کرانے کی کوشش نہ کی تھی۔

☆☆☆

"شاویز ایسا کیسے کر سکتا ہے حد ہوتی ہے خود غرضی کی بھی۔"
جب سے باریال نے انہیں بتایا تھا کہ دادو کی ڈیتھ ان کی شادی کے تیسرے دن ہی ہو گئی تھی اور شاویز نے اسے اور لالہ کو اطلاع دینا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ مسلسل شاویز کو سنائے جا رہی تھیں۔ باریال نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ گھر بھی چھوڑ کے جا چکے ہیں کہاں......؟ یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔
"اسے لالہ سے واقعی جان چھڑانا تھی سو وہ چلا گیا۔" باریال نے تاسف بھرے لہجے میں کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں لالہ سو رہی تھی۔ ویسے بھی اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی اوپر سے اس طرح کی بات کا ایک دم سے سامنے آ جانا...... اسے بری طرح توڑ گیا تھا۔ دادو میں اس کی جان بستی تھی اور وہ اتنی بدنصیب کہ ان کے آخری دیدار سے بھی محروم ہو گئی تھی۔
"لالہ تو سنبھل ہی جائے گی۔ وقت مرہم رکھ دیتا ہے زخموں پہ لیکن شاویز...... اسے اللہ پاک کبھی معاف نہیں کرے گا۔ دیکھ لینا تم۔" وہ غصے سے بولیں۔
"اچھا آپ تو اتنا اسٹریس نہ لیں۔" وہ اٹھ کر ان کے شانوں کے گرد بازو پھیلا گیا۔
"کیسے نہ لوں۔ ساری عمر اب لالہ بیچاری کو صبر مشکل ہو جائے گا۔ اللہ پاک نہ جانے اس پھول سی لڑکی کی یہ آزمائشیں کب ختم کرے گا۔" وہ فکرمند تھیں۔ باریال مسکرا دیا۔
"آپ ہیں ناں لالہ کے ساتھ...... انشاء اللہ جلدی سنبھل جائے گی۔" اس کے لہجے میں ماں کے لیے غرور تھا۔
"انشاء اللہ!" انہوں نے سادہ لیکن پُر یقین لہجے میں کہا۔

☆☆☆

گل مینہ کے کالج جانے کے بعد اس نے احتیاط سے دروازہ لاک کیا اور اپنے بیڈ پہ آ گئی۔ اپنی طرف والی سائڈ ٹیبل کے پہلے دراز کا لاک کھول کر اس نے وہ سرخ ڈائری نکال لی جو اس نے باء جی کی میز سے اٹھائی تھی۔ یہ کسی بھی طرح کی ڈائری ہو سکتی تھی۔
شاید زمینوں کا کھاتا......
الیکشن کا حساب کتاب......

یا پھر شاید واقعی اپنے سینے میں چھپائے بہت سے راز۔
اس ڈائری کا رنگ بہت عجیب سرخ تھا۔ جیسے خون سے اسے رنگا گیا ہو۔

"یا اللہ پاک میری مدد فرما۔ میں جاننا چاہتی ہوں آخر کیا ہے جو اتنا واضح ہونے کے باوجود بھی نظروں سے اوجھل ہے۔ بے شک تو مددگار ہے۔" اس نے آنکھیں بند کر کے دعا کی تھی۔ پھر کچھ دیر یوں ہی آنکھیں بند کیے درود پاک کا ورد کیا اور دھیرے، دھیرے آنکھیں کھول دیں۔

لرزتے ہاتھوں سے اس نے وہ ڈائری کھولی تھی۔ پہلے چند صفحات زمینوں کے حساب کتاب سے بھرے ہوئے تھے۔ جن میں مختلف علاقوں میں زمین کے تمام رقبوں کی تفصیلات تھیں اور ان کی مالیت وغیرہ کا حساب کتاب......

اس نے جو سوچ کے یہ ڈائری اٹھائی تھی ویسا کچھ نہ تھا۔ کیا اس نے غلط ڈائری اٹھائی تھی؟ وہ بددلی سے صفحات پلٹنے لگی۔ تبھی اس کی نظر ایک سرخ رنگ کے مارکر سے لکھی عبارت پہ جمی تھی۔

"پہلا خون۔"

اس کا جسم کانپ سا گیا۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے اس صفحے کو دو انگلیوں میں تھاما تھا اور پھر ڈرتے، ڈرتے صفحہ الٹ دیا تھا......

اس نے غلط ڈائری نہیں اٹھائی تھی۔

وہ وہی سرخ ڈائری تھی جس کے بارے میں اللہ لوک نے بتایا تھا۔

داستان شروع ہوئی تھی......

"لال حویلی دلہن کی طرح سجائی گئی تھی۔ زریاب ولی خان کے خاندان میں پہلی لڑکی کی شادی تھی۔ ایک روایت ٹوٹنے جا رہی تھی۔ نگین پہلی لڑکی تھی جو برادری سے باہر خوشیاں تلاشنے جا رہی تھی اور اسی لیے زریاب لالا نے اس کی شادمانی میں کوئی کسر نہیں رہنے دی تھی۔ آج ہر آنکھ رشک سے دیکھ رہی تھی لال حویلی کو۔ زریاب ولی خان ویسے بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اللہ پاک نے انہیں اچھی شخصیت کے ساتھ بلند کردار و اخلاق سے بھی نوازا تھا۔ تبھی وہ اپنے علاقے کے ہر دلعزیز سردار مانے جاتے تھے۔

بارات آچکی تھی۔ ہر طرف شور و غل سا مچ گیا تھا۔ بارات میں شامل دولہا کے دوستوں نے نکاح کے فوراً بعد ہوائی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اوپر سے لڑکیوں کا ہلا گلا...... نگین کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے مہندی سے سجے خوبصورت ہاتھ کانوں پہ رکھ لیے۔ پھر بھی آواز کم نہ ہوئی۔ سامنے ہی گلابی فراک پہنے سین جھوم جھوم کے ناچے جا رہی تھی سہیلیوں کے نرغے میں...... اس نے محبت بھری نگاہ بہن پہ ڈالی تھی اور...... بالکل غیر ارادی طور پہ اس کی نگاہ سامنے چھت کے دور ویران کونے پہ پڑی تھی۔ اس طرف گرل لگنی تھی لیکن ابھی یہ کام ملتوی تھا۔ اسے وہاں ہیولا سا دکھائی دیا۔ اس نے غور کیا۔ وہ واقعی کوئی آدمی تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں تھی وہ گن نال......

"کیا بدرکہ ہے کوئی؟" اس نے حیرت سے سوچا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرف کسی بھی مرد کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہ تو بالکل سامنے کونے پہ اس قدر اونچائی سے سب صاف دیکھ سکتا تھا۔

"پھر یہ کون......؟" وہ سوچے گئی۔ فائرنگ کی آواز تیز ہوئی تھی۔

"اس شادی کو یادگار بنا دو۔ لوگ صدیوں تک لال حویلی کی اس شادی کو نہ بھول پائیں۔" باتیں وہی تھیں لیکن سہراب علی خان کا لہجہ اور انداز بالکل اب کی بار نیا تھا۔ مطلب جو اس نے سنا تھا وہ سچ تھا لیکن جو اس نے اس وقت خوشی کے عالم میں سمجھا تھا وہ غلط تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور بھاری گھنگھرا سنبھالتی تیزی سے اس طرف بھاگی تھی...... تبھی سامنے ناچتی لڑکیوں سے بری طرح ٹکرا گئی۔

"نگی......" سین تیزی سے اس کی طرف آئی تھی۔

"کیا ہوا آپ کو نگی...... آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"وہ...... وہ عیسیٰ...... سین...... وہ عیسیٰ کو مار دے گا......" وہ تڑپی۔

"کون...... کون مار دے گا......؟" سین کا دل ڈوب کے ابھرا۔

"لالا...... سہراب لالا......"

"توبہ کریں نگی کیا کہہ رہی ہیں۔"

تبھی فائرنگ کی تیز آواز میں ایک چیخ سی گونجی تھی۔ بہن کے بازو تھامتی، تڑپتی نگی کے ہاتھ ایک دم سے پتھر کے ہوئے تھے۔ اور وہ کسی لاش کی طرح...... بے دم ہوتی زمین پہ گرتی چلی گئی تھی۔

"دولہے کو گولی لگ گئی ہے۔" تھوڑی ہی دیر میں طوفان سا اٹھا تھا۔

"ہوائی فائر لگ گیا بیچارے کو۔" خوشی پہ ایک دم ترس، افسوس اور دکھ کا ماحول غالب آنے لگا تھا۔ سین نے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے نگین کو دیکھا تھا۔ جواب چلاتے ہوئے اپنا ہی بدن، اپنے ہی زیور نوچ رہی تھی۔"

☆☆☆

وہ ابھی فجر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوا تھا جب دروازے پہ ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔

"اس وقت......؟ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟"

وہ حیران سا وقت دیکھتا دروازے کی طرف آیا۔ دروازہ دوسری بار بجایا گیا تھا اور اس بار دستک کافی تیز بھی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑے فرد کو دیکھ کر اس کی حیرت دوچند ہوئی۔

"تم...... اس وقت؟" وہ اپنی حیرت چھپا نہیں سکا نہ ہی اس نے کوئی کوشش کی تھی چھپانے کی۔ امن منہ بناتے ہوئے اسے ایک طرف تقریباً دھکیلتی اندر آ گئی۔

"جب آؤ تو نواب زادے ملتے ہی نہیں۔ سوچا اس وقت تو لازمی گھیر لوں گی۔" وہ بے فکری سے ڈائننگ ٹیبل کی طرف آ گئی اور بے تکلفی سے ایک کرسی سنبھال لی۔

"ہاں تو نیا نیا بزنس ہے۔ تم جانتی ہو اچھی طرح میرا کیا aim ہے۔"

"کم آن یاری...... ہاں تو کسی بھی مقصد کا مطلب یہ تو نہیں کہ بندہ اپنے دوسرے فرائض بھول ہی جائے۔" اس نے سامنے پڑی باسکٹ سے ایک سیب اٹھایا۔

"مثلاً کون سا فرض بھول گیا۔" وہ اب آستینیں فولڈ کرتا اوپن کچن کی طرف آ گیا۔

"تمہیں ہر بار یاد دلانا پڑے گا۔ ایک گھر ہے تمہارا...... ایک ماں جو سارا دن اکیلی ہوتی ہے...... اور......" وہ اسے گنوا رہی تھی۔

"اور......؟" وہ اب چائے بنا رہا تھا۔

"اور ایک عدد لڑکی بھی ہے جو جلد یا بدیر تمہارے فرائض میں آنے ہی والی ہے۔" اس نے باریال پہ بغور نظریں جماتے ہوئے آخری بات کہی تھی۔ باریال کے چلتے ہاتھ ایک پل کے لیے رکے۔

"تمہیں نہیں لگتا وہ لڑکی زبردستی اپنی ذمے داری اس بیچارے پہ ڈال رہی ہے۔" اس نے امن کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"بالکل نہیں...... میں خوابوں پہ یقین رکھنے والی لڑکی ہوں۔" اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"یک طرفہ خواب جب ٹوٹتے ہیں تو انسان کو بھی توڑ دیتے ہیں۔ سو ان خوابوں سے خود کو آزاد ہی رکھو تو بہتر ہے۔" چائے نکالتے ہوئے اس نے امن کو جیسے سمجھایا تھا۔

"تو اشو کیا ہے۔ تم بھی تو سنگل ہی ہو۔ جتنا میں تمہیں جانتی ہوں تم کسی کے ساتھ کمیٹڈ نہیں ہو...... تو پھر میں کیوں نہیں؟" وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئی تھی......

"ولی...... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ مجھے جگا دیا ہوتا۔" لالہ بالکل اچانک وہاں آئی تھی۔ امن اس کی آواز پہ یوں جھٹکا کھا کے مڑی تھی جیسے کرنٹ دولٹ کا جھٹکا لگا ہو۔

"تم آرام کرو۔ میں عادی ہوں، بنا لیتا ہوں کبھی کبھی۔ تمہارے لیے بھی لا رہا تھا۔" اسے دیکھتے ہی باریال کے چہرے پہ کھلتی مسکراہٹ امن کا دل دھڑکا گئی تھی۔

"یہ کون ہے یاری؟" وہ خود پہ ضبط کھوتے

کچھ قصے ایسے بھی ہیں

میری سسٹر کی شدت سے خواہش تھی کہ اسکول ٹیچر بنے...... تو اسکول ٹیچر بننے کے لیے یہ تو سنا تھا پڑھنا لازمی شرط ہے...... مگر یہ نہیں پتا تھا کہ خالی، خولی پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا، دماغ چاہے خالی ہی کیوں نہ ہو جیب لازمی بھاری ہونی چاہیے کہ آج کے دور میں دماغ نہیں...... جیب کو جانچا جاتا ہے۔ جتنی بھاری جیب اتنا ہی کامیاب انسان......

تو میں بات کر رہی تھی اپنی سسٹر کی... بہت سال لگے اس بیچاری کو خالی جیب کے ساتھ دماغ بھاری کرتے ہوئے...... اور جونہی اس کا دماغ خالی اور جیب بھاری ہوئی۔

”تو اس نے اپنا اسکول بنالیا...... اس کے اسکول ٹیچر بننے کے ارمان تو پورے ہوگئے مگر اس کے ساتھ ہی اسے یہ سبق ملا کہ اس دور میں زیادہ پڑھنا شرط نہیں بس پیسہ ہونا شرط ہے۔ پھر چاہے اسکول بناؤ یا اسپتال...... میری ایک جاننے والی ہیں، ایک دن ان کے ہاں جانا ہوا تو اس نے چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا لڈو اپنے ہاتھ سے اٹھا کر میرے منہ میں ڈالا کہ ”لو منہ میٹھا کرو خیر سے تمہاری بہن ڈاکٹر بن گئی ہے۔“

”کیا......؟“ یہ سنتے ہی وہ لڈو جو آدھا میرے منہ کے اندر تھا باہر آنے کو بے تاب ہوگیا۔

اتنی نالائق لڑکی اور ڈاکٹر مگر کیسے......؟ میں صرف سوچ ہی سکی کہہ کچھ نہیں سکی کہ میری سوچ کی پرواز ان کے وسیع و عریض لاؤنج جہاں میں اس وقت بیٹھی ہوئی تھی...... وہیں چکرانے لگی کہ آخر کو اتنا پیسہ خرچ کیا تھا تو اس کا نتیجہ تو ملنا تھا ناں...... پیسہ پھینک تماشا دیکھ والا حساب یہاں بھی ہوا ہوگا اور میرٹ پر آنے والے بچے کم سیٹوں کے باعث حسرت سے دیکھتے رہ گئے۔

کبھی ہمارے بھی بہت بلند عزائم و سنہرے خواب تھے جو ٹوٹے تو ان کی کرچیوں کو سمیٹتے ہمارا وجود زخموں سے چھلنی ہوگیا اور آج جب ہم اپنے خوابوں کی سرزمین پر قدم دھرتے ہیں تو سوچتے ہیں ہم بھی کتنے پاگل ناداں تھے۔ جو اتنا عرصہ بیکار گزار دیا...... ڈاکٹر بننا کون سا مشکل کام ہے، ٹیچر بننا کون سا مشکل کام ہے...... آنکھیں ہی تو بند کرنی ہوں گی ذرا سی محنت ہی تو کرنی ہوگی...... پھر چاہے ڈاکٹر بنو یا ٹیچر......

ہم تو اکثر آنکھیں بند کیے اپنی تمام تر تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کر لیتے ہیں۔

تحریر: نرگس نسیم، صاحبہ موہڑہ

ہوئے لب کچلتے بولی تھی۔ لالہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ فوراً سلام کیا جسے اس نے کوئی لفٹ نہیں کروائی تھی۔

”کیا ہوگیا......؟“ باریال اسے ایک دم ہارش ہوتا دیکھ کے حیران سا اس کی طرف پلٹا۔

”میری بات کا جواب دو باری...... یہ کون ہے اور تمہیں ولی کیوں کہہ رہی ہے۔ یہ کیا ڈراما ہے؟“

”ڈونٹ بی ہارش امن...... میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں اور یہ بات میں تمہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں۔“

”اوہ...... واہ...... میرے لیے تو اتنے سخت رولز اور خود گھر میں ایک خوب صورت نوجوان لڑکی کے ساتھ موجود ہیں موصوف تو کوئی بڑی بات نہیں اور یہ دیدے کہاں ہیں۔ ضرور گھر پہ نہیں ہوں گی تبھی اس غلیظ لڑکی نے تمہیں مائل کر لیا اپنی طرف......“

”امن......“ باریال دہاڑا تھا۔ کمزور سی لالہ کانپ کے پیچھے سلیب کے ساتھ جا لگی تھی۔ امن البتہ اب بھی ویسے ہی تن کے کھڑی تھی۔

”یہ میری بیوی ہے اور اب اگر اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا ناں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ شہادت کی انگلی سے اسے وارن کرتا اس نے لالہ کی کمر کے گرد بازو پھیلایا تھا۔ ذات کی پستی میں گرتی لالہ کو

روح تک میں سکون اتر گیا تھا۔

”تم...... تم...... ڈیڈ سچ کہتے ہیں۔ تم لوگ ہوتے ہی غلاظت کا ڈھیر ہو۔ اپنے جیسوں کو ہی پسند کر سکتے ہو۔“

”شٹ اپ امن...... جسٹ شٹ اپ......“ باریال غصے سے اس کی طرف بڑھا۔

”میں تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑوں گی باری...... تم بہت پچھتاؤ گے...... بہت زیادہ۔“ امن کا بس نہیں چل رہا تھا۔ سامنے کھڑی لالہ کا خون چوس لے۔

”تم جانتی ہو امن، باریال اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ سو جاؤ جو دل کرے کرلو لیکن ناؤ گیٹ لاسٹ پلیز۔“ لالہ کو آرام سے ٹیبل کے ساتھ والی چیئر پہ بٹھاتے ہوئے وہ اس بار خاصی بے مروتی سے امن سے مخاطب تھا۔ امن نے ایک زہریلی نگاہ اس کپل پہ ڈالی اور پرس اٹھاتی باہر نکل گئی۔ باریال نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

”لمحوں میں جیسے زندگی اپنے معنی کھو بیٹھی تھی۔ روشنیوں سے جگمگاتی لال حویلی بخت کی سیاہی میں ڈوبتی چلی گئی۔ شادیانوں کی آواز ایک دم ہی سسکیوں اور آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ بارات کے ساتھ آنے والی

نگین...... اس کی تو حالت اور خراب تھی۔ وہ تو اپنے حواس کھو بیٹھی تھی...... اس نے نوچ، نوچ کے اپنے سارے گہنے اتار پھینکے تھے۔ بالوں میں پن ہوا زرتار دوپٹا دور اچھال دیا تھا۔

سبین اسے خود میں سمو کے سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ زریاب لالا فوراً اس کے پاس آئے تھے۔ ان کا اپنا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”نگی...... میرے بچے۔“ انہوں نے بہن کو اپنی مضبوط پناہ میں لیتے ہوئے اسے پکارا۔ نگین نے چونک کر بھائی کو دیکھا۔

”لالا...... لالا سہراب لالا نے...... میں نے خود دیکھا انہوں نے......“ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتاتی ان کی آغوش میں آنکھیں موند گئی۔ زریاب اس کی بات نہیں سمجھ پائے۔ تبھی اسے اٹھا کر اندر لے آئے تھے۔ باہر کا شور شرابا اسے مزید نقصان دے سکتا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ عیسٰی کی طرح وہ اپنی بہن کو بھی کھو دیں۔

”یہ سب کیا ہوگیا لالا......؟“ وہ اسے بیڈ پہ لٹا کے مڑے ہی تھے جب سبین اندر آئی تھی۔

جائے گی۔ لیکن سہراب اور عیسٰی کے دوست...... اتنی چھوٹی سی غلطی کا کتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا ہم سب کو۔“ وہ پریشان سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”لیکن ابھی تو وہ کچھ اور کہہ رہی تھیں۔“ وہ کھوئے، کھوئے لہجے میں بولی۔

”کیا بول رہی تھی۔“ زریاب چونکے۔

”نہیں...... کچھ نہیں...... بعد میں بات کروں گی ابھی آپ جائیں باہر آپ کی ضرورت ہے۔“ اس نے فوراً خود پہ قابو پاتے ہوئے بات سنبھالی تھی۔

”تم اس کے ساتھ رہنا۔ میں کوشش کرتا ہوں صبح تک کسی اچھے ڈاکٹر کا بندوبست ہو سکے۔ اس کا یوں پریشان رہنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“ زریاب نے اسے ہدایت کی۔

”جی لالا......“ سبین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ باہر نکل گئے۔ سبین کے چہرے پہ گہری سوچ کی لکیریں گہری تھیں۔ وہ مسلسل نگی کے سہراب لالا پہ شک کو سوچے جا رہی تھی۔ آخر اس نے کیا دیکھا یا سنا تھا اور آخر سہراب لالا ایسا کریں گے ہی کیوں......؟ لیکن فی الحال اس کے پاس انتظار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ ٹھنڈی سی سانس بھر کے بہن کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ باہر رونے کی آوازوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔“

☆☆☆

سردیوں کی پہلی بارش اس بار اس کے لیے کسی بھی طرح کے جوش سے خالی تھی۔ وہ جو بارش ہوتے ہی سردی کی پروا کیے بنا ہی گھنٹوں بارش میں بھیگا کرتی آج اتنی تیز بارش میں کھڑکی کھولے بہت بددلی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ باریال کمرے میں آیا تو اسے یوں دور سے بارش میں گم دیکھ کر مسکرا دیا۔

"لگتا ہے تمہیں عام لڑکیوں کی طرح بارش سے عشق نہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی اونی شال کندھوں سے اتار کر آہستگی سے اسے اوڑھا دی۔ مضبوط سا حصار سا بندھا تھا لالہ کے گرد اس نے چادر کے کونوں کو مضبوطی سے تھام لیا......

"عشق...... جہاں پلیدگی پھیل جائے وہاں سے عشق منہ پھیر لیتا ہے ولی۔"

"عشق ہی بندگی کی طرف موڑ بھی لیتا ہے لالہ...... اور خطائے عشق بھی، کبھی عشق کی پہلی سیڑھی بھی ثابت ہوئی ہے۔" وہ اس کے برابر آ ٹھہرا تھا۔

"شاید...... لیکن مجھے اب کوئی تمنا نہیں رہی۔ اپنے اس بدبودار وجود سے کسی کی بھی زندگی سجانے کی۔"

"مطلب تم مجھے چھوڑنے کا سوچ رہی ہو......؟"

وہ اس کی طرف منہ کرتا کھڑکی سے ٹیک لگا گیا۔ لالہ نے اس کی طرف دیکھا۔ خوب صورت گہری نیلی آنکھیں اس پہ جمی تھیں۔ ان میں مسکراہٹ تھی...... بے حد اجلی...... بے حد شفاف مسکراہٹ...... وہ نظریں ہٹا نہ سکی۔

"اگر ایسا کوئی خیال ہے بھی تمہارا تو سوری...... اسے بھول جاؤ کیونکہ میں نے تمہیں اپنا دوست مانا ہے اور میں اپنے دوستوں کو کبھی نہیں چھوڑتا۔" باریال کی آنکھوں کے ساتھ لب بھی مسکرا دیے تھے۔

"صبح، وہ لڑکی کون تھی؟" لالہ نے اچانک سوال کیا۔

باریال اس سوال پہ اسے توجہ سے دیکھنے لگا۔

"دوست ہے میری...... اسن...... تمہیں پہلے بھی بتایا تھا بزنس میں ساتھ ہے میرے۔" نہ جانے کیوں وہ وضاحت دینے لگا تھا۔

"آپ نے اسے بھی تو چھوڑ دیا...... میرے لیے...... تو بس مجھے بھی چھوڑ دینا آپ اس کے لیے۔"

وہ دھیرے سے اس کی شال اتارتی بیڈ پہ رکھتے ہوئے بولی۔ باریال کچھ دیر اس خفا، خفا لڑکی کو دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے، دھیرے چلتا اس کے پاس آ گیا۔

"اس لڑکی کو جانتی ہو؟" اس نے ایک پاؤں زمین پہ رکھتے ہوئے دوسرے گھٹنے کے بل اس کے سامنے زمین پہ بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے بارے میں ویسی ہی کوئی غلط بات کرو گی ناں تو تمہیں بھی چھوڑ ہی دوں گا...... کیونکہ......"

لالہ کی گھنی پلکیں لرزتی اٹھیں......

"یہ...... یہ میری بیوی بھی ہے...... صرف دوست نہیں ہے۔" اس نے لب اس کے ہاتھ پہ دھر دیے تھے۔ لالہ کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ باریال نے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے خود سے لگا لیا تھا۔

"وقت سب ٹھیک کر دے گا لالہ...... میرا اعتبار کرو۔" اس کی آواز میں یقین تھا۔ لالہ اس کے سینے میں سر چھپا کے سسک اٹھی تھی۔ بارش بھی شور مچانے لگی تھی۔

☆☆☆

باوجی کے خاندان سے مکمل مایوس ہونے کے بعد اس نے لالہ کا پتا کرنے کا کام شاہد، زید اور ابراہیم کو سونپا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ زید اور شاہد پھر بھی کام سے جان بچانے والوں میں سے تھے لیکن ابراہیم...... کسی بھی طرح اس کا پتا چلا لیتا اور دوسرے کسی بھی طرح وہ ضیا کی کوئی بات سہراب خان یا اس کے کسی بھی کارندے تک نہیں پہنچنے دیتا۔ ابراہیم حیات دنیا میں وہ واحد آدمی تھا جس پہ ضیا آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا تھا۔ تبھی تھک ہار کر اس نے یہ سب ابراہیم کے ذمے لگایا تھا اور خود بھی ہر جگہ پتا کر رہا تھا۔

ابراہیم نے سب سے پہلے لالہ کے محلے والوں سے رابطہ کیا تھا۔ اور ان سے شاویز کے حوالے سے بات کی تھی۔ وہاں سے اسے اتنی معلومات ملیں کہ اپنے کسی دوست سے ہی شاویز کی بہن کی شادی طے ہوئی تھی...... اب اسے شاویز کے دوستوں کا پتا کرنا تھا۔ یہ اس کے لیے اتنا مشکل نہیں تھا۔ محلے کے کئی لڑکے اس کے کلاس فیلوز رہے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی وہ شخص نہیں تھا جو لالہ کا نصیب بنا تھا لیکن انہی میں سے ایک شخص نے بتایا تھا کہ وہ ان ہی کا کلاس فیلو تھا اور اب اپنا بزنس چلا رہا تھا۔ اس کا پتا ملتے ہی ابراہیم پہلے خود اس کے گھر پہنچا تھا۔ دروازہ اس کی ماں نے کھولا تھا۔ وہ آفس کے لیے نکل چکا تھا۔ تب ابراہیم نے اس کے آفس کا رخ کیا تھا اور باریال کو دیکھتے ہی اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا تھا۔ اس نے واپس آ کر ضیا کو بھی تسلی دی تھی......

"لالہ اپنی زندگی میں واپس لوٹ چکی ہے۔ ایک مکمل زندگی جی رہی ہے اب تم بھی پُرسکون ہو جاؤ......" ابراہیم، لالہ کے لیے خوش تھا۔

"تم پاگل ہو......؟" وہ جو لالہ کے بارے میں سن کر ہی بہت دل سے تیار ہونے میں لگا تھا۔ طائرانہ نگاہ آئینے پہ ڈالتے ہوئے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا جو ابراہیم کو چونکا گیا تھا۔

"مطلب......؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا......

"مطلب صاف ہے میرے بھائی......" وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف پلٹا......

"لالہ کی زندگی صرف ضیا ہی مکمل کر سکتا ہے اور کوئی نہیں......" اس کے کندھے کو دباتا وہ سیٹی بجاتا باہر نکل گیا تھا۔ ابراہیم کو احساس ہوا اس نے ایک بار پھر غلطی کر دی تھی......

☆☆☆

"سب کچھ ویسا ہی ہوا تھا جیسا انہوں نے پلان کیا تھا۔ وہ لاکھ اس خاندان کا فرد سہی پھر بھی اختیارات سارے ابھی زریاب لالا کے پاس تھے۔ آخری فیصلہ انہی کا ہوتا تھا۔ وہ اور زریاب ایک ہی خاندان کے تھے۔ اور ان کے خاندان میں برادری سے باہر لڑکی لے لی تھی لیکن کبھی اس خاندان کی لڑکی دی نہیں تھی۔ وہ اب بھی اس بات کے حق میں نہیں تھے۔ ایک مرتبہ یہ رواج چل جاتا تو انہیں یقین، اور کل سب کے لیے یہ راہ کھلی رکھنا پڑتی اور زمین اور جائداد کا حصہ الگ غیروں کے ہاتھ جاتا۔ لیکن بہرحال کسی بھی صورت وہ اس شادی کو روک نہیں پائے تھے۔ زریاب بہت خوش تھے اور یہ بات زہر سا سہراب خان کے اندر بھر رہی تھی۔ تبھی انہوں نے کچھ اور سوچا۔ کسی بھی طرح انہوں نے اس رسم کو ٹوٹنے سے روکنا تھا۔ ورنہ ساری عمر خسارہ ان کے ہاتھ ہی آنا تھا۔ آج یا کبھی نہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اسی لیے انہوں نے دوران خان کو سمجھا دیا تھا۔ جیسے ہی وہ اور عیسیٰ کے دوست فائرنگ شروع کریں گے وہ فائدہ اٹھا لے موقع کا۔ اور وہاں کے ..... اکثر علاقوں میں شادیوں میں ہونے والی ہوائی فائرنگ میں ایسے حادثات ہونا عام بات تھی تو کسی کو شک بھی نہیں ہوتا تھا۔ پلان بالکل صاف تھا اور کسی کو شک نہیں ہوتا تھا لیکن......

لیکن زریاب کی بانہوں میں تڑپتی تگین کے الفاظ سے انہیں جھٹکا سا لگا تھا۔ اسے کیسے خبر ہوئی تھی؟ اتنا واضح اس نے سہراب کا نام لیا تھا۔ یہ کیسے؟

اسے اگر شک بھی ہوتا تو ضرور صرف شک ظاہر کرتی لیکن اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا وہ سب جانتی تھی۔

اسے پتا تھا سہراب نے ہی سب کچھ کیا ہے۔

"لیکن کیسے......؟" وہ لب کچلتے سوچ گئے۔

اب حالات دوسری ڈگر پہ چل پڑے تھے۔

پہلے وہ بہت کچھ خفیہ طور پہ کرنا چاہتے تھے۔ پلان بن رہے تھے لیکن ابھی صرف وہ جانتے تھے یا ان کی وہ لال ڈائری جس میں وہ اپنا لائحہ عمل طے کرتے تھے۔

لیکن......

انہیں اب جو بھی کرنا تھا کھل کے کرنا تھا۔ وہ تگین کے سامنے آ چکے تھے...... کس طرح...... وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ لیکن بہرحال یہ ہو چکا تھا۔

وہ اس دن سارا وقت تگین کے ارد گرد ہی رہے۔ اس کی حالت خراب تھی۔ دواؤں کے زیر اثر اسے نیند

میں رکھا گیا تھا۔ وہ اور زریاب مل کر عیسیٰ کی تدفین میں مصروف رہے تھے اور بالکل سگے بھائیوں کی طرح اس کی فیملی کو سپورٹ کیا تھا۔ اور تیسرے دن ہی موقع ملتے ہی انہوں نے نگی کو جالیا تھا......

"کیا دیکھا تم نے؟" کمزور سی نگی انہیں کمرے میں آتا دیکھ کر اور کنڈی لگاتا دیکھ کر بے نگا کر بیڈ سے نیچے اتری تھی۔ سہراب تیر کی سی تیزی سے اس کے پاس آئے تھے اور اس کو بالوں سے پکڑ کر دیوار سے لگا دیا تھا۔ نفرت کی تیز لہر تگین کے دل میں جاگی تھی۔

"سب دیکھ اور سن چکی ہوں۔ آپ کی اور دوران کی ایک، ایک بات...... ایک، ایک حرکت......" سارا خوف ایک لمحے میں ہوا ہوا تھا۔

سہراب کی گرفت اور سخت ہوئی تھی۔ نگی کے بال اکھڑنے لگے تھے۔

"اور بھی بہت کچھ ہے بتانے کو جاننا چاہو گی۔" اسے دیوار سے لگاتے ہوئے خباثت سے کہا۔

"نہیں...... اب صرف میں بتانا چاہوں گی...... اور بتاؤں گی پوری دنیا کو...... زریاب لالا کو...... سب کو۔" وہ نفرت سے بولی

"تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔"

"نہیں...... کیونکہ اب میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں بچا......"

"زریاب...... ولی...... کچھ بھی نہیں......" وہ اس کا منہ دبوچتے ہوئے کمینگی سے مسکرائے تھے۔

"اور وہ تمہاری پری تگین...... اس کا بھی ڈر نہیں رہا تمہیں۔" اور تگین کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"چلو...... تمہیں یہی خوشی ہے تو ایسا ہی سہی...... سوچتا ہوں پھر کچھ۔" اسے جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے وہ قہقہہ لگاتے ہوئے واپس پلٹ گئے تھے۔ تگین کو موت کی سردی لپیٹنے لگی تھی۔ خوف سے اس کا وجود کانپنے لگا تھا......"

☆☆☆

اسی قدر تیزی سے وہ اسے اپنے دل کے قریب تر ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ بات جہاں اسے مطمئن کر دیتی، وہیں پریشان بھی۔ جو بھی تھا لالہ کے ساتھ ہونے والا حادثہ ایک مکمل سچائی تھا۔ اس نے بے شک اس کی عزت بچانے کے لیے اس سے شادی کر لی تھی۔ لیکن ابھی اس معاملے میں وہ ایک فیصد بھی کلیئر نہیں تھا۔ کہ کیا وہ واقعی اب اس کے حقوق زوجیت میں آ چکی تھی کہ نہیں۔ دوسری طرف امن کا ایک دم سے ایسا ہارش رویہ...... وہ ایک بار پھر کسی بھی طرح کی انتقامی کارروائی کر سکتی تھی۔ ایسے میں وہ آنے والے دنوں کے لیے کوئی دوسری ٹینشن نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ آج اس نے آفس کا کام جلدی نمٹا کر صوفی صاحب کے گھر کی راہ لی تھی۔ صوفی صاحب اس کے استاد بھی تھے اور زندگی میں جب بھی اسے کوئی مشکل ہوئی تھی انہوں نے ہمیشہ صحیح راستہ دکھایا تھا۔ اسے امید تھی اس بات میں بھی وہ اس کی مدد کر سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے صوفی صاحب بیٹھک میں ہی موجود تھے اور تھے بھی اکیلے...... وہ کافی ریلیکس ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی مسکراہٹ ان کے لب چھو گئی تھی۔ وہ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم صوفی انکل۔" وہ مسکراتا ہوا ان کے گلے لگ گیا۔

"بہت دیر کی مہرباں آتے، آتے۔" محبت سے اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"آپ کی یاد لے آئی صوفی انکل۔"

"ایک استاد کو اپنا قابل شاگرد کبھی نہیں بھولتا۔ وہ اس کا وارث جو ہوتا ہے۔ استاد کو ساری امیدیں اسی سے ہوتی ہیں۔" انہوں نے محبت سے کہا۔ وہ ادب سے نظریں جھکا گیا تھا۔

"اچھا کہاں صوفی انکل۔ بس ادب رہا آپ کا یہ اللہ پاک کا احسان ہے۔" اس کی آواز میں عاجزی تھی۔

"ادب ہی کاملیت کی پہلی سیڑھی ہے بیٹا......

صفت کرتی ہے۔"

"بے شک۔" وہ مسکرایا۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا لو گے۔ قہوہ کہوں تمہاری خالہ کو۔"

"نہیں، نہیں۔ انکل بس مجھے آپ سے ایک مدد چاہیے تھی۔ ایک بہت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔"

"یا اللہ خیر......" صوفی صاحب فوراً پریشان ہو گئے۔

"کیا ہوا ہے باریال...... سب خیریت؟" انہوں نے فوراً استفسار کیا۔ باریال انہیں آہستگی سے سارا معاملہ بتانے لگا۔ سارا واقعہ سنتے، سنتے جہاں صوفی صاحب پہلے اداس ہونے لگے وہیں باریال کا فیصلہ جان کر پُرسکون بھی۔ انہوں نے اٹھ کر بیٹھک کا بیرونی دروازہ بند کر دیا تھا اور لائٹ آن کرتے ہوئے واپس اپنی کرسی پہ آ گئے۔ باریال اب خاموشی سے ان کے بولنے کا منتظر تھا۔

"زنا ایک ناسور ہے۔ آج کے دور میں اس پھیلتی بیماری کی سب سے بڑی وجہ قرآن پاک کی تعلیمات سے دوری ہے۔ اور اگر کچھ لوگ قرآن کے قریب ہیں بھی تو ان میں اکثر اسے اپنے مطلب کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو لوگوں کی فلاح کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔

"اسلام سے قرب ہی اس ناسور کا علاج ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بڑھتی ہوئی آبادی ہے اور اس میں پھر جنس کا مسئلہ خاصا گمبھیر...... لڑکیاں لڑکوں پہ نہ صرف آبادی بلکہ لیاقت و محنت میں بھی بہت آگے بڑھ گئی ہیں اور ایسے میں آزادی کا مطلب بالکل الٹ کر رہ گیا ہے۔ کہیں مرد اپنی حدود یاد رکھتا ہے تو عورت پار کر جاتی ہے۔ عورت یاد رکھتی ہے تو مرد پہ شیطان حاوی ہو جاتا ہے۔ آج حالات یہ ہو گئے ہیں کہ لوگ ناجائز بندھن رکھنے کے لیے تو رب سے نہیں ڈرتے لیکن دوسری شادی کا سوچتے ہی بیوی، فیملی اور عزت کا ڈر لگ جاتا ہے۔ جبکہ یہ شریعت ہے۔ اب ہمارے علاقے میں دیکھ لو۔ ایک ایک گھر میں کتنی لڑکیاں ماں باپ کی چوکھٹ پہ بالوں میں چاندی اتارے بیٹھی

ہیں۔ اچھے کھاتے پیتے مرد ہیں خاندان میں الحمدللہ ہر طرح سے انصاف کر سکتے ہیں لیکن بری نظر ڈال لیں گے پناہ نہیں دیں گے......

لیکن زنا بالجبر بالکل الگ چیز ہے۔ اس میں تو صبر کرنے والیوں کے لیے بہت اجر ہے جو واویلا نہ کریں اور پردہ کر لیں اور آگے کے لیے توبہ کریں اپنا

حصار کریں اسلام کی تاریخ میں یہ ایسے واقعات ہیں جو ایسے ...... کرتوتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو ہمیشہ اس چیز کا معاملہ پیش رہا اور اسی لیے اس معاملے میں قرآن کی تعلیمات بھی بہت واضح ہیں۔ بوسنیا، فلسطین اور کشمیر کی بیٹیوں کی حالت زار سے کون واقف نہیں...... دشمن کے پاس یہ بہت آسان ہتھیار ہوتا ہے کہ اپنے مخالفین کی عورتوں کی عزت کی دھجیاں اڑا دے۔ ان حالات میں ان کو عزت دے کر اپنا لینا ہی انسانیت ہے۔ لیکن کچھ روایات میں علما اس بات پہ بھی متفق ہیں کہ ان حالات میں اگر میاں بیوی کے درمیان فاصلہ رہے تو زیادہ بہتر ہے...... لیکن ایک بات واضح ہے ان عورتوں کے لیے اجر اور عظیم اجر کا وعدہ ہے جو اس آزمائش میں صبر کرتی ہیں اور واویلا نہیں کرتیں۔ بچی کو حوصلہ دو۔"

"اور صوفی صاحب بچہ...... لالہ بالکل بھی نہیں چاہتی۔"

"اس کے لیے میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے قبول کیا کہ اس سے زنا ہوا ہے اور وہ حاملہ بھی ہو چکی ہے۔ میری بات غور سے سنو، زنا ہوا ہے۔ مطلب گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہے۔

"رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ وہ جائے اور بچے کو جنم دینے کے بعد آئے۔

"تب وہ عورت بچے کے جنم تک نہ آئی اور جب آئی تو بچہ گود میں تھا۔ وہ اب بھی سزا چاہتی تھی تاکہ آخرت کے عذاب سے بچ سکے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جا کر اسے دو سال تک دودھ پلا

پھر آتا۔ بالآخر دو سال بعد وہ لوٹی اور سز اپوری کی گئی۔

"بچہ جائز ناجائز نہیں ہوتا۔ وہ اب جیتی جاگتی انسانی جان ہے اور انسانی جان کی اسلام میں کیا اہمیت ہے یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ پھر ہمارے قانون میں تو ایسی عورت سے مکمل شادی بالکل جائز ہے اور اس بچے کا ابارشن کرانا بھی...... لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا...... لالہ گناہ گار نہیں ہے وہ دوسری والی عورت ہے جس پہ ظلم ہوا۔ اس کے لیے اجر ہے اور اگر وہ اس بچے کو بھی پیدا کرتی ہے تو ایک جان بچانے کا ثواب بھی۔ اب تم کس طرح اسے سمجھاتے ہو یہ تم پہ منحصر ہے۔" باریال کا تنا تنا وجود کچھ ہلکا ہوا تھا۔

وہ اب بالکل ریلیکس محسوس کر رہا تھا۔

"مجھے خوشی ہے باریال۔ تم نے عام مردوں سے ہٹ کر سوچا اور کیا۔"

"میں کہاں صوفی انکل۔ یہ تو بس اللہ پاک کا حکم تھا۔ بس دعا کریں لالہ سنبھل جائے۔"

"تم جیسا مہربان ساتھی ہو تو سنبھل ہی جائے گی۔ بس اپنا ظرف بڑا رکھنا بچے۔"

"انشاء اللہ......!" اس نے ادب سے سر جھکا لیا تھا۔ صوفی صاحب مسکرا دیے تھے......

☆☆☆

"سہراب علی خان کو اب سکون نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر زریاب کے ساتھ، ساتھ رہنے لگا تھا۔ سانپ جیسی زہریلی نظریں نگین کو ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ بہر حال جلد ہی اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔

یوں اچانک عیسیٰ کی موت کے دکھ پہ اپنوں کی جان کا خوف واقعی حاوی ٹھہرا تھا۔ نگین اسے ہراساں نظروں سے دیکھتی اور بجائے واویلا کرنے کے خاموشی سے کہیں چھپنے کی کوشش کرتی۔ سین اس کی بے بس حالت پہ تڑپ کے رہ جاتی۔ ادھر روز بروز غم اور بڑھتے خوف اور اسٹریس کی وجہ سے نگی کا دماغ......

...... ماؤف ہونے لگا تھا۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے۔ بیٹھے، بیٹھے تو کبھی، کبھی نیند میں ہی اچانک وہ زور، زور سے چلانے لگتی۔ کسی کے قابو میں نہ آتی۔ اکثر رات میں اسے کئی بار مردان خان کے پرانے لال کنویں سے بھی پکڑ کے لایا گیا۔ رات کو نہ جانے وہ موم بتیاں جلا، جلا کے اس کنویں کے کالے گہرے پانی میں کس کو کھوجنے نکل جاتی۔ نہ رات کے اندھیرے کا خیال کرتی نہ سردی گرمی کی پروا۔

کئی بار حویلی کے بڑے پھاٹک تک کو پار کر گئی۔ نہر کے قریب سے لوگوں نے پہچان کے عزت سے حویلی واپس پہنچایا۔ سین اور زریاب تو اب بہت پریشان ہونے لگے تھے...... اور سہراب اسی قدر پرسکون۔ وہ جس قدر خود سے غافل ہوتی جاتی سہراب علی خان کے لیے اتنا ہی اچھا تھا۔ انہیں اس طرف کی کوئی پریشانی ہی نہ رہتی۔

سین کو پڑھائی مکمل کرنے واپس شہر جانا تھا اور نگین کو اس حالت میں چھوڑ کے جانا اسے بالکل بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ خود عیسیٰ لالا جیسے پیارے انسان کو یاد کر کے دن میں کئی بار اس کی پلکیں بھیگ، بھیگ جاتیں۔ دل پہروں اداس رہتا۔ عیسیٰ لالا کی معصوم سی مسکراہٹ متواتر اس کی پلکیں نم کیے رکھتی اوپر سے نگی کی یہ حالت۔

لیکن......

اس دنیا میں ہر شے فانی ہے......

اپنے وقت پہ سب ختم ہو جاتا ہے......

زندگی یونہی چلتی رہتی ہے۔ کسی کے لیے نہیں رکتی۔ کوئی نہ بھی چلنا چاہے تب بھی قدم آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہی وقت کا حسن ہے۔ یہ ہر درد پہ دھول ڈال دیتا ہے۔ درد ختم نہ سہی کم کر ہی دیتا ہے۔ وہ سب بھی آہستہ، آہستہ وقت کے پہیے کے ساتھ چلنے لگے تھے۔ زندگی نے نئی ڈگر جو سنبھالنی تھی......"

☆☆☆

"اتنا خوب صورت کپل ہے آپ کا ماشاء اللہ اور شادی کے شروع کے دنوں میں ہی اللہ پاک کی اتنی بڑی نعمت...... تو یہ ناشکری کیوں......؟" لالہ کا مکمل چیک اپ کرنے کے بعد اس ڈاکٹر نے حیرت سے باریال سے پوچھا تھا۔

"میری وائف پرسکون نہیں ہے اور مجھے وہ نہیں چاہیے جو انہیں نہیں پسند۔" باریال خود کو پہلے سے ان سوالوں کے لیے تیار کر کے آیا تھا۔ اس نے اعتماد سے فوراً جواب دیا تھا۔ لالہ نے حیرت سے اس "مرد" کو دیکھا تھا...... ڈاکٹر کی آنکھوں میں بھی حیرت ابھری تھی۔

"اتنی چھوٹی سی بات کے لیے آپ اللہ پاک کی اتنی بڑی ناشکری کرنے پہ تلے ہیں۔ خدا کا خوف نہیں رہا آپ کو...... اور تم...... تم تو خوش قسمت ہو ماں کے مرتبے پہ فائز ہونے جا رہی ہو۔ بچے سے ماں کو...... بے سکونی...... اس رئیلی اسٹرینج......"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے تیز لہجے میں کہا تھا۔

"ڈاکٹر پلیز......" باریال نے ہاتھ اٹھا کے انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے منع کیا اور آگے بڑھ کر لالہ کی بیڈ سے اترنے میں مدد کرنے لگا۔

"ہو جاتا ہے اکثر...... آپ نہیں سمجھیں گی۔" وہ اب اسے ساتھ لیے کھڑا تھا۔ لالہ نے دیکھا وہ قد میں کتنا اونچا تھا۔ اسے خود پہ پہلی بار رشک آنے لگا تھا۔

"تھینکس فار یور کنسرن...... ہم کوئی اور کلینک دیکھ لیتے ہیں۔" باریال نے مسکراتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

"میں پھر بھی یہی کہوں گی۔ ایسا کوئی کام نہ کریں جو اللہ پاک کے عذاب کو دعوت دے۔ اسلام میں تو ناجائز بچے کا قتل جائز نہیں۔ یہ تو پھر ماشاء اللہ ایک مکمل کپل کا بچہ ہے...... یہ سراسر ناشکری ہے۔" ڈاکٹر کی بات پہ لالہ نے چونک کے انہیں دیکھا تھا۔ باریال ان سے اجازت لیتا اسے لے کر باہر آ گیا تھا۔

"یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھی ناجائز بچے کا قتل بھی جائز نہیں۔" گاڑی کے آگے بڑھتے ہی لالہ نے باری سے پوچھا تھا۔

"صحیح کہہ رہی تھی۔ یہی تو میں اور دیدے تمہیں سمجھانا چاہ رہے تھے۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن آپ نے کہا تھا ولی اگر میں نہیں رکھنا چاہتی تو۔"

"بے شک...... لیکن اب یہ ہے تو انسان ناں۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے بہر حال اب اس کا ابارشن قتل ہی ہوگا۔ اگر اسے جنم دو گی تو ایک جان بچا لو گی۔"

"لیکن یہ مجھے وہ کرب، وہ رات نہیں بھولنے دیتا ولی...... مجھے جب بھی اپنے اندر اس کا وجود محسوس ہوتا ہے ایک، ایک زخم جیسے کھرچنے لگتا ہے۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔ باریال نے بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں ناں لالہ...... کسی کے دیے زخموں کو بھول کر میری دوستی یاد کر لیا کرو۔ تمہیں یہ سب پھر تکلیف نہیں دے گا۔" اس نے لالہ کا ہاتھ تھامے رکھا تھا۔

"یہ مشکل ہے ولی...... میں اس بوجھ کو اپنے اندر نہیں رکھ سکتی بس۔" وہ سسک اٹھی تھی۔

"اچھا جا رہے ہیں ناں دوسرے کلینک۔ یہ والے ضرور ہماری مشکل حل کر دیں گے۔" اس نے تسلی دیتے ہوئے گاڑی بائیں طرف ایک تنگ گلی میں موڑ دی تھی۔ ذرا دور جا کر ایک اونچے پرانے زنگ آلود دروازے کے سامنے گاڑی روکی۔ گیٹ کھلا تھا۔ وہ اسے لیے اندر آ گیا۔ یہ ایک بنگلو کا وسیع احاطہ تھا جو اس وقت بالکل خالی تھا۔ ایک طرف سے عجیب سی بدبو اٹھ رہی تھی۔ لالہ کا دل خراب ہونے لگا اس نے فوراً دوپٹا ناک پہ رکھا۔

"یہ کیسی جگہ ہے ولی۔" اسے خوف سا آنے لگا۔ اس نے باریال کا بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔

"غلط کام کرنے والوں کے کلینک ایسے ہی ہوتے ہیں۔ خوفناک، سرد اور بدبودار۔ تم گھبراؤ مت میں ہوں ناں۔" اس نے تسلی دی۔ اسی وقت اندرونی دروازہ کھلا تھا اور ایک ادھیڑ عمر عورت باہر آتی نظر آئی۔

"آ جاؤ اندر۔ ڈاکٹر صاحبہ موجود ہیں۔" اس عورت نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو باریال، لالہ کو





ساتھ لیے اس کے پیچھے بڑھ گیا۔

ڈاکٹر نے کچھ دیر اُن سے بات کرکے باریال کو باہر انتظار کرنے کا کہا تھا۔

''اسی کا بچہ ہے ناں جو ساتھ ہے تمہارے۔'' ڈاکٹر نے باریال کے باہر جاتے ہی اس سے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔

''اتنا تو میں سمجھ گئی ہوں تم دونوں میاں بیوی ہو نہیں۔'' اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ لالہ نے چونک کے اس کی طرف دیکھا۔

''لیکن ڈرو نہیں۔ یہاں ہر کام پوری رازداری سے کیا جاتا ہے۔ سمجھو تم کبھی اس عمارت میں آئی ہی نہیں۔''

''ہم واقعی میاں بیوی ہیں۔'' لالہ نے اس کی غلط فہمی دور کی۔ نہ جانے کیوں باریال کے لیے اس کی یہ سوچ اسے بہت بری لگی۔

''رئیلی......'' اب کی بار حیران ہونے کی باری ڈاکٹر کی تھی۔

''جی۔''

''تو پھر یہ سب کیوں......؟''

''بس مجھے..... ابھی بچہ نہیں چاہیے۔''

وہ نظریں جھکا گئی۔

''اوہ آج کل کی لڑکیوں کا یہ فٹنس کریز۔ کیا، کیا کر لیتی ہو تم لوگ......'' وہ اب واپس پلٹ چکی تھی۔

بیل بجتے ہی باریال اندر آیا تھا۔

''آپ انہیں کل لے آئیں۔ میں آپریشن کر دوں گی۔ ان کی حالت بہت کمزور ہے ہمیں خون کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' انہوں نے کچھ ہدایات دیں۔ باریال وہ چھوٹی سی چٹ پکڑتا سر ہلا گیا۔ وہ دونوں اب عمارت سے باہر آ رہے تھے۔

''ولی، میں اس بچے کو ضرور جنم دوں گی۔'' اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا تھا۔ باریال کو جھٹکا سا لگا۔

اس نے حیرت سے لالہ کو دیکھا تھا۔

''لیکن اس کے بعد ہم اسے کسی اچھے خاندان میں دے دیں گے جن کی اولاد نہ ہو... آپ... مجھے...

نہیں کریں گے اسے رکھنے کے لیے......'' اس نے باریال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تم ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی لالہ......'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کا گال چھوا تھا۔ اور لالہ نے سر سیٹ سے لگاتے ہوئے بے اختیار سوچا۔ کاش وہ بھی اس خالص مرد کے لیے ویسی ہی خالص اور پاک رہی ہوتی...... بند پلکوں کے پیچھے سے آنسو لڑھک کر اس کے گال پہ پھسل گیا۔ باریال نے اس کی طرف دیکھے بنا مطمئن انداز میں گاڑی آگے بڑھا دی تھی......

☆☆☆

''وہ اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔ جب اس کی ایک نوٹ بک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے جا گری۔ اس میں سے ایک سفید کاغذ نکل کے سیدھا ساتھ بیٹھی تکین کے پیروں میں آ گرا۔ سیین کی نظر اس پہ نہیں پڑی تھی۔ اس نے کتاب اٹھائی اور بیگ میں رکھ لی......

تکین نے گم صم انداز میں وہ کاغذ اٹھایا اور یونہی کھول کر پڑھنے لگی۔ زیادہ نہیں پڑھا گیا لیکن جتنا بھی پڑھا اس سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ تیزی سے اٹھی تھی اور کھڑکیاں دروازے بند کرنے لگی تھی۔ سیین نے حیرت سے اسے اچانک یہ سب کرتے دیکھا تو فوراً اس کی طرف آئی۔

''تگی...... تگی کیا ہوا ہے...... آپ ٹھیک تو ہیں......؟'' وہ پریشانی سے اسے پکارتی اسے روکنے کی کوشش کرنے لگی......

''ہش...... ہششش'' تگی نے ہاتھ اس کے منہ پہ رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ اسے چھوڑ کر تگی دوبارہ کھڑکی دروازوں کو دیکھنے لگی۔ جب سب بند ہونے کی اچھی طرح تسلی ہو گئی تو وہ بہن کا ہاتھ تھام کر بیڈ کی طرف لے آئی......

''یہ کون ہے......؟'' اس نے وہ سفید خوب صورت لکھائی سے بھرا کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ رقعہ دیکھ کے سیین گھبرا سی گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

آملج

غزالہ رشید



اسے تو اب یاد بھی نہیں تھا کہ نہ جانے کب سے دادی اماں کے پاندان سے الائچیاں، مصری، سونف چرا کے وہ خود بھی کھاتی تھی اور مٹھی میں چھپا کے اپنے سارے دوستوں، سہیلیوں کو بھی الائچی، مصری اور سونف کے مزے سے آشنا کرانے لگی۔ سارے ہی مل کے کبھی کیری اور چاٹ مصالحے کے مزے لیتے اور پھر الائچی کے مزے بھی ساتھ ساتھ تھے۔

عادت کسی بھی طرح کی کب پڑ جائے، اس فلسفے کو سمجھنے کا نہ تو اس وقت شعور تھا اور نہ ہی جستجو...... نہ ہی گوگل پروفیسر سے دوستی...... بس زندگی میں مزے، مزے ہی تھے، خاص طور پر بارش اور گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں، گھر والے قیلولہ (دوپہر کے کھانے کے

بعد آرام) کے مزے لیتے اور بچے سکون سے اپنی من مانی کر رہے ہوتے۔ مالی بابا کی نظروں سے بچتے بچاتے کہ وہ دادی اماں کے مخبر جو تھے۔

☆☆☆

''مہک منزل'' میں رات کی رانی، موتیا کے پھولوں سے سجی شام میں چائے کے ساتھ، ساتھ دادی اماں کی عدالت عظمیٰ بھی سج جاتی، ایسے میں بچوں کی لیڈر اہل سر جھکائے، آنسو چھپاتی، دادی اماں کے پاندان سے چرائی ہوئی چیزوں کا اکیلے حساب کتاب چکاتی، اس کے اقبال جرم پہ دادی اماں کے سر میں مالش کرنے کی سزا، اسے اس وقت تو بوجھ لگتی لیکن نہیں جانتی تھی کہ اس وقت وہ اس کے دل کا ہر راز جان لیتیں، یہ بھی کہ اسے کب کس سے، کون سی شکایت ہے، شکایت کرتے ہوئے وہ روحیل فاروقی کا نام شکایتوں کی فہرست سے ہمیشہ ہی خارج کر دیتی...... کیا کرتی اس کی نگاہوں میں اس کے لیے ہمہ وقت پیار جو دیکھا تھا، جب بھی اس کی لڑائی، کسی سے ہونے لگتی، وہ سامنے والے کا ہاتھ پکڑ کر ایسے موڑتا کہ وہ دو دن تک روحیل کا سامنا نہ کرتا، اسے روحیل کا یہ انداز بہت ہی بھاتا جب وہ آ کے کہتا۔

''میرے سامنے کسی نے اہل کو ہاتھ بھی لگایا تو پھر وہ اپنے ہاتھ کی خیر منائے۔'' ایسے میں اہل کو وہ بالکل اس شہزادے کی طرح لگتا...... جس کی کہانی، دادی اماں سنایا کرتیں۔

یہ کہانیاں بھی، کبھی خوابوں میں آ کے کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی ہیں، جہاں سب کچھ اپنی مرضی کا ہوتا ہے، بس فلم کی طرح دیکھتے جاؤ اور پھر آنکھ کھلتے ہی سب کچھ ختم...... بقول روحیل کے "finish" وہ خواب میں بھی مسکرا دیتی۔

☆☆☆

''مہک منزل'' میں رہتے تو دو بھائی تھے لیکن حکم صرف بیگم بلقیس خانم کا چلتا...... خاص طور پر جب سے دلوں اور رشتوں میں فاصلے زیادہ ہونے لگے تو بیگم بلقیس خانم نے بحث و مباحثہ کی اجازت بھی ختم ہی کر ڈالی......

مظہر فاروقی، اظہر فاروقی کی شادی بھی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ نفیسہ بڑی بہو اور روبینہ چھوٹی بہو تھی۔ دونوں کے مزاجوں میں زمین، آسمان کا فرق تھا۔ نفیسہ کا مزاج جان دینے والوں کا سا تھا اور روبینہ جان لینے کے ساتھ، ساتھ باعزت بری ہونے کی بھی صلاحیت سے آشنا تھیں، ان کی جان روحیل فاروقی میں تھی۔ اس کے لیے خواب ہی خواب تھے، جو وہ سوتے جاگتے میں دیکھا کرتیں، شہزادوں کی سی شکل صورت لیکن مزاج پروفیسروں والا لیکن ماں کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ وہ میری جان ہے اور خواب ویسے ہی وہ اسے دکھاتیں...... روحیل فاروقی کی شخصیت میں کب دادی کے اثرات منتقل ہوئے، وہ ماں ہو کے بھی جان نہ پائیں، یہ محبت بھی نری اندھی ہوتی ہے، سوچ جاتی بھی نہیں اور سب کچھ جاننے کے پورے دعوے کرتی پھرتی ہے۔

☆☆☆

نفیسہ نے آج پھر اہل کو کپڑوں کو قرینے سے رکھنے کا سلیقہ سکھاتے ہوئے وہی پرانا سبق دہرایا۔

''دیکھو بیٹا، جو چیز جو عمل چھپ کر کیا جائے وہ چوری ہی ہوتا ہے اور چوری کرنے سے تم اللہ تعالیٰ کو ناراض کرتی ہو۔'' وہ دھیرے، دھیرے اسے سکھا جاتیں، زندگی کے ڈھب، مائیں ایسے ہی تو روح میں اتارتی ہیں۔

وہ خاموش رہتی لیکن پھر سوچتی بھی تو کیا...... ''لو بھئی، میری کون سی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ابھی ہونے والی ہے، دادی اماں سے زیادہ تو ناراض نہیں ہوں گے ناں...... بس آنکھوں میں آنسو لا کے ہاتھ جوڑ دوں گی...... یہ بھی کوئی چوری ہے، اتنی سی بات کے لیے بھلا دادی اماں کے پاندان کے مزے کیوں چھوڑ دوں......

امی تو بس ایسے ہی خود بھی ڈرتی رہتی ہیں سب سے اور مجھے بھی ڈراتی رہتی ہیں۔'' اور بس تہ کرتے ہوئے کپڑوں کے ساتھ، ساتھ ان کا یہ لیکچر بھی...... الماری کے اندر ہی بند رہ جاتا...... نفیسہ کو اہل کے مزاج کی بے فکری پریشان کر دیتی......

☆☆☆

میرے خوابوں میں چاند اتارا گیا
بیگم بلقیس خانم نے کب اور کیسے یہ فیصلہ کیا......

وہ انجان ہی رہی، ابھی تو اس نے انٹر ہی کیا تھا اور سوچا تھا کہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے گی کہ ایک شام گھر والوں کی ہی محفل سجی، نانی اماں کو بھی بلوا لیا تھا اور وہ ان ہی کپڑوں میں، روحیل کے سامنے بٹھا دی گئی تھی۔ ساری بات سمجھ میں جب آئی جب مٹھائی کی پلیٹ اور خوب صورت انگوٹھی کو دادی اماں نے خود اس کی مخروطی انگلی کو تھام کے پہنایا...... اسے بالکل بھی پتا نہیں چلا کہ روحیل فاروقی کے کیا تاثرات ہیں۔

''تم میری زندگی ہو، میری روح، اور میری ہم سفر...... ہمیشہ میرا ساتھ دینا...... ناراض نہ ہونا...... کبھی بھی نہیں۔'' دوسرے دن شام میں، ایک خوب صورت موبائل جس میں روحیل فاروقی کے نمبر کے ساتھ یہ میسج بھی تھا اسے ملا تھا۔

''تمہاری حاضر جوابی سے مجھے پیار تھا، ہے لیکن منہ زور بے باکی سے نہیں......'' وہ ہمیشہ ایسے ہی میسج کرتا...... ایسے میں وہ اسے امی کی طرح لگتا...... اسی لیے وہ ایسے میسج ڈیلیٹ کر دیتی، اسے نصیحتوں سے کبھی دلچسپی نہ رہی تھی...... اس کا بس چلتا تو وہ پتنگ بن کر اڑتی، ہواؤں کے سنگ...... شہزادیوں کی سی زندگی بسر کرتی، جو پھولوں میں مہکا کرتی ہیں...... ''لو بھلا زندگی کیا خوف میں جینے کا نام ہے؟ جنگلوں میں ہی نہ رہ لیا جائے۔ پھر...... تم بھی روحیل فاروقی...... زندگی میں دادی اماں کے پاندان سے چرائے ہوئی، مصری، الائچی، سونف کے مزے لو......'' وہ happy face اس کی طرف روانہ کر دیتی۔

☆☆☆

وہ اہل ہی کیا جو کسی سے خوف زدہ ہو جائے، اسے جینے کے مزے لینے آتے تھے۔ وہ اپنی ساری کزنز کی طرح چھپکلی اور لال بیگ سے خوف زدہ کبھی نہ ہوئی۔ وہ ان کا مذاق اڑاتے ہوئے ابو کی چھرے والی بندوق اٹھا کر لاتی، نشانہ بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھا، اسے نڈر بننے کا سبق بھی تو اس کے ابو کا ہی پڑھایا ہوا تھا۔

''دیکھو بیٹا اہل، خواہ مخواہ کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اکثر ہی اسے کہا کرتے۔

ان کی کہی ہوئی ایک ہی بات جانے کیوں اسے ازبر رہتی۔

''کیوں ڈروں کسی سے، وہ چاہے روحیل فاروقی ہی کیوں نہ ہو۔'' شاید محبت سے ان دنوں، اس کا واسطہ بھی سرسری سا تھا۔ کھیل کود، گھومنا پھرنا، رونق، تفریح یہ ہی اس کی زندگی تھی۔ ''بھلا ابھی سے زندگی کو اتنا سیریس لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بھلا کیوں روتے دھوتے گزاروں......'' پھولوں سے پیار کرنے والے...... اداس ہوتے ہی نہیں ہیں...... یہی اس کا فلسفۂ زندگی تھا۔

☆☆☆

نانی اماں کے گھر کا نام...... نانا ابو نے پھولوں ہی کے رنگوں سے سجا کے شاید 14 اگست کی یاد میں ''ہمارا گھر'' لکھوا دیا تھا، تاریخ بھی 1947ء کی تھی۔ سرخ اور ہرے رنگ سے لکھا ہوا نام دور ہی سے نظر آتا تھا۔ بچپن میں اکثر ہی نانی اماں گیٹ پر لے جا کے دکھاتیں اور کہتیں۔ ''دیکھو میں نے اس گھر میں قدم رکھا 14 اگست کو تھا کیونکہ تمہارے نانا نے پہلے ہجرت کر لی تھی۔ وہ پاکستان کے لیے کئی جانوں کو قربان کر کے آئے تھے...... اور خود بھی وہ اسی سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب بھلا بچے، بچے کو یہ دن کیسے بھولتا...... روح میں رچ بس گیا تھا پاکستان بھی...... اور ''ہمارا گھر'' کے رنگ بھی درد بھی...... خوشیاں بھی......''

ایسے ہی ایک شام میں چھوٹی خالہ جنہیں امی نے بچوں کی طرح پالا تھا، شوہر کی دوسری شادی اور پھر سال بھر بعد ہی نئی بیوی کی محبت میں طلاق کا داغ لے کے روتی ہوئی گھر واپس آ گئیں، اس غم نے نانی اماں کی جان لے لی اور دیکھتے ہی دیکھتے نفیسہ بیگم کو ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کر دیا...... ہمارا گھر، درد کی اور

شکایتوں کی آماجگاہ ہی بن کر رہ گیا۔

☆☆☆

اہل کو وحشت ہونے لگی تھی، اس کا جی چاہتا کہیں دور بھاگ جائے، جہاں زندگی سانس لیتی ہو......مرد کو تو چار شادیوں کی اجازت ہے، ایسے میں تائی اماں کے زبان کے زخم، امی کی روح کو کچوکے تو اس کا غصہ بھی عروج پر ہوتا۔

اسے کمزور ہونے سے نہ جانے کیوں چڑ تھی اور امی تھیں کہ ہر وقت اداسی کا ماحول بنا کے تسبیح پھیرتی رہتیں......سچ پوچھو تو اسے چھوٹی خالہ سے بھی چڑ سی ہونے لگی تھی۔ ممانی کے ہاں جب بھی وہ جاتے بچوں کی شکایتیں کرتیں......یہ جو شکوے ہوتے ہیں ناں، یہ ہی ساری بیماریوں کی جڑ ہوتے ہیں......تب ہی تو نفیسہ بیگم نے پہلے تائی اماں کے گھر جانا کم کیا اور پھر اپنے گھر سے بھی ایک رات خاموشی سے رخصت لے لی اور سب ہی کو تنہا کر دیا۔ خاص طور پر اہل کو......بھلا کوئی ایسی بھی محبت کرتا ہے کسی سے کہ اپنی جان کا ہی دشمن بن جائے، وہ سب سے ہی شاید ناراض تھی، بے حد ناراض......

اس نے یوٹیوب سے گانے سننے شروع کر دیے، اُف کتنی خوب صورت دنیا چھپی تھی، موبائل کے چپ سسٹم میں، وہ انجان تھی، اب بھلا کون تھا جس سے وہ ڈرتی......تائی اماں کو تو ویسے بھی اس سے بات کرنا ناپسند تھا۔

☆☆☆

روحیل فاروقی بھی صبح کا گیا شام کو ہی لوٹتا......ضد تو شاید اس کے خمیر میں گندھی تھی۔ سو اس نے پڑھائی کے لیے لندن کا نہ صرف جانے کا فیصلہ کیا بلکہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی لے لیا......اس شام اس نے تائی اماں کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی......جو کسی فلم کے اختتام اور کامیابی پر تمام ٹیم کی آنکھوں میں ہوتی ہے......روحیل فاروقی سے ملاقات کو دنوں ہو جاتے......بس میسج پر ہی گزارہ تھا۔ یہ کیا کہ وہ جو گھنٹوں لان میں بیٹھ کے باتیں کرتے تھے، ایک

بس msg، pics، post جس میں کہیں اپنی محبت کی چاشنی نظر نہیں آتی۔

''تم سلامت رہو۔'' صبح کا پیغام......

شام کو msg ''زندگی تم ہو، مائی لائف......''

رات میں پھر ایک میسج......ٹیبل لیمپ کی روشنی اور good night post چپکے سے ایک بار بھی نہ کہا......اور نہ ہی پوچھا کہ میرے بغیر کیسے رہو گی......

بغاوت نے سر اٹھایا تو جذبے فریاد کرتے رہ گئے۔

☆☆☆

روحیل کا ویزا آ گیا تھا، ایک رات پہلے گھر میں ہنگامہ بپا تھا کیونکہ پہلی بار تایا ابو نے زبان کھولی، جب دادی اماں نے نکاح کے لیے اصرار کیا۔

''اماں مجھے اپنی تربیت پر اعتماد ہے، اس پر ابھی ذمے داریوں کا بوجھ نہ ڈالیں۔'' انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ''زبردستی کے بندھن صرف دل پر ہی نہیں، زندگی پر بھی بوجھ بن جاتے ہیں۔''

اور پھر جولائی کی وہ شام گھر بھر پہ ہی بوجھل بن گئی۔ سناٹا صرف روحیل فاروقی کی رخصتی کا ہی نہ تھا بلکہ بلقیس خانم کے فیصلے کے سامنے سر اٹھانے کا بھی تھا۔

وہ کافی دنوں تک خاموش رہیں، انہوں نے گھر کی ذمے داری بھی روبینہ بیگم کو دیتے ہوئے ایک اور فیصلہ ضرور کیا، جسے اب قبول نہ کرتا......شاید ان کی جان لے لیتا لہٰذا سب ہی نے سر جھکا دیا......اہل نے بھی......جبکہ امی کی جگہ تو وہ کسی کو بھی نہ دے پاتی، خواہ وہ چھوٹی خالہ ہی کیوں نہ ہوں......بس اس کی مرضی......

لیکن اب وہ کسی سے کچھ بھی نہ کہتی، روحیل سے بھی نہیں کیونکہ اسے تو وہ جذباتی ہی لگتی تھی ناں......لیکن اس رات پہلی بار اس نے وضو کیا اور سجدے میں روتے، روتے بس یہ ہی دعا کی......کیسی دعا......جو شاید وہ کسی سے بھی نہ کہہ سکتی، بتا سکتی......دوست، ہمراز کی دعا......ہے ناں جذباتی سی دعا......

☆☆☆

اس کا بے حد خیال رکھتی تھیں، دادی اماں کی بھی خدمت کرتیں اور بس پھر اپنے بچوں میں لگی رہتیں۔ انہوں نے خدمت سے سب کو جیت لیا حتیٰ کہ اظہر فاروقی کو بھی......یہ بات اہل کو بالکل بھی پسند نہیں آئی، بس وہ ایسی ہی تھی۔

''چلو اہل آج ہادی کی سالگرہ ہے، پزا کھانے چلتے ہیں......'' ابو مسکرا کر بولے۔ ''جلدی سے تیار ہو جاؤ......''

''مجھے پزا پسند نہیں ہے۔'' اس نے موبائل سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو بریکنگ نیوز ہے۔'' اظہر فاروقی مسکرائے۔

''اچھا پھر ایسا کرتے ہیں، باربی کیو کھانے چلتے ہیں۔'' چھوٹی خالہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

''نہیں نہیں......آپ لوگ جائیں۔'' اس نے کہا۔

''آپ کے بغیر نہیں۔'' ہادی نے قریب آ کے کہا۔

وہ چل تو دی......لیکن اس کی بیزاری سب ہی نے محسوس کی، وہ سارا وقت اپنے موبائل سے ہی کھیلتی رہی۔

اظہر فاروقی نے ایک دو بار ٹوکا لیکن اس کا مزاج جانتے ہوئے نظر انداز کر دیا......خوش رہنے کی عادت انہیں بھی تو تھی......اب بھلا کیسے اپنا اچھا وقت، صرف اہل کو منانے میں ضائع کر دیتے......اہل نے بھی وقت گزارنے کے نئے ڈھب تلاش کر لیے تھے۔

وہ روحیل سے شادی کر کے بھی، اس اذیت سے بھلا کیسے پیچھا چھڑا سکتی تھی۔ رات آنسوؤں نے پھر سے بغاوت کی، صبح دیر سے آنکھ کھلی تو دادی اماں کے کمرے میں آج پھر سے بلایا گیا، ورنہ تو عادت ہی ختم ہو چکی تھی۔

''اہل بیٹا، سر میں ذرا تیل ہی ڈال دے، ایسے خارش ہو رہی ہے جیسے سر میں جوئیں ہو گئی ہوں۔'' دادی اماں کا یہ پیار کا انداز تھا......جو اسے آج زہر لگ رہا تھا۔

اہل کا دل چاہا، وہ دادی اماں کے پاندان کو آج چھت پر لے جا کے اچھال کے سڑک پہ پھینک دے، ساری چیزیں سڑک پر بکھر جائیں......مصری، الائچی، سونف، کتھا، چونا اور سارا کچھ ایسے ہی تباہ و برباد......

بس دل کی خواہش تھی، نادان تھا ناں......اداسی کی زبان اور جدائی کا درد اس کے دل کو بھی ریزہ ریزہ کرے......سب کچھ آنسوؤں کی طرح سڑک پر پھیلتا ہی چلا جائے۔

☆☆☆

وہ بہت سی خوب صورت لڑکیوں سے منفرد نظر آتی، اس کے سیاہ گھنے بال اور خوب صورت ڈمپل سامنے والے کو مسحور کر دیتے تھے، تب ہی تو ایک دن اسے......اور پھر بار، بار روحیل کے ساتھ، ساتھ بہت سے اور لوگوں کی بھی فرینڈز ریکوئسٹ موصول ہونے لگیں۔

اس نے نہ جانے کیوں فہد خاکوانی سے دوستی کر لی۔ وہ باتیں ہی اتنی اچھی کرتا تھا، مزے، مزے کی باتیں، اچھے اشعار، بے حد خوب صورت گانے، جن کی لوکیشن پہ جانے کو دل مچل اٹھتا تھا۔ ان باکس......میں جب فہد خاکوانی نے اس کا سیل نمبر مانگا تو اس نے دے دیا......روحیل کی بھی تو اکثر تصویروں میں لڑکیاں دوست نظر آیا کرتی تھیں، وہ بھی دوستی کر لے تو کیا فرق پڑے گا......جو ہو گا دیکھا جائے گا، یوں فہد خاکوانی سے دوستی ہوتی چلی گئی......تصویروں کا تبادلہ، گانوں کا سلیکشن اور باتیں، عادت بنتی گئیں......صبح شام باتیں کرنے کی عادت......وہ بھول گئی کہ کبھی، کبھی عادت دل کا روگ بن جاتی ہے......وہ تو بس خوشیوں کی تلاش میں، پھولوں کے راستے پہ چل رہی تھی......راستے مہک رہے تھے۔

☆☆☆

''مائیں مر جاتی ہیں، لڑکیوں کو سلیقہ ساری زندگی نہیں آتا۔'' اہل، دادی اماں کے لیے دلیہ کی کھچڑی بنا رہی تھی......جب اس نے روحیل سے باتیں کرتے ہوئے تائی اماں کا یہ جملہ سنا......وہ تو حیران تھی کہ اس کو صبح شام صرف میسج کرنے والا روحیل فاروقی تائی اماں سے یہ سب باتیں سن ہی کیوں رہا ہے......اسے تو عادت ہی نہیں تھی فضول ڈسکشن کی......رشتے اچانک ہی سانپ کی طرح کینچلی بدل، بدل کے اس کے سامنے آ رہے تھے جو اس کے

چھوٹے...... رشتے...... سبھی مکالمے......

☆☆☆

چھوٹی خالہ بھی اس روز میکے سے واپس آئیں تو بے حد اداس تھیں، وہ اپنی نئی تصویر اپ لوڈ کرنے میں مصروف تھی۔ سب لوگ اپنے، اپنے تجربوں کا زہر دیتے ہوئے ایک لمحے کو بھی یہ نہیں جان سکے...... اہل کو تو مہندی کی خوشبو اور رنگوں کے ساتھ، ساتھ پھولوں کی مہک سے عشق تھا۔ وہ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی، وہ تو سپنوں میں بھی پھول چننے کی عادی تھی...... صرف پھول......

''روحیل سے بات کیا کرو، اس کا خیال کیا کرو، اس سے کہو جلد واپس آئے، اب تو اس کی تعلیم بھی مکمل ہو چکی ہے، تمہارے ابو بتا رہے تھے، اس کا وہیں جاب کا ارادہ ہو رہا ہے، تم کیوں اس سے نہیں کہتیں، واپس آؤ، مجھے تمہاری تائی اماں کے تیور ٹھیک نہیں لگتے، میری بربادی سے ہی سبق لو......'' خالہ کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

اس نے حیرت سے آج پہلی بار ان کو دیکھا، سنا، وہ کہہ رہی تھیں۔

''میں تو بچوں میں، کچن میں مگن رہتی تھی، کبھی ان سے سوال جواب نہیں کیے، خواہ وہ کتنے ہی مصروف ہوں، شکایت ہی نہیں کی، کھانا بھی ان ہی کی پسند کا بنائی، تمہیں پتا ہے، تمہیں پتا ہے مجھے کڑھی، چاول اور پالک گوشت بے حد پسند تھا لیکن انہیں یہ سب ناپسند تھا، میں نے بنانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ انہیں ساڑی پہننا پسند نہ تھا میں نے سب کو سب بانٹ دیں۔ لیکن پھر اچانک ہی انہیں دال چاول، آلو کے پراٹھے، ٹماٹر کی چٹنی گوبھی گوشت حتیٰ کہ شلجم کے اچار کے ساتھ، ساتھ ساڑی میں ملبوس فریحہ خان اچھی لگنے لگی، جس نے ان کے ساتھ صرف ایک مرتبہ ساحل پہ ملاقات کی تھی...... ملنے آئی تھی ان سے...... بے خوف ہو کے، مرد ذات کی پسند کب بدل جائے، کب کوئی من میں کب کوئی نیا چاند آنگن میں اتر آئے...... عید کب کس کے ساتھ منانی اچھی لگنے لگے...... شام کو گھر لوٹنے والا کب گھر کا راستہ بدل لے...... پچھلے سارے وعدے بھول جائے، پتا ہی نہیں چلتا......'' ان کی خوب صورت آنکھوں میں، ماضی آنسو بن کے جھلملانے لگا۔

''آپ کو میرے ابو سے محبت نہیں ہے؟'' اسے عجیب سی خوشی ہوئی، دل میں پھول سے کھلنے لگے۔

وہ گھبرا سی گئیں...... جلدی سے، دوپٹے سے بھیگی آنکھوں کو صاف کیا۔

''پہلے بھی اور آج بھی ان کی دل سے عزت کرتی ہوں، وہ مجھ سے تنہائی میں اکثر بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں، میں بچوں کی ہی طرح ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' ان کی آواز کی لرزش اہل کے لیے، جانے کیوں جلترنگ سی بن گئی تھی۔

بہت عرصے بعد اسے چھوٹی خالہ اچھی لگیں......

لیکن کیا کرتی، موبائل کے میسجز، اسے کسی پر بھی توجہ نہ دینے دیتے۔ اسے خود سے محبت تھی...... صرف اپنا آپ اسے اچھا لگنے لگا تھا...... صرف اپنا آپ......

☆☆☆

''تمہاری pic جو پروفائل پر ہے، بھولتی ہی نہیں، تبدیل نہ کرنا۔'' اس نے حق جتایا۔

''کیوں......'' وہ اٹھلائی...... کون سی...... انجان بننے کا مزہ ہی اور تھا۔

''خوب صورت ہاتھوں میں پھول......'' فوری جواب ملا...... پھر......

ہاتھ جوڑنے کا sign موصول ہوا۔

''میں بھلا کیوں مانوں، آپ کی بات......'' وہ اترائی۔

''تم مانو گی...... مجھے یقین ہے۔'' جواب فوری موصول ہوا۔

''ہم اچھے دوست ہیں، اس لیے مان لیتی ہوں۔'' اہل نے لکھا۔

''صرف دوست......'' sign کے ساتھ میسج......

کا ہر جب ...... کی ...

''سوچ لو......'' فہد خاکوانی کا جواب غور طلب تھا۔

''سوچ لیا...... جناب......'' مسکراہٹ صرف مسکراہٹ کا sing......

☆☆☆

''ہر وقت موبائل پر تم سے باتیں کرتا ہے، پوچھو تو کب واپس آئے گا؟'' دادی اماں نے معصومیت سے پوچھا۔ مصری، الائچی، سونف آج خود ہی اس کے ہاتھ میں رکھ دی۔

''دل نہیں چاہ رہا......'' اس نے پہلی بار ان کے ہاتھ میں واپس رکھ دی۔

''اس کی ماں کو تو بیٹے کی لگتا ہے یاد ہی نہیں آتی، تم بھی کیا اس ہی جیسی ہو گئیں......'' دادی اماں کی نظریں اس کے موبائل پر تھیں۔

''وہ ہی بتا ئیں گی دادی اماں، فون بھی تو ان ہی کے پاس آتا ہے۔'' اہل کو اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

''اے لو...... تو پھر تم کا ہے کو موبائل ہاتھ میں لیے پھرتی ہو۔'' دادی اماں کا لہجہ آج پہلے جیسا تھا۔

''ابھی پرسوں ہی ماں سے بات کی، مجھے بھی بتایا کہ وہ آنے والا ہے۔'' انہوں نے پاندان کو خواہ مخواہ ہی صاف کرنا شروع کر دیا...... اب اہل کو اس سے پوچھنا نہ ہی پڑا۔

''مجھے لگتا ہے روحیل کو اب پاکستان پسند نہیں رہا......'' اہل کی دل کی بات زباں پر آ گئی۔

''کیوں...... یہ کب کہا...... اس نے؟'' دادی اماں نے چشمے کی اوٹ سے گھورا۔

''نہ ہی انہوں نے کبھی میسج میں بتایا، نہ ہی تائی اماں چاہتی ہیں کہ وہ لوٹ کے آئیں۔'' اہل کو خود اپنا لہجہ اجنبی لگا۔

''اے لو، ہماری اہل کو بھی دنیا داری آ گئی ہے، سنا تم نے۔'' چھوٹی خالہ کے آتے ہی انہوں نے موضوع بدل دیا۔

نظم

وہ گاؤں کا اِک منظر تھا
اس منظر میں تھے ہم دونوں
اِک نہر کنارے بیٹھے تھے
تم ہاتھ سے ٹھنڈے پانی کو
یوں مجھ پہ پھینکتے جاتے تھے
میں ہاتھ سے چہرہ ڈھانپے ہوئے
غصے سے گھورتی جاتی تھی
تم یونہی ہنستے جاتے تھے
تم کو ہنستے دیکھتے ہی
میں بھی ہنستی جاتی تھی
وہ اِک سرشاری کا عالم تھا
پھر کب جانے میری آنکھ کھلی
وہ خواب سہانا ٹوٹ گیا
ہاتھوں سے ہاتھ بھی چھوٹ گیا
وہ نہر کنارہ، ٹھنڈا پانی
بس اِک خواب کا عالم تھا
پانی تو تھا پر آنکھوں میں
جلے دیپ بجھانے والا تھا

کاوش: نبیلہ خان، ڈی آئی خان

کیسی قسمت

مجھے اِک جوتشی نے یہ بتایا
تمہیں شہرت ملے گی
تمہارے در پہ لکشمی ہاتھ کو جوڑے کھڑی ہو گی
جو میں نے ڈرتے، ڈرتے اس سے پوچھا
میری قسمت میں کیا راحت لکھی ہے؟
تو اس نے سر جھکایا
بڑے افسوس سے مجھ کو بتایا
تیری قسمت میں یہ
دولت نہیں ہے

کلام: صغریٰ زیدی
مرسلہ: کلثوم عباس، کراچی

صرف خواب تھے، خواب دلنشیں خواب......

فہد خاکوانی کی msg کی ٹون بجتی رہی، آج اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا موڈ نہیں تھا...... خود سے بھی......

اسے لگا...... وہ اور اس کا دل بے ایمان ہو رہا ہے، بچپن میں پاندان سے چرائے ہوئے، خوشگوار لمحوں کی یاد، اسے بے چین کرنے لگی، عادت پر محبت نے ترجیح اختیار کر لی تھی شاید...... یا شاید نہیں...... پھر اس نے فہد خاکوانی کو اپنی منگنی کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟

''آخر کیوں...... آخر کیوں......؟'' دل نے اسے روحیل کی محبت کی عدالت میں لا کھڑا کیا تو وہ سن ہو کے رہ گئی...... یہ نیا سفر...... نئی رہگزر اسے کسی اور ہی دنیا میں کیوں لیے جا رہا تھا، اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگنے لگیں۔

دل نے فیصلہ دے دیا...... روحیل فاروقی کے حق میں...... ال نے پہلے اس کے سارے میسج ڈیلیٹ کیے اور پھر فہد خاکوانی کا نمبر بھی...... وہ چاہتی تو بتاتی کہ میں بات نہیں کرنا چاہتی اور پھر نمبر ڈیلیٹ کرتی لیکن آج پہلی بار خوف کی پرچھائیں نے چاروں جانب سے اپنا گھیرا تنگ کر دیا تھا۔

کچھ دن دل نے بے چین کیا...... لیکن پھر روحیل کی واپسی کی خبر نے سب کچھ بھلا دیا...... پھر سے دادی اماں کے پاس بیٹھ کے، وہ حکایت سعدی سننے لگی...... لیکن وقت کی ادائیں...... دروازے کے سامنے ہی تو کھڑی تھیں، بے خبری کب خبر بن جائے......

☆☆☆

روحیل کی آمد نے گھر میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھیر دی تھیں۔

اسے بھی انتظار تھا، اپنے بچپن کے دوست کا، اس نے بہت دنوں بعد دادی اماں سے کہا۔ ''میری منگنی کی انگوٹھی تو میری انگلی میں پہنا دیں۔'' اس کی نگاہوں میں سوئی سی۔

''کیا روحیل کو دکھانا ہے؟'' انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

''خود کو بھی تو بتانا ہے، دادی اماں۔'' ال نے ان سے لپٹتے ہوئے کہا۔

چھوٹی خالہ نے، روحیل کی پسند کی ڈشز تائی اماں کے ساتھ مل کر تیار کیں، اسے بھی ساتھ، ساتھ رکھا۔

''روحیل اس بار چھٹیوں میں آ رہا ہے، کوشش کرو کہ وہ پاکستان میں ہی آ کے جاب تلاش کرے تاکہ تم دونوں ہمارے قریب رہو۔'' وہ بالکل امی کی طرح سے بات کرتیں، اس کا بھی انہیں سننے کو دل چاہنے لگا تھا۔

☆☆☆

فہد خاکوانی نے بڑی آسانی سے تعلق ختم کر لیا تھا، ایسے ہی سب کہتے ہیں کہ لڑکے بدنام کر دیتے ہیں، پیچھا ہی نہیں چھوڑتے، اس نے یہ سوچ کے اسے بھی ایک اچھی یاد سمجھ کے الماری کے آخری کونے میں چھپا کے رکھ دیا...... اب سب کچھ پہلے جیسا تھا، پھولوں کے رنگ بھی اور ان کی خوشبو بھی...... موسم سارے اچھے تھے اور وہ بھی سب سے اچھا تھا۔

رات کافی کا دور چلا...... روحیل نے کافی کا مگ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے رازداری سے کہا۔

''تم اس موبائل کو کبھی خود سے علیحدہ بھی کرتی ہو، ویسے کر لیا کرو...... اچھی بات ہے۔'' لہجہ دومعنی تھا۔

''بس کچھ عادت سی ہو گئی ہے، تمہارے میسج جو آتے ہیں۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''یہ تو کوئی اچھی عادت نہیں ہے، بندہ ناکارہ سا ہو جاتا ہے اتنے عرصے میں تم لی اے بھی تو کر سکتی تھیں۔'' اس نے موبائل اس کے ہاتھ سے لیا۔

ال نے گھبرا کر موبائل ہاتھ سے لینا چاہا تو اس نے مسکرا کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''یہ پرانا ماڈل ہو چکا ہے، اسے ریجیکٹ کر دو، میں تمہارے لیے نیا موبائل لایا ہوں۔'' وہ اس کے گھبرانے پر مسکرایا۔

''اس میں، میری pics اور دوستوں کے نمبر بھی تو ہیں۔'' اس کی ہتھیلیاں نہ جانے کیوں پسینے میں بھیگ گئیں۔

''ہاں pics وہ تو فیس بک پر بھی میں دیکھتا رہتا تھا۔ خاص طور پر تمہاری پروفائل پکچر...... وہ تم نے کبھی تبدیل ہی نہیں کی، ہے ناں۔'' اس کی آنکھیں کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔ ''اس پر تو لائک بھی ڈھیروں تھے۔'' اس نے عجیب انداز میں کہا۔

''میں سمجھتا تھا، اہل کا صرف ایک ہی دوست ہے، راز دار روحیل فاروقی، یہ نئے دوست کب سے بنانے شروع کر دیے۔''

''میں نے صرف دوست بنائے ہیں۔'' وہ بہت بے خوفی سے بولی۔

''تم نے تو چھپ کے بنائے ہیں، پاندان سے چرائی ہوئی الائچی تو چھپا نہیں پاتی تھیں۔'' وہ اسے حیران کر رہا تھا۔ ''تم گھبرا رہی ہو، چلو جانے دو۔'' اس نے موبائل سمیت قدم آگے بڑھا دیے۔

اہل ساکن کھڑی رہ گئی، نہ جانے کیوں منگنی کی انگوٹھی اسے لگا، اس کی تیسری انگلی میں تنگ ہو گئی ہے۔

☆☆☆

رات کو وہ دیر تک بے چین رہی، یوٹیوب سے گانے سننے کی عادت سی ہو چلی تھی...... روحیل کا رویہ عجیب سا تھا کس سے مشورہ لیتی روحیل کے لیے یہ سب جاننا اتنا مشکل کہاں تھا...... یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں کبھی کہ روحیل فاروقی I-T-Engineering کر رہا ہے۔ لاعلمی بھی ایک روگ ہے، آج اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

وہ دو راتوں سے، ڈنر پر موجود نہ تھا، دادی اماں کے ساتھ، ساتھ اب سب ہی کو تشویش ہونے لگی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے کمرے سے نکل کر کچن تک جاتی اور پھر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتی ضرور لیکن سب کو پانی اور چیزیں سرو کرتی رہتی۔

''یہ روحیل کہاں مصروف ہے، دو دن سے نظر ہی نہیں آ رہا۔'' دادی اماں نے پوچھا۔

''کسی دوست کے ساتھ ہے، رات دیر سے آئے گا۔'' تائی اماں نے اطلاع دی۔

''گھر کے سارے طور طریقے بدل گئے ہیں، ایک وقت ساتھ کھانا ضرور کھایا جاتا تھا۔'' دادی اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''لیکن اب تو سب ہی مصروف ہیں۔ تم نے بھی تو آج کھانے میں نمک تیز کر دیا ہے۔'' بلقیس خانم نے اہل کی طرف دیکھا۔

اہل نے کچھ کہنا چاہا لیکن چھوٹی خالہ نے یہ الزام اپنے سر لے لیا بالکل اسی کی طرح...... دادی نے محبت سے ان کی طرف دیکھا اور اہل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

''چائے کا کپ لے کر میرے کمرے میں آنا، مجھے تم سے کام ہے۔'' پھر روحیل نے قدم آگے بڑھائے۔ اہل کا موبائل اس کی ہتھیلی پر رکھا۔

''چائے......'' اس کی اتنی ہی آواز نکل سکی۔

وقت اپنی تمام سفاکیوں کے ساتھ، ان دونوں کے درمیان حائل تھا۔ وہ جس کمرے کی صفائی کرتے ہوئے گھنٹوں اس کی تصویروں سے باتیں کرتی تھی۔ آج سر جھکائے کھڑی تھی۔ ساری باتیں جیسے فضا میں خوشبو کی طرح اڑ گئی تھیں۔

''تمہارا، زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے کئی بار فون پر اسی سے تمہاری موبائل سے محبت کی کہانی سننے کو ملی تھی۔ لیکن مجھ احمق کو اپنی بچپن کی محبت پہ اندھا اعتماد تھا۔ تم سے تھوڑا سا ہی تو وقت مانگا تھا بلکہ سب ہی سے...... لیکن قسمت مجھے کچھ اور ہی سبق دینا چاہتی تھی۔ جانتی ہو، فہد خاکوانی میرا کالج فرینڈ ہے، ہمیشہ سے بدنام، لڑکیوں کو دوستی کے نام پر بلیک میل کرنے والا...... وہ اکثر دوستوں میں، زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے، لڑکیوں کے قصے سناتا تھا، اس کی ان ہی عادتوں کی وجہ سے اس کی بیوی اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ تم میری منگیتر ہو۔ اور تم نے بھی دوستی کے نشے میں، ایک انجان آدمی کو pics بھی send کیں اور اپنی منگنی کا بھی نہ بتایا، پوچھوں گا نہیں کیوں......'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''وہ تمہارا بھی تذکرہ کرتا تھا اور تمہارا نام دوستوں میں، وہ بڑی شان سے گی کہہ کے پکارتا تھا، بقول اس کے بچوں جیسی حرکتیں اور باتیں کرتی ہے، اس نے آج مجھ سے معذرت کی ہے، جب میں نے اس سے درخواست کی کہ تم میری کزن ہو اور مزید رابطہ نہ رکھے تو وہ بھی شرمندہ ہو گیا، ورنہ وہ تو اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہے، اصل دشمن تو تمہارا میں ہوں کہ میں نے تمہیں یہ موبائل خود سے رابطے کے لیے گفٹ کیا تھا...... امی کو بہ مشکل اس رشتے کے لیے راضی کیا تھا...... ان کے خواب، جانتی ہو ناں کتنے اونچے، اونچے ہیں، ان کی ناراضی ان کے جملوں کی تلخی ہی کی وجہ سے کہا تھا کہ کبھی ان کی وجہ سے ناراض نہ ہو جانا مجھ سے...... لیکن یہ سب تو میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔'' اس اونچے لمبے وجیہہ روحیل فاروقی کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔

''بس صرف یہ کہنا ہے تم سے اب تم شرمندگی کے ساتھ یہ رشتہ نبھا سکو گی اور نہ میں کبھی دل سے تمہاری عزت کر سکوں گا...... محبت پر میرا بس نہیں چل سکے گا۔ فہد خاکوانی اب بھی ایک تماشا ہے لیکن وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔'' اس نے چائے کا سپ لیا...... جو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

''ہاں اس سے یہ وعدہ ضرور لے لیا ہے کہ وہ تمہیں تنگ نہ کرے، تم نے تو نمبر ڈیلیٹ کر دیا لیکن اس کے پاس تمہارا نمبر محفوظ تھا اور تمام pics بھی جو وقتاً فوقتاً اس کی فرمائش پر تم سینڈ کرتی تھیں۔''

''مجھے معاف نہیں کر سکتے روحیل......'' اس کی نظر ملانے کی ہمت نہ تھی۔

''تم نادان دوست ہو، اسی لیے ہی تو معاف کر رہا ہوں، رشتہ نہیں رکھ سکتا اس کے لیے تم معاف کر دینا۔'' اس کا لہجہ اور انداز اجنبی تھا۔

''یہ سب مجھے زندہ درگور کر دیں گے، میں کہاں جاؤں گی۔'' وہ رو دی۔

''اسی لیے سارا الزام خود پر لوں گا اور واپس لندن چلا جاؤں گا، کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔'' اس نے پانی کی خالی بوتل کو منہ سے لگا لیا۔ وہ دیکھتی رہی۔

''یہ سزا زیادہ نہیں، تمہارے لیے۔'' اہل نے انگوٹھی کو تھاما۔

یہ رشتہ تو اسے جان سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ خزاں سا وجود لیے وہ کھڑی تھی۔ قدم بھاری ہو رہے تھے، لوٹنے کا سفر ہمیشہ ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

''تمہیں تو آزاد کر دیا ہے، سزا تو اپنے لیے چنی ہے۔'' روحیل نے خود کو سنبھالا۔

''میں دادی اماں کو سب سچ بتا دوں گی...... سب سے معافی مانگ لوں گی، تم میری وجہ سے جلاوطنی اختیار نہ کرو، پلیز، پلیز......'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے......

''ان تمام باتوں کو آج رات یہیں میرے کمرے میں، دفن کر دو، یہ میری درخواست ہے۔'' اس نے نیا موبائل اس کو تھمایا۔ ''فہد خاکوانی کے علاوہ سارے نمبر فیڈ کر دیے اور ہاں میرا نمبر بھی ہے، دوست تو ہوں ناں تمہارا......'' وہ زبردستی خود کو نارمل رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ روحیل فاروقی ہی تو اس کا دوست تھا، ہمراز تھا اور ہے لیکن وہ اس کے آنسوؤں سے تر چہرے کو دیکھنے کے لیے کمرے میں رکا ہی کب تھا، واپسی کا سفر اس نے اختیار کیا اور انتظار کو اہل نے اپنا مقدر کر لیا۔ وجود مٹی کا ڈھیر تو بنتا جا رہا تھا۔ کان سائیں، سائیں کر رہے تھے، پھولوں سے محبت تھی اور والدین نے اسی کا نام اہل امید رکھا تھا...... وہ آج پھر سے سجدہ ریز تھی...... آنسوؤں سے بھیگا چہرہ لیے، پھولوں کی محبت میں...... وہ کانٹوں سے خود کو... لہولہان کر چکی تھی۔



ناولٹ

تو قصہ زیست

منعم ملک

اختتامی حصہ

''بکھرو بھی ایسے کہ صرف خود میں سمٹو......
اور ''ضبط'' یوں اپناؤ کہ بس اسے پکڑے، پکڑے پتھر
کے ہو جاؤ، تماش بین منتظر رہ جائیں...... اور مجرم
سرکنے نہ پائے......'' اس کی ماں حسین تھی اور وہ سمجھتی
رہی کہ اس نے اپنا حسن ان سے چرایا ہے...... مگر

سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ اس کو
ساری خوب صورتی اس نے دان کی ہے وہ اب بھی
اپنی تصویروں جیسے تھے...... پنک، ہینڈسم، ڈیسنٹ،
صحت مند، ہشاش، بشاش اور متاثر کن شخصیت کے
مالک...... وہ ایک پل کو سحر زدہ رہ گئی...... وہ بھی بالکل

ویسی ہی تھی...... اپنے باپ جیسی...... مما نے اسے کبھی
آگاہ نہیں کیا تھا مگر اسے پیار کرتے ہوئے اکثر
آنکھیں نم کر لینا...... اس پر سارے راز آشکار کر گیا۔ وہ
ایک جوان بیٹی کے باپ نہیں لگتے تھے...... مگر وہ تھے،
تبھی تیزی سے جان گئے...... لاریب کو خوشی بھی ہوتی

تو کس بات کی......؟ ان کی مرجھائی رنگت دیکھ کر اسے
دکھ بھی ہوتا تو کیوں ہوتا؟
رات خود میں ڈھیروں سیاہ فریب چھپائے،
مکار بلی کی طرح پھسکڑا مار کر دھرتی پر بیٹھ رہی
تھی...... لاریب ضبط کے کٹھن مرحلوں سے گزرتی پتھر

ہو رہی تھی۔

"آپ کے ساتھ کچھ ہوا ہے بیٹا...... آپ ٹھیک نہیں لگ رہے......؟" وہ ہزار بار پوچھ چکے تھے، وہ ہزار بار خاموش رہی، ان کا لہجہ شیریں تھا...... اگر زہر بھی ہوتا تو اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔

"مجھے کسی کی فکر کی ضرورت نہیں......" وہ دیکھ کر رہ گئے۔

"بیلا کے ساتھ رہتے ہو آپ......؟"

"ڈاکٹر رابیل کے ساتھ...... ہمیشہ سے۔"

"اس نے آپ کو اپنے پاس رکھا......؟" وہ حیران نہیں ہوئے لہجہ پست تھا۔

"ظاہر ہے...... بے حس کوئی...... کوئی ہوتا ہے......"

اس نے ایسے کہا کہ وہ کئی پل کچھ بول ہی نہیں سکے۔

"بیلا نے شادی نہیں کی؟" وہ یونہی سوال کرنے لگے...... وہ لاریب کو پاس بٹھائے رکھنا چاہتے تھے۔

"شادی کی تھی...... سزا آج تک کاٹتی ہیں......"

انداز سرسری تھا...... وہ ندامت میں ڈوبے۔

"پلیز بیٹا لاتعلق مت بنو...... میں باپ ہوں تمہارا......"

"پر میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں......"

"جھوٹ مت بولو......" وہ غصے میں آ گئے۔

"آپ کی سچائی پر میں کیوں یقین کروں؟"

"کیونکہ تم میری بیٹی ہو......"

"آپ کے پاس کوئی گارنٹی ہے؟" پھر وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ لاریب کے چہرے پر سرخ ریت اڑ رہی تھی...... کان کی لوئیں تپ رہی تھیں...... وہ خود کو بار بار باور کروا رہی تھی...... اسے پرسکون رہنا ہے، اس کا سامنے بیٹھے شخص پر کوئی حق نہیں...... اس کا اپنے باپ سے کوئی واسطہ نہیں۔

"تم بہت ناراض ہو مجھ سے؟"

"ناراض ہونے کے لیے رشتے، تعلق کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔" لاریب نے جتا دیا...... اس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہیں...... وہ بس دھاڑیں مار، مار کر رونا چاہتی تھی۔

"ہمارا رشتہ ہے...... بہت گہرا تعلق ہے۔"

"میں کسی چیز کو نہیں مانتی......" وہ ہمیشہ کے لیے انکاری تھی۔

"مجھے بیلا کے پاس لے کر جاؤ...... میں جانتا ہوں وہ تمہیں سمجھا لے گی، میں اولاد کے لیے بہت ترسا ہوں بیٹا...... کوئی نہیں جانتا کہ باہر سے خوب صورت انسان اندر سے کیسے تیل و نیل ہے۔ اولاد نہ ہونے کا احساس مجھے دیمک کی طرح چاٹتا جا رہا ہے...... اولاد کی پیاس میرے اندر زہر پھیلاتی جا رہی ہے...... مجھے آج خدا نے تم سے صرف اس لیے ملایا ہے کہ میں اس زہر کا تریاق کر سکوں...... ورنہ تو مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ میں تم سے کبھی مل پاؤں گا...... مجھے سمجھو بیٹا...... میں نے کوئی اتنا بھی بڑا گناہ نہیں کیا کہ......"

"اوہ واقعی......" ہونٹ گول کرتے وقت اس کی آنکھوں میں کرب ابھرا...... "کوئی یہ بھی تو نہیں جانتا کہ اندر سے تیل و نیل اور باہر سے خوب صورت شخص نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے...... دل توڑنے کا گناہ...... مگر احساس کیوں ہو کہ یہ عام سی بات ہے، ہے ناں......"

وہ دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ ہر چیز دھندلا رہی تھی۔

"میں مجبور تھا...... میرے والدین بیلا کو کبھی نہ اپناتے۔" وہ مردہ لہجے میں بولے۔ جو سوال رابیل نے کبھی پلٹ کر نہیں کیے تھے وہ بدلا ان کی اپنی بیٹی لے رہی تھی۔

"آپ تو اپنا چکے تھے...... آپ نے کیوں چھوڑا؟"

لاریب کو لگا بہت ہو چکا۔ وہ پھر نہیں بن سکی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑنے والی ہے۔ شکل ایسی ہی لگ رہی تھی۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں...... میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا...... میں بیلا سے معافی مانگنے پر تیار ہوں...... جیسا تم کہو ویسا ہوگا...... بس میرے ساتھ چلو، میں تب بہت بے بس تھا اور......"

"اور اب کیوں بے بس ہیں...... جائیں تیسری شادی مبارک ہو......؟" لاریب کا دل چاہا قہقہہ لگائے۔

"نہیں نہیں......" وہ اب بھی بے بس تھے۔

"کیوں، کیونکہ وہ آپ کی خاندانی بیوی ہے اور بیلا لاوارث تھی؟" اب کی بار اس کے لفظوں نے قہقہہ لگایا اور قہقہہ دور تک بکھر گیا...... لاریب پھسکڑا مار کر دھرتی پر بیٹھی مکار بلی جیسی ہو گئی۔

"مان کیوں نہیں لیتے یہ آپ کی سزا ہے...... اور سزا کے زہر کے لیے کوئی تریاق نہیں بنا......"

"ایسا مت کہو...... مجھے وقت سے پہلے ہی بے موت مت مارو...... مجھے تمہاری ضرورت ہے......" وہ "تمہاری" پر زور دے رہے تھے۔ اس پر جملوں کے کوڑے برس رہے تھے۔

"وقت ایسا سفاک ہے کہ شاہی تخت الٹ دیتا ہے...... بادشاہ کو فقیر بنا دیتا ہے۔ ہمیں آپ کی ضرورت تھی۔ آپ بادشاہ بن گئے...... آج آپ بے بس ہیں، ہمیں آپ کی ضرورت نہیں......" تخت واقعی الٹ چکے تھے، وقت بہت سفاک تھا...... بلکہ خون آشام......

"تم بیٹی ہو میری...... میرا حق ہے تم پر......" وہ اب تک کا ضبط توڑ کر جیسے دھاڑے تھے۔ لاریب کے چہرے پر طنز بکھرا...... تختے پھولے چکے......

"میں آپ کی بیٹی نہیں...... میں "بنت رابیل" ہوں۔"

☆☆☆

"محبت" دل کے صحن پر سے جدائی اوڑھ کر اترے...... تو دل کی دھرتی تیزی سے سیم اور تھور کا شکار ہو جاتی ہے۔

دل کے شیشے جیسی سرزمین پر ننگے پاؤں چلتی جائے...... تو ٹھنڈے بیچے زمین پر لہو رنگ نشان چھوڑتی جاتی ہے وہ بھی تاحیات......

پورے فلیٹ پر سیاہی کی چادر سے گہری اداسی لپٹی پڑی تھی۔ جنم دن منظر کا تھا...... کیک سعد سے کٹ گیا...... پورے دن کی خوشی نے بری طرح اپنی کشش کھوئی تھی...... سعد دوستوں کو بلانے والے آئیڈیے سے خود ہی بری طرح پچھتایا۔ منظر سارا وقت کمرے میں بند رہا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں...... وہ گھر

رہیں......‘‘ سعد مسکرا، مسکرا کر خوش دلی کا مظاہرہ کرتے بری طرح اکتا گیا، سب کو رخصت کر کے وہ کمرے میں گیا تو سر میں درد اور طبیعت پر بوجھل پن چھایا تھا...... اس کی فیملی کچھ دنوں میں شہر شفٹ ہو رہی تھی...... وہ منظر کی وجہ سے یہیں رک گیا۔

’’کیا یار...... اتنی اداسیاں کیوں پھیلا رکھی ہیں؟‘‘ منظر کو دیکھتے ہوئے وہ خفا ہوا، منظر کی آنکھیں بوجھل تھیں۔

’’وہ میری کال نہیں اٹھا رہی...... پینتیس، چالیس، میسجز کا بس ایک جواب......‘‘ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی...... ’’میں نے اسے دھوکے میں رکھا...... اس کے دل سے میری محبت بے دخل ہو گئی ہے......‘‘ وہ خشک ہونٹوں کے ساتھ ہنسا...... آہ والے انداز میں...... دل چیرتی ہنسی۔

’’یہ کہا اس نے......؟‘‘ سعد کی نگاہیں اٹھیں، منظر کا سر اثبات میں ہلا، سعد کا سر جھکا پھر جھکا ہی رہا۔

’’اسے میری بات سننی چاہیے تھی......‘‘ منظر نے سرگوشی کی۔ سعد اس کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملا سکا...... وہ چپ چاپ منظر کی کیفیت سمجھتا کچھ سوچتا رہا...... یہاں تک کہ جب اسے ہوش آیا منظر کہیں بھی نہیں تھا...... کمرے، واش روم، چھت، ٹیرس، کچن، پورا فلیٹ کہیں بھی نہیں...... دو گھنٹے بعد بھی اسے منظر کی واپسی کا منظر دکھائی نہیں دیا تو وہ چپ چاپ لاریب کے گھر کو جاتے راستے پر خاموشی سے چل دیا۔

دس، پندرہ منٹ کی واک کے بعد اس نے دور سے دیکھا...... پھر وہیں ٹھہر گیا...... ان کے گھر کے آگے سڑک پر لاریب کے بیڈ روم کی کھڑکی کو دیکھتا وہ پوری ثابت قدمی، ہٹ دھرمی اور سکون سے ٹہل رہا تھا...... دھیرے، دھیرے سینے پر ہاتھ باندھے مگر مستقل...... یقیناً دو گھنٹوں سے...... اور نہ جانے کب تک...... خاموشی سے سارا منظر دیکھتا وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا...... پھر لب بھینچ کر الٹے قدموں چلتا واپس مڑ گیا۔

☆☆☆

آم کے درختوں پر پھل بے تحاشا پھوٹ آیا تھا...... سبز پتوں والی ٹہنیاں سبز، سبز چھوٹی امبیوں سے نیچے کی سمت جھک آئی تھیں...... کئی جگہ تو امبیوں پر سنہری رنگ اتر آئے تھے۔ دیکھنے والوں کے منہ پانی سے بھر، بھر جاتے...... آموں کے باغات سے اٹھتی بھینی، بھینی مہک ہوائیں سارے جہاں میں پھیلائے رکھتیں۔ تیز گرمیوں کے باعث بھری دوپہروں میں سندر نگر کی ناریاں باغوں میں جھولے نہیں ڈالتی تھیں...... مگر آموں کے ستائے پتوں کی سیج میں بیٹھی کوئل دیر تک کوکتی جاتی...... اگر یہ ساون کو بلانے کے بہانے نہیں بھی تھے تو بینا کے گیتوں میں چھپا سوز، کئی دل کھولتا، چیرتا یوں لگتا کسی کی یاد میں کرلائے جاتی ہے...... بھرے باغوں کی ویرانیوں سے گھبرا کر کسی کو بلائے جاتی ہے...... ہاں...... دل کے لیے بینا کے گیت جہاں لوری تھے...... وہیں ایک بے کلی بھری دوپہروں میں چھا جاتی...... سنہری دھوپ نے تیزی سے گندم کی فصلوں کے سب ہی سبز رنگ چرا کر پیلے رنگ ہر سو پھیلا دیے تھے...... سونے کے پاتوں جیسے سنہری رنگ ہر سمت دھمال ڈال رہے تھے...... ہر موسم کے ہر رنگ سندر نگر کے حسن تھے...... ہر موسم کا اپنا الگ سماں ہوتا تھا۔

شفاف نیلے آسمان سے اترتی زرد کرنیں، ندی کے صاف، شفاف ٹھنڈے پانی پر کئی رنگ پھیلاتی...... مثالی، دھوپ میں بھی یہاں آنے سے کوئی نہیں کتراتا...... سندر نگر کے نخلستان کے منظر تھے...... وہاں خوشبو میں مٹھاس تھی۔

ظہر کا وقت ذرا سا سرکا تھا...... مانو نماز پڑھ کر باہر آئی تو جی بھر کر حیران ہوئی...... نیم کے پیڑ تلے دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر ٹھوڑی تلے دیے وہ ساکت بیٹھا زمین کو گھور رہا تھا...... مانو آہستگی سے چلتی اس کے قریب آئی۔

’’منظر تم...... کب آئے...... بتایا بھی نہیں......؟‘‘ وہ لہجے میں تھوڑی حیرانی لیے دھیرے سے بولی...... منظر اس کے سوال پر پہلے چونکا پھر ایک سانس اندر کھینچتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔

’’بس کچھ دیر پہلے...... تم نماز پڑھ رہی تھیں......‘‘ اس کی آواز کہیں اندر سے آئی...... مانو انگلیاں چٹخاتی غور سے اسے دیکھنے لگی۔

’’اچھا شبنم بھی نہیں بتا کے گئی...... کہ تم آئے ہو......‘‘ ’’گھر میں کوئی نہیں تھا اور نیم کے درخت پر چڑیاں بھی خاموشی اوڑھ کر بیٹھ گئی تھیں...... مانو نے سکوت سے گھبرا کر کہہ دیا۔

’’اسے میں نے ہی منع کر دیا...... میں نے تم سے بات کرنی تھی......‘‘ منظر کے محتاط انداز میں بلا کی سنجیدگی بھری ہوئی تھی۔ مانو کچھ بھی سمجھنے سے قاصر رہی۔

’’کہو ناں...... کچھ پیو گے...... بادام کا شربت لاؤں؟‘‘ اسے اچانک احساس ہوا...... معمول سے بڑھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ وہ لبوں پر زبان پھیر کر بولی...... نیم کے پیڑ کے اوپر سورج آگ برسا رہا تھا...... خاکستری چڑیوں کو وحشت ہوئی...... فضاؤں میں خاموشی اتری ہوئی تھی۔

’’کچھ بھی نہیں...... بس میں تم سے کچھ پوچھنے آیا ہوں......‘‘ وہ چارپائی سے کھڑا ہو گیا...... چڑیاں پتوں میں پھدکیں...... منظر کے مرجھائے چہرے پر سیاہی کی تہہ پھیلی تھی۔

’’کیا پوچھنا ہے......؟‘‘ نظریں زمین پر گاڑے وہ بدقت پوچھ پائی۔ وہ جانے کیا جاننا چاہ رہا تھا...... مانو کو اپنا دل پسلیوں کے خول میں اچھلتا محسوس ہوا۔

’’یہاں نہیں باہر چلو......‘‘

’’باہر......؟‘‘ وہ اس کی انوکھی فرمائش پر حیرت زدہ رہ گئی...... منظر نے ہنوز سنجیدگی کے پردوں میں اسے دیکھا...... محبت پھڑ پھڑانے لگی...... جیسے کسمسائی ہو۔

’’گھر سے باہر...... گاؤں سے باہر نہیں......‘‘ اس سارے عرصے میں اس کے ہونٹوں نے مسکراہٹ کو نہیں چھوا...... مانو ہلکا سا شرمندہ ہوتی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ سنہری کرنوں کا جال دور تک بکھرا ہوا تھا...... اور سنہری جال سے جھلساتی تپش پھوٹ رہی تھی۔ وہ دونوں گرمی کے احساس سے عاری ہو کر سنہری راستوں پر چل رہے تھے، بھری دوپہر میں مانو کو منظر کا ساتھ دلفریب لگا...... اس نے خود کو دھوپ سے چمکتی گندم کی بالیوں کے جیسا پایا...... محبت ’’کندن‘‘ ہوئی...... عشق کندن سے بڑھ کر...... جھلساتی دھوپ میں بارش کی پھوار پڑی...... اس کی پیشانی پر شفاف ان چھوئے قطرے جڑ گئے۔

’’کل میری سالگرہ کا دن تھا......‘‘ چلتے، چلتے منظر نے ٹاہلی کے درخت کو پکڑ کر اس سے کہا...... اگر نہ کہتا تو بھی وہ بھولی نہیں تھی...... دونوں طرف سے کھڑی گندم کی فصلیں کسی مصنوعی منظر جیسی ساکت تھیں۔ مانو اس کے بولنے پر ہمہ تن سماعت ہوئی۔

’’کل میں اتنا خوش تھا کہ...... کبھی کسی سالگرہ کے موقع پر نہیں ہوا ہوں گا......‘‘ اس نے مانو کی خاموشی پر مزید کہا تھا۔ مانو کے لبوں کو دھیمی سی ہنسی نے چھوا...... وہ خوش ہوئی۔

’’مگر پھر اچانک ہی کہیں سے یک دم بھونچال آ گیا......‘‘ اس کی اگلی بات پر وہ بری طرح چونکی...... دل بری طرح دہلا تھا...... منظر نے درخت ہلایا۔ ٹاہلی نے خشک پتے نچھاور کر دیے......

’’کیا ہوا منظر......؟‘‘ اس نے چہرے کی اڑی رنگت کے ساتھ پریشانی سے پوچھا۔ منظر نے اس پر نظر ڈالی۔ پھر اس منظر سے نظریں چرائیں۔

’’تمہیں پتا ہے میں کسی سے محبت کرتا ہوں۔‘‘ اس کی آنکھوں میں سرخی پھیلی اور آواز بھرتی ہوئی لگی...... مانو جواب نہیں دے سکی تو آنکھوں میں الجھن بھر لی۔

’’مجھے نہیں پتا کہ ایسا کیوں، کیسے اور کہاں ہوا...... مگر مجھے محبت ہوئی...... مجھے تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتنی...... کیونکہ محبت کو ناپنے کے لیے ابھی تک کوئی پیمانہ نہیں بنا نہ ہی بن سکے گا کہ اس کی کوئی حد نہیں ہوتی...... یہ جذبہ محدود نہیں ہوتا تو میری محبت کیوں حد بناتی پھرتی؟‘‘ ایک پل کو چپ ہو کر اس نے سوالیہ انداز میں مانو کی سمت دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دوستانہ نرمی چھائی ہوئی تھی...... ٹاہلی کی ٹہنیاں ہلکی، ہلکی ہل رہی

تھیں...... گندم کی سنہری رنگت جیسی بانو کے چہرے پر گلابیت بکھر رہی تھی...... یہ حیا کی سرخی تھی۔

"مجھے ہمیشہ سے علم رہا ہے کہ میں خوش نصیب انسان ہوں...... اس لیے میری محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ وہ بھی مجھے بلکہ مجھ سے بڑھ کر چاہنے لگی...... اور پتا ہے مجھے تو علم بھی نہیں تھا تب سے وہ مجھ سے عشق کر رہی تھی...... ہم دونوں جب ساتھ ہوں تو کسی تیسرے کی ضرورت نہیں پڑتی...... ہم ایک دوسرے کے بغیر ہر طرح سے مکمل ہوتے ہوئے بھی ادھورے ہیں...... اور ہم کبھی بھی کسی بھی صورت میں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے......"

وہ پُرسکون تھا...... آنکھوں میں ابھرتی نمی کے باوجود پُرسکون رہا...... بانو کی حالت خراب ہونے لگی تھی...... وہ کبھی یوں منظر سے باہر آ کر ایسی باتوں کی عادی نہیں تھی۔ وہ منظر کو چاہتی تھی تب بھی اتنی بے تکلف نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی باتوں پر خوشی کا اظہار کرتی۔

اس نے لب بھینچ کر گستاخ ہنسی پر بند باندھے......

منظر سنجیدہ تھا مگر وہ اپنے اس کزن کو پھر بھی اچھی طرح جانتی تھی...... وہ چند گھنٹے پہلے گاؤں پہنچا تھا اور بنا دھوپ کی پروا کیے اس سے ملنے آ گیا تھا۔ بانو کی نظریں اوپر کو اٹھیں...... اور پھر اٹھی کی اٹھی رہ گئیں...... منظر کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثر ٹھہرا تھا...... بانو کے لیے ناقابلِ فہم رہا۔

"لیکن تمہیں معلوم ہے...... کل میں نے اپنا وجود کھو دیا......" اس نے آہستگی سے کہا...... نگاہیں۔ تاحدِ نگاہ پھیلی گلابی فصلوں پر بھٹک رہی تھی۔ گندم کی بالیوں پر کانٹے اگنے لگے...... بانو نے ہنسی سمیٹ کر اسے دیکھا...... اس کی ٹوٹتی آواز ٹوٹے کانچوں کے شور جیسا ماتم لیے ہوئے تھی...... آنکھیں زخمی، زخمی، ٹوٹے کانچ بانو کے دل میں چبھے......

"ایسے کیوں کہہ رہے ہو منظر؟" بانو کا دل بری طرح لرزا۔ پیشانی پر پڑی بارش کی پھوار جو محبت کی تھی...... پریشانی میں بدل گئی۔ قطرے چبک کھونے لگے۔

"کیا غلط کہہ رہا ہوں؟" منظر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا...... گہری سنجیدگی بانو کی آنکھوں میں چبھی...... دل پر قیامت برپا ہو گئی تھی۔

"جو کہہ رہے ہو...... سادہ الفاظ میں کہو...... میں پہیلیاں بوجھنے سے قاصر ہوں......" اس نے بیچارگی سے کہا۔ چہرے سے روہانسی لگ رہی تھی۔

"پہیلیاں تو مجھے الجھا رہی ہیں...... یہ تم نے لکھا ہے؟" منظر نے اچانک قمیص کی جیب سے سفید کاغذ نکال کر آنکھوں کے سامنے لہرایا...... بانو الجھی...... سلجھی...... پھر اندھی ہوئی...... منظر کے لہجے سے چھلکتی برہمی اس کی خوشی کے بلبلوں کو پوری قوت سے پھوڑ گئی۔

"کک...... کیا ہوا؟" جس لمحے سے وہ کئی سالوں خوف کھاتی آئی تھی...... وہی وقت کتنے سفاک انداز میں اژدہا بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ سفید سوٹ میں سرخ چہرہ لیے منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گول، گول گھوم رہا تھا۔

"یہ خط تم نے مجھے کیوں لکھا ہے؟" سوال نہیں تھا...... آگ میں جلتا سریا تھا۔ بانو پر پڑا...... تو وہ زمین میں گڑ گئی...... ٹاہلی کی شاخیں سیاہ پڑ کر نیچے کو جھک آئیں۔

"کیا مطلب کیوں لکھا...... میں تمہیں خط نہیں لکھ سکتی؟" وہ بلبلائی تھی۔ آنکھوں میں بے یقینی کے سرخ ڈورے لیے، وہ کوشش سے زیادہ نہیں بول پائی تھی۔ آموں کے پیڑ پر بیٹھی بلبل دم سادھ گئی...... منظر ساکت ہوئے تو گندم کی بالیوں کو آگ نے پکڑا۔

"لکھ سکتی ہو...... مگر اس طرح لکھنے کا میں کیا مطلب سمجھوں؟" وہ سرد لہجے میں نہیں بول رہا تھا وہ ہر جذبے پر ضبط، باندھے ہوئے تھا مگر بانو کو پروا بھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بھاپ اگل رہی تھیں۔

"ایسے کیوں کہہ رہے ہو تم...... کیا مجھے رلانے کے لیے لائے ہو یہاں...... میں جا رہی ہوں۔" وہ بس رونا چاہتی تھی...... پھوٹ، پھوٹ کر رو دینے والی ہو رہی تھی۔ اسے لگا منظر مذاق کر رہا ہے...... مگر ایسا مذاق اس کی برداشت کی حدوں سے پرے تھا...... بہت پرے...... اگر وہ ابھی ہنس بھی دے گا تو وہ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

"میری بات کا جواب دیے بغیر تم کہیں نہیں جا رہی ہو بانو...... تم نے کیوں مذاق کیا میرے ساتھ...... شادی...... محبت کیا ہے یہ سب؟" منظر آگے ہوا...... لہجہ سخت ہوا، بانو سہمی...... ٹاہلی کی شاخیں چاروں اور سے زمین پر جھکیں...... منظر تاریک ہو گیا، بانو سیاہی میں ڈوب گئی...... وہ یک دم سناٹے میں آ گئی تھی۔

"شادی...... محبت...... مذاق......؟" اس نے انگارے اپنے لبوں سے اگلے...... ہواؤں کا گرم ترین جھونکا اس سے ٹکرا کر اسے دو قدم پیچھے لے گیا...... وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اس "اجنبی" شخص کو دیکھنے گئی۔

"مجھے بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا...... کس کی ایما پر کیا...... تمہیں احساس ہے تم نے مجھے میری محبت سے دور کر دیا ہے...... مجھے خود سے دور کر دیا ہے......" کوئل کے پُرسوز گیت میں بلند ہو کر اس کی آواز بانو کی سماعتوں میں اتری...... وہ ایک پل کو تھم گئی...... صامت فضاؤں میں منظر کے جملے دیر تک گردش کرتے رہ گئے...... وہ جملوں کی گتھی میں الجھ گئی...... "کیا اسے میرا خط لکھنا ناگوار گزرا......؟ اس لیے وہ محبت سے دوری کی بات کر رہا ہے؟ اتنی سی بات...... بس اتنی سی......؟"

"منظر تمہیں برا لگا میرا خط لکھنا؟ میں نے تو تمہاری خوشی کا سوچ کر لکھا...... تم یہ نہ سمجھو کہ تم ہمیں یاد نہیں......" اس نے کچھ پُرسکون ہو کر وضاحت دی تھی۔ آواز میں پریشانی کم، ہلکی سی شرمندگی شامل تھی۔

"سب ٹھیک ہے بانو...... سب ٹھیک...... مگر مجھے بتاؤ تم نے اندر ایسا کیوں لکھا جیسے ہم دونوں بہت قریب ہوں...... ایک دوسرے کو خطوط کے تبادلے کرتے ہوں، یہ سب لکھنے کی ضرورت کیا تھی؟" وہ نرمی جھٹکتے ہوئے جھنجلا کر بولا۔ لہجے میں برہمی چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ بانو حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھے گئی۔

"تو میں نے غلط کیا لکھا...... تم غصہ کس بات پر ہو؟"

"کس بات پر......؟" وہ ہکا بکا ہوا۔ "تمہیں ذرا بھی احساس نہیں......" بانو نے اسے صدمے سے چور ہوتے ہوئے دیکھا۔

"منظر ایک منٹ......" اس نے گرم پڑتی اپنی پیشانی کو چھوا۔ "تم بات کو بنا کسی سر پیر کے بڑھا رہے ہو...... اگر تم پہلے کسی سوال کو کیے بغیر معاملہ بیان کر دو گے تو مجھے لگتا ہے یہ ہم دونوں کو آسانی فراہم کرے گا۔" بانو کا لہجہ ٹھنڈا تھا مگر منظر کو تپتی دوپہر سے بڑھ کر گرم لگا۔ وہ بری طرح سلگا۔

"مجھے بہت حیرت ہے کہ تم اس قدر انجان کیسے نظر آ سکتی ہو...... تم نے مجھے اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی...... تمہیں اگر خط لکھنا ہی تھا تو اس میں ایسا واہیات مذاق لکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی تمہیں...... تمہارے اس خط نے میرا دل اجاڑ دیا...... تمہارا وہ خط مجھ تک پہنچنے سے قبل لاریب کے ہاتھ آ گیا...... اس لڑکی کے ہاتھ جسے میں بہت عزیز رکھتا ہوں، جسے اپنے دل کے قریب رکھتا ہوں...... تمہارے ان الفاظ سے وہ غلط فہمی کا شکار ہو کر مجھ سے دور چلی گئی ہے...... میں کل سے ایک پل نہیں سو سکا اور تم اتنے سکون سے الٹے سوال کر رہی ہو...... اگر لاریب میری زندگی سے نکل گئی تو میں تمہاری اس حرکت پر تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا......"

پیلی دھوپ کی تمازت اس قدر بڑھ رہی تھی کہ گندم کی بالیوں پر جیسے مٹی کا تیل چھڑکا گیا...... اور ایک شعلے سے چنگاری اڑ کر دور تک گئی...... فضائیں ہواؤں سے عاری تھیں...... پھر بھی گندم کی فصلوں سے بھڑکتے شعلے تیزی سے بانو کے قدموں تک آئے، وہ اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ آگ دو قدم آگے رہ گئی...... بانو پھر بھی زمین پر نہیں تھی...... زمین پیروں میں کہیں نہیں تھی۔

"تم، تم مذاق کر رہے ہو ناں......؟" وہ بے ربط سی ہو کر تین قدم آگے ہوئی۔ آگ کے شعلے قدموں سے لپٹنے لگے تھے اور کالی آنکھیں وحشت کے احساس

سے چھنے گی تھیں...... وہ سفید رنگت کے ساتھ سوالیہ نشان بنی اسے تک رہی تھی۔ منظر کے لیے اس کی حیرانی توقع کے برعکس تھی۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں دن کے ایسے پہروں میں تم سے ایسے مذاق کرنے آؤں گا؟" اب وہ سوال بن گیا تھا۔ قوت گویائی گویا چھن گئی اور خاموشیاں اندھی ہو کر اردگرد بکھرتی گئیں۔ مانو کی کالی آنکھوں میں زندگی میں پہلی بار کالا پانی آیا...... اور پہلی بار وہ اپنی سماعتوں سے شکوہ کناں ہوئی۔

"تو پھر ایسے کیوں کہہ رہے ہو؟" اسے ایک جملہ بولنے کے لیے پورا دماغ کھنگالنا پڑا...... "تمہیں اندازہ ہے تم کتنا غلط بول رہے ہو...... لاریب، کون لاریب......؟ تم تو کسی کو نہیں جانتے...... تم تو مانو کو جانتے ہو ناں...... تم صرف مانو کے منظر ہو۔ پھر تم میرے سامنے کسی اور کا نام لینے کا گناہ کیسے کر سکتے ہو...... ہاں......؟" آنکھوں میں سرخی بھر کر وہ جنونی انداز میں پوچھ رہی تھی...... آم کی اونچی ٹہنی پر بیٹھی کوئل نے فضاؤں میں سوز بکھیرتے گیت واپس لیے، مانو کے سوال میں چھپا کرب...... آنکھوں میں لہراتا ہر اس اسے آنکھیں موندنے پر مجبور کر گیا۔ شورتا جال گونگے تھے...... خاموشی اندھی رہی۔

"تم کیا کہہ رہی ہو...... ہوش میں تو ہو......؟" منظر کے سر پر دھماکا ہوا تھا...... وہ ششدر سا اسے دیکھنے لگا...... مانو کے چہرے پر حیرت کے سب ہی جہاں تھے۔ اس کی آنکھیں پھٹی تھیں...... لب کھلے تھے، منظر چاہ کر بھی ہل نہیں سکا۔

"ہوش میں آنے کی تمہیں ضرورت ہے...... تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کسی کا نام جڑا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی...... پھر تم مذاق میں بھی کیسے؟" اس کا گلا رندھ گیا...... وہ حواسوں سے بیگانی لگ رہی تھی...... منظر ایسا کیسے کر سکتا تھا...... وہ مانو کا دل کیسے توڑ سکتا تھا؟ آگ کے شعلے اس کے قد کی اور بڑھنے لگے...... آنسو کے راستے سے الاؤ سنہری آنسو کی شکل

میں اس کے چہرے پر تشدد کی زردی پر گرا...... منظر پر اس لمحے بہت کچھ عیاں ہوا...... ایسا "بہت کچھ......" کہ مزید کی طلب بے معنی رہی......

"ایک محبت...... حسن نظر...... ایک عشق...... حسین فریب......"

"دو وجود...... ایک ذات...... دو دل...... ایک قصہ...... محبوب، فریب...... بے خانماں محبت......" آگ بھڑک رہی تھی...... بھڑکتی جا رہی تھی۔

"مانو......" منظر کے لیے اپنی آواز بے حد اجنبی تھی...... بے یقینی کو توڑ کر وہ دشواری سے کہہ رہا تھا...... "مانو...... تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے......"

"کیا؟" مانو نے سادگی سے دوبارہ پوچھا۔ اس کے لیے اپنی سماعتیں قابل اعتبار نہیں تھیں۔ وہ بے بس ہوگئی...... بے بس ہی ہونا تھی...... وقت کو اس پر اختیار تھا...... اس کو وقت پر نہیں......

"غلط فہمی...... کیسی؟ محبت میں غلط فہمی کی گنجائش کہاں ہوتی ہے؟" آگ سے اس کا وجود سیاہ ہو رہا تھا...... وہ مٹی سے راکھ ہو رہی تھی...... وہ آگاہی کا وقت تھا...... ایک سفاک وقت تھا...... خون آشام سے لمحے تھے...... اس کا وجود موم کے مانند پگھل رہا تھا۔ پگھل، پگھل کر زمیں بوس ہو رہا تھا۔

"ہمارے درمیان ایسا رشتہ کب رہا ہے مانو......؟" اس نے تکلیف سے کہا۔ یہ منظر کے لیے زندگی بھر کا سب سے بڑا دھچکا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ صورت حال یوں بھی ہوگی...... وہ تو بس اپنے جواب لینے آیا تھا...... اسے خبر نہیں تھی کہ اس کا کشکول ہی ٹوٹ کر گر جائے گا...... سامنے کھڑی سنہری لڑکی اجنبی نہیں تھی...... مگر احساسات اجنبی تھے...... الگ، الگ...... مانو کے اوپر منظر کا سوال بہت کاری گزرا...... وہ تڑپی، جلتی آگ میں پھڑ پھڑائی۔

"تت...... تم مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو منظر...... تم؟ تمہارے دو روپ کیسے ہو سکتے ہیں...... تم نے...... تم نے خود اعتراف کیا تھا، تم نے مانا تھا اس رشتے کو......

اس رشتے کی گواہ میں اکیلی نہیں...... تمہاری خود کی بہن شبنم بھی ہے...... پھر تم مجھ پر الزام کیسے لگا رہے ہو؟"

پکی فصلوں پر اب بھی پگھلا ہوا سونا انڈیلا جا رہا تھا...... فصلوں کے سروں پر گلابی پن پھیل رہا تھا...... اور کہیں دور سے آموں کے باغات کے پرے سیاہ دھواں آسمان کی سمت اٹھ رہا تھا...... فضا میں تازہ گڑ بننے کی خوشبو پھیل رہی تھی...... اس خوشبو میں کڑواہٹ گھل رہی تھی۔

"فار گاڈ سیک مانو، کیا جو منہ میں آ رہا ہے بولتی جا رہی ہو...... میں تم سے محبت کا رشتہ نہیں رکھتا...... میں نے کبھی ایسا اعتراف نہیں کیا...... تم کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو...... میں صرف لاریب کو چاہتا ہوں...... تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ تم میری بہن جیسی ہو...... اور میں نے ہمیشہ تمہارے لیے ایسا ہی محسوس کیا ہے...... کیا میں نے تمہیں کبھی کچھ کہا؟ کوئی ایسا اشارہ...... کوئی ایسا پروف جس سے تمہیں احساس ہوا ہو؟ اس کے باوجود تم یہ سب کیسے سمجھ بیٹھیں؟" وہ سختی سے نہیں کہہ رہا تھا، وہ بے اعتنائی سے بھی نہیں کہہ رہا تھا...... وہ تو بس شاکڈ تھا...... اور شاکی لہجے میں کہہ رہا تھا...... ہاں ایک راز ہوا جو عیاں ہوا...... ایک حقیقت ہوئی...... جو آشکار ہوئی...... سفاک حقیقت، مانو کے وجود کے بہت پاس، پہاڑوں میں دبا آتش فشاں پھٹا...... منظر نے بڑے آرام سے اس کے دماغ میں ہینڈ گرنیڈ رکھ کر اس کی پن کھینچ لی...... اور مانو کے وجود کے پرخچے اڑنے میں دو سیکنڈ بھی نہ لگے...... اس کا بے رنگ پڑتا وجود، سیاہ دھوئیں کے حصار میں چکرانے لگا...... دوپہر میں آگ لگی تھی...... وہ گنگ سی جھلستی جا رہی تھی۔

"بہن جیسی......" الفاظ جو ایک طمانچہ تھے، بازگشت بن گئے...... سندر نگر کی سندر دوپہر میں محبت کا سندر فریب بے حد سندر انداز میں ایک چھناکے سے...... بلکہ زوردار دھماکے سے ٹوٹا تھا...... محبت زادی حقیقت کی دنیا میں کھڑی تھی...... نہیں وہ پاتال میں جا پڑی تھی۔

"مانو...... تمہیں کیسے اتنی بڑی غلط فہمی ہوئی؟" وہ بہت تکلیف سے پوچھ رہا تھا۔ چہرے پر انتہا کی...... بے بسی...... وہ سناٹے میں کھڑی اسے دیکھے جا رہی تھی...... ٹک ٹک دیکھتی جا رہی تھی۔

"کچھ بول دو...... پلیز کچھ تو بولو......" وہ اس کی خاموشی سے عاجز ہو کر بولا...... مانو کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی، وہ بے یقینی میں پور، پور بھیگی ہوئی تھی۔

"تم، تم...... جھوٹ بول رہے ہو ناں......؟" وہ بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہو پائی، اس کی آواز کانپ رہی تھی...... ٹاہلی کا درخت دھیرے، دھیرے ہلنے لگا۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گا......؟"

"تو تم سچ بھی نہیں بول رہے......" اس کی آواز پھٹ پڑی...... بس نہیں چل رہا تھا کہ دنیا اجاڑ ویران کر دے...... وہ بنا آگ کے جل رہی تھی...... آگ نے اسے چھونے سے انکار کر دیا......

"سچ میں نے بتا دیا ہے۔"

"وہ سچ نہیں ہے۔" وہ چلا ہی پڑی تھی مگر آواز پھر بھی دور تک نہیں پہنچ سکی...... آم کی اونچی ٹہنی پر بیٹھی بلبل کے گیت ماتم میں بدلنے لگے...... اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ آنکھوں میں دھند چھا رہی تھی۔

"تم، تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے...... تم ایسا کہہ بھی کیسے سکتے ہو...... تمہاری باتیں، تمہاری وہ ڈائری کے الفاظ...... میرا خط میرے جذبات سب ہی کچھ تو تم جانتے ہو پھر...... پھر......" اس کے الفاظ گونگے ہوگئے...... آواز گم ہوئی، وہ چکرا کر گرنے والی تھی۔

"کون سا خط...... کون سی ڈائری......؟" منظر کا دماغ بھک کر کے اڑا...... ایسے انکشافات اس پر بہت گراں گزرے تھے، مانو کا دل ذلت کے گہرے احساس سے بھرتا گیا، وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھنے سے بھی قاصر تھی۔

"مانو...... مجھے نہیں معلوم کہ یہ کب، کیوں، کیسے

ہوا...... مگر میں نے ڈائری میں صرف لاریب کے لیے اپنے احساسات لکھے ہیں...... کیا وہاں تمہارا ذکر بھی تھا......؟ تمہارا نام بھی......؟''

وہ صدمے سے پوچھ رہا تھا، فصلوں پر بکھری آگ صرف بانو کے لیے نہیں رہی تھی...... اس نے جلتی آنکھوں کو حرکت دی...... وہ منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بیچارگی کو پڑھ رہی تھی۔ وہ سن تھی...... اور منظر کہتا تھا کہ وہ بے قصور ہے...... وہ لاعلم ہے...... تب ہی...... تب ہی تو...... سارے قصور اسی کے تھے...... وہ بے مول رہ گئی...... اس کی محبت یک طرفہ تھی...... یک طرفہ یعنی...... بے اہمیت...... بے اہمیت زیادہ مناسب تھا کہ یک طرفہ بھی تب کہا جاتا ہے جب دو طرفہ ہونے کی امید ہو...... امید نظر کی آخری حد پر بھی نہیں تھی...... جواب تھا صفر......

سنہری دھوپ ٹاہلی کے سبز پتوں پر چھن، چھن کر برس رہی تھی اور گڑ کی خوشبو زہر سے بدتر ہو رہی تھی...... شور ایسے گونگے ہوئے کہ خاموشیوں نے ہمیشہ کے لیے اپنے ٹھکانے ڈھونڈ لیے تھے...... پیلی دوپہر ہمیشہ کی طرح بانجھ تھی...... اور سورج کے زیرِ عتاب جھلستی جا رہی تھی۔ وہ سب سمجھ گئی تھی...... مزید کچھ باقی نہیں رہا تھا...... ایک خنجر اس کے دل میں گڑا تھا اور لہو تیزی سے بہتا جا رہا تھا...... پوری ہمت جمع کر کے وہ مڑی تو یوں لگا منوں بوجھ اس کے کندھوں پر پڑا ہوا ہو۔

''بانو، میری بات سنو......'' اس نے التجا سے پکارا، وہ اسے تکلیف دینے کا باعث تھا اور اسے اس تکلیف سے نکالنا چاہتا تھا...... مگر کیوں؟ جب وہ خود ہی اس اذیت سے چھٹکارا نہیں چاہتی تھی۔

پورے سندر نگر کا چکر کاٹ کر آئے پرندے اس کی پشت پر ایک، ایک کر کے آگ اگلتی فصلوں پر گرنے لگے...... وہ اپنی کالی آنکھوں میں زرد رنگ دیکھ رہی تھی...... موت جیسی دھند دیکھ رہی تھی...... وہ جا رہی تھی...... وہ مر چکی تھی، یہ تھی محبت...... ایک دھوکا...... ایک سراب...... ان دیکھا فریب...... اور محبت چاہے محبت ہو کہ فریب...... سراب ہو، دھوکا یا یقین...... تب بھی ایک

آگ ہے...... ایسا طوفان جو اڑائے تو بے سائبان کر دے۔ جلائے تو بے نشاں کر دے......

☆☆☆

''دکھ اگر زہر ہو تو...... آنسوؤں سے ''تریاق'' کر لینا چاہیے...... آنکھوں سے زہر بہا دو...... اٹھو تو مضبوط بن کر...... مضبوطی جو ثبت ہو...... اپنے اسی دکھ کو طاقت بنا لو تب بھی ٹھیک......''

رابیل عثمان نے اپنی زندگی سے کیا سیکھا......؟

''محبت غلطی نہیں...... محبت روٹھ جائے تب بھی آپ کو ایسا تحفہ ضرور دے جاتی ہے...... جس سے آپ کو سانسیں ملتی رہیں...... جو آپ کی زندگی کا سہارا بن جائے......'' اور بنت رابیل کو محبت نے سکھایا۔

''محبت سمندر جیسی گہرائی رکھتی ہے...... جتنا مرضی ڈوبتے جاؤ...... مگر ایک وقت میں یہ جتا بھی دیتی ہے...... یہ محبت ہے سمندر جیسی...... جتنی بھی کر لو...... سوائے لہروں کے شور اور کھارے پانی کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا......'' دونوں کا معاملہ ایک تھا...... رائے مختلف...... کچھ ایسی بھی مختلف نہیں تھی کہ اگر گہرائی میں جایا جائے تو...... خیر......

اس دن ڈی جی خان کے شفاف نیلے آسمان کو گہرے سرمئی بادلوں نے گھیر رکھا تھا...... بادلوں سے پہلے سورج حدت اگل رہا تھا...... بادلوں کے بعد حبس عود آیا...... اور بارش ہونے پر دہشت ہی وحشت......

دوپہر کے سے شام کا گمان ہوتا تھا...... ہوا بھیگی ہوئی تھی اور فضاؤں کی ساری کثافت دھو رہی تھی...... وقفے، وقفے سے سفید چمکتی دہکتی ٹیڑھی لکیر سرمئی بادلوں پر دور تک قریب سے پھیلتی...... پھیل کر مٹ جاتی، آسمانی بجلی کے دھاڑنے پر بادل سہم کر آنسو بہا رہے تھے۔

نمی، نمی بارش کی پھوار میں پور، پور بھیگتا وہ گھر خود پر اداسی طاری کیے کھڑا تھا۔ خاموشی اس پر پوری شان سے راج کر رہی تھی...... لاریب صحرا کے جیسے چہرے کے ساتھ سوسن کی لبوتری کلیوں پر اترتی بارش کو

کے برابر میں بیٹھی مما ستا ہوا چہرہ لیے، بہت تکلیف سے گزر رہی تھیں اس کی خالی آنکھوں میں جمی بارش کو دیکھ رہی تھیں...... بارش میں بھیگے کالے کوے نچڑے ہوئے لباس کے ساتھ لان کے درختوں پر سکڑے، سکڑے بیٹھے تھے۔

''اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟'' ڈاکٹر رابیل نے نارمل لہجے میں سکوت کو توڑتے ہوئے دریافت کیا...... آج سے پہلے کبھی انہیں یہ گھر سنسان نہیں لگا تھا۔ لاریب خواب سے جاگی۔

''بادل دیکھ رہی ہوں...... کاش ہم بادلوں جیسے ہوتے...... برس کر ہلکے پھلکے ہو جانے والے...... ہر بوجھ سے آزاد......'' وہ ضبط سے جواب دے کر لب کاٹنے لگی...... آنسو پھسل کر پلکوں پر بیٹھ رہے تھے۔

''پھر تم اس دنیا میں کیسے آتیں لاریب...... میرے پاس......'' وہ افسردگی سے ہنس رہی تھیں۔

''یہ دنیا بہت بری ہے، بالکل اچھی نہیں مما......'' وہ پوری دنیا سے خفا لگ رہی تھی۔ ضبط کے باوجود رو دینے کو تھی۔

''جانتی ہو لاریب، بادل برس، برس کے ہلکے پھلکے نہیں ہو جاتے...... یہ ان کی آزادی نہیں ہے بلکہ برستے، برستے وہ خالی ہوتے رہتے ہیں...... اور پھر خالی پن سے بھر جاتے ہیں...... یہ خالی پن بہت خطرناک ہوتا ہے میری جان...... کسی بھی انسان کی مرگ کا یہ سب سے زہریلا ذریعہ ہے...... اور تمہارے پاس ابھی سب کچھ ہے...... تمہاری ماں تمہارے ساتھ ہے۔'' وہ نرمی سے کہہ رہی تھیں لاریب نے سر اُن کے شانے پر ٹکا دیا...... سرمئی بادل خاموشی سے برستے، برستے اندر سے خالی ہو رہے تھے۔

''میں ہار گئی ہوں مما...... میں خالی رہ گئی ہوں......'' سرمئی بادلوں کے سفید قطرے اس کی آنکھوں میں اترنے لگے۔

''ہارنا اتنا آسان نہیں لاریب......'' وہ آنسو پیتے ہوئے اس کی بات کی نفی کر رہی تھیں...... لاریب

چپ چاپ آنسو بہاتی رہی......

''دنیا کے سارے مرد ایک جیسے ہیں...... دل توڑنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔''

''منظر ایسا نہیں ہے۔''

''پاپا کے بارے میں بھی یہی رائے رہی ہوگی آپ کی......'' وہ خفگی سے کہہ کر سیدھی ہو گئی۔ بارش کی بوندیں کھڑکیوں کے شیشے پر پڑ کر پھسل رہی تھیں۔ باہر کا منظر دھندلا تھا...... ہلکے، ہلکے شور میں ہوائیں دھمال ڈالتی پھر رہی تھیں۔

''میں نے منظر کی آنکھوں میں تمہارے لیے پیار دیکھا ہے...... تمہارے پاپا کی الگ بات ہے۔'' انہوں نے نظریں چرائیں۔

''وہ پیار دھوکا تھا...... یہ دنیا قابلِ یقین نہیں ہے......'' وہ لب بھینچ کر کراہ اٹھی...... وہ رونا نہیں چاہتی تھی...... وہ ''بہادر لڑکی'' ہے...... آنسو تو خود بخود ہی...... ان کو اور کیا کام......

''تم غلط کر رہی ہو، اسے ذمے دار مت ٹھہراؤ...... تمہیں اس کی بات سننی چاہیے...... ورنہ اذیت میں رہو گی......'' ان کے لہجے میں تاسف تھا، لاریب انہیں بھی منظر سے بات نہیں کرنے دے رہی تھی۔ پل بھر کو سارے میں سکوت چھایا...... بارش کا شور تیز ہوا۔

''اور کیا سنوں مما؟ سب کچھ تو صاف ہو گیا...... اب اس کی وضاحت سنوں؟ معذرت قبول کروں اور اپنے راستے الگ کر لوں...... مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے...... آپ جتنا......''

''لاریب ہماری بات الگ تھی۔''

''الگ ہی تو نہیں ہے...... آپ نے بھی محبت کے نام پر سزائیں جھیلیں، میں پھر بھی اسی محبت سے باز نہیں آئی...... آپ کہتی ہیں میں سمجھدار ہوں، عقل مند ہوں مگر سچ کہتے ہیں عشق کا ''ع''، عقل کے ''ع'' کو کھا جاتا ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے...... عشق کا عین ''عذاب'' کے عین کو دعوت دیتا ہے، میں اس کی

عذاب کے حصار میں ہوں۔"

وہ رو رہی تھی...... بے قابو ہو کر بلک رہی تھی......

ڈاکٹر رابیل اسے دیکھے گئیں، وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھیں مگر لاریب کے آنسو اعصاب شکن تھے۔

"لاریب تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں...... سنبھالو خود کو...... اتنی مایوسی اچھی نہیں ہے...... کوئی اور بات ہوگی ورنہ منظر فلرٹ کرنے والا لڑکا نہیں ہے...... اتنی بے اعتمادمت ہو......" انہوں نے کئی بار کی کہی بات ایک بار پھر دُہرائی۔ ایک بار پھر وہ بات بے اثر گئی۔

"یہ بس تسلیاں ہیں جن کا کوئی وجود نہیں...... آپ کیوں بھول جاتی ہیں کہ آپ کی امیدیں بھی رائگاں گئی تھیں۔" وہ کچھ تلخ ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے بری طرح گھورا۔

"تم کیوں بھول جاتی ہو کہ منظر اور تمہارے باپ دو الگ، الگ انسان ہیں۔"

"مجھے کسی پر یقین نہیں......" تلخی اس کے بھیگے چہرے پر گکال کی صورت بکھری ہوئی تھی۔ بارش اب بھی برس رہی تھی...... مگر تیزی کا زور ٹوٹا تھا۔ سرمئی بادلوں کا رنگ اڑا اڑا سا تھا اور سنبل کے پتے دور تک بکھرے ہوئے تھے...... ٹھنڈی فضا میں بیلوں کی مہک بھری تھی۔

"میں کیسے یقین کروں کہ تم نے اپنے باپ سے بدتمیزی نہیں کی؟" وہ ناراض ہو کر بولیں...... لاریب نے زکام زدہ سانس اوپر کھینچی۔

"کیونکہ میں نے نہیں کی...... میں خوش اخلاقی سے پیش آئی۔" اس نے معصوم صورت بنائی۔

"خوش...... اخلاقی......؟" انہوں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"جی میں نے کہا...... مجھے پہچاننے میں دقت تو نہیں ہو رہی؟"

"اور......"

"اور کہا...... نائس ٹو میٹ یو......"

"اور......؟"

"اور یہ کہ کبھی آیئے ناں...... "فورٹ منرو......" گھوم آتے ہیں......" لاریب کے منہ بنانے پر ان کی ہنسی چھوٹ گئی...... لاریب منہ پھلائے بیٹھی تھی اور ہنستے، ہنستے ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ ان کا دل اداسی کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ وہ بھی اپنی بیٹی کے دل میں دبی کسک اور ادھورا پن نہیں برداشت کر سکتی تھیں...... وہ ان خوابناک آنکھوں میں حسرت بھری نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ لاریب شاید نہیں جانتی تھی...... مگر وہ جانتی تھیں...... انہیں خود پچھ کرنا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے میں یقین کروں گی......؟" وہ ہنسی کو دبا گئیں...... لاریب کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔

"شک کریں گی...... تو شک، یقین کو کھا جائے گا......" وہ تیزی سے بولی پھر چونکی۔

"اوہ تو مس لاریب...... آپ خود پر یہ فارمولا اپلائی کیوں نہیں کر رہیں؟" بات اچک کر ماچک کر بولی تھیں...... لاریب جھاگ کے مانند بیٹھ گئی۔ وہ ایک پل میں ساکت ہوئی تھی...... بادل خالی ہو کر ایک آدھ قطرے ٹپکا رہے تھے...... اور بھیگے لباس میں کونجیں قطار کی صورت آسمان کی وسعتوں میں سفر کرتی جا رہی تھیں۔ صحرا میں تپتی دوپہر کا دور دور تک نام و نشان مٹ چکا تھا۔ اور خاص چپ کے پودوں پر بہار اتر آئی۔ بھورے، پانی میں تر کھڑکھڑاتے پتوں کے سنگ خوشبوئیں دور تک سفر کر رہی تھیں۔

"میں ہار نہیں مانوں گی ممّا...... میں اس سے دست بردار نہیں ہو سکتی...... وہ میرے لیے قصۂ زیست کی طرح ہے...... وہ مجھے کھو نہیں سکتا......" اس کا چہرہ خشک تھا اور انداز اٹل...... فضاؤں میں خوشگواریت تھی۔ بارش کے باعث، سبز بیلوں کی اوٹ میں چھپی قرمزی تتلیاں باہر نکل، نکل کر اوپر ہی اوپر محو پرواز ہو گئیں......

☆☆☆

کون سی رُت تیرے نام لکھوں

مارچ کھلا، کھلا سا کہ اپریل ڈھلا، ڈھلا سا

مئی کی اگتی ہوئی دھوپ کہ جون کا چبھتا ہوا سکوت

کون سی رُت تیرے نام لکھوں

سندر نگر کے بیچ میں کچے گھر کی در و دیوار سے سناٹا آکاس بیل کے مانند لپٹا ہوا تھا...... دو دن قبل ہوئی بارش کے سبب صحن کی مٹی بیٹھ چکی تھی...... مگر اسی بارش کی دین ہلکی، ہلکی ٹھنڈک، دھوپ کی تپش میں بدلتی جا رہی تھی۔

ڈھلی دوپہر کے پہلے کا سے تھا...... ہلکی ہلکی لو چلتی پورے صحن میں چکر لگاتی...... پھر مٹی کی دیواروں سے ٹکرا کر پاش، پاش ہو جاتی...... دوبارہ سے اٹھنے میں کئی لمحے بیت جاتے...... خاکستری چڑیوں کے لیے یہ موسم ایک قہر کی طرح تھا...... شاہ خاور آنکھیں کھولے آگ اگل رہا تھا اور خاکستری چڑیاں نیم کے پیڑ پر لٹکی پانی کی پیالیوں میں ڈبکی لگاتی تھیں...... دھوپ کی حدت سے زمین کا سینہ انگاروں کی طرح تپتا تھا، پاگل کوے ایسی دوپہروں میں سائیں، سائیں کرتے پھرتے......

اور ایک وہ تھی...... دھوپ چھاؤں کے احساس سے عاری...... گرمی، سردی سے یکسر بے نیاز...... بھوک، پیاس، آرام، تھکن، سکون سے بیگانی...... آنکھوں میں ویرانی اور لبوں پر بس ایک چپ...... اور چپ بھی تو ایسی لگی تھی کہ بولتے، بولتے تھک جاؤ...... وہ چپ ہوئے نہ تھکتی...... بولتے ہوئے بھی تو نہیں تھکتی تھی...... ایک دم اتنی بڑی تبدیلی......؟ اماں حیرت زدہ تھیں...... ابا اور ادا اس سے بڑھ کر متحیر...... کہاں طوطے کے جیسے راگ الاپتی مانو...... کہاں سنجیدہ، سنجیدہ تول، تول کر لفظ نکالتی مینہ...... بات ہضم بھی ہوتی تو کیسے......؟ پہلے روز چکر لگتا تھا جامن کے پیڑ والے گھر میں...... اب نظریں بھی وہاں نہ پڑتیں...... نہ یہ وہاں نہ شبنم یہاں...... داخلہ ہی بند...... اماں نے بہت دیر نوٹ کیا...... پھر مجبور ہو کر ادھر کو آئیں۔

"مانو کا شبنم سے جھگڑا ہوا ہے تو...... ؟" مانو

خاموش، صرف سر دائیں بائیں ہل گیا۔

"پھر کیا بات ہے...... جاتی کیوں نہیں اُدھر؟"

"دل نہیں کرتا......" اس نے بول ہی دیا، اماں کی ناک پر انگلی جا رکی...... مانو اس حیرت کو دیکھنے کے لیے رکی نہیں۔

ایک وقت تھا کہ اماں اس کی کاہلی کی داستانیں زمانے کو سناتیں...... اب یہ حال تھا کہ اماں اس کی پھرتی پر دہل جاتیں...... ایسی دل جمعی، ایسا پھرتیلا پن......؟ خدا خیر کرے......

وہ جس کام کو ہاتھ لگاتی پھر کرتی ہی جاتی...... اماں سہمے دل کے ساتھ حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہتیں...... اولاد چھوٹی ہو تو الگ پریشانیاں، جوان ہو تب بھی فکریں...... مائیں دونوں وقتوں میں بے بس ترین مخلوق......

ہنسنا بولنا تو بند ہوا ہی...... بھوک پیاس نیند بھی مر گئی...... اماں کا دھیان کسی نقطے پر اٹکا تھا...... مانو سویرے، سویرے ہی گلاب کے کھیتوں اور کچی گلی کے پھولوں پر شبنم دیکھنے جاتی تھی...... کافی وقت پہلے سے...... مگر پہلے تو سب ٹھیک تھا...... لیکن کون جانے...... معصومیت کا کوئی وقت ویلا؟ خوشبوؤں پر تو یوں بھی جنات وغیرہ نثار رہتے ہیں...... اماں کا ہاتھ لرزتے دل پر جا رکا۔

اور آج...... سنہری دھوپ کے رنگوں سے دور وہ پرانے سے کاغذ پر چاپ چاپ لکھتی جا رہی تھی۔

کون سی رُت تیرے نام لکھوں......

جولائی کا سر چڑھتا ہوا سورج کہ

اگست میں غلامی کا ڈھلتا ہوا سورج

اماں اسے دیکھ رہی تھیں...... دیکھتی تو ہر وقت اسے ہی تھیں...... چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب آئیں، صحن میں تندور کے دہانے سے آگ کے شعلے سنہری دھوپ کی شعاعوں کی سمت لپک رہے تھے۔

"مانو...... بھوک نہیں لگی؟" انہوں نے محبت سے پکارا، مانو کو جھٹکا لگا، خوفزدہ سی ہو کر اٹھی تھی۔

"کک...... روٹی بن گئی؟" وہ جانے کیوں

حواس باختہ تھی...... سانسیں یوں پھولی تھیں جیسے سو میل دور سے بھاگ کر آئی ہو...... اماں سب دیکھ رہی تھیں، سمجھنے سے قاصر تھیں۔

"بس وہی بتانی ہے...... تو......"

"میں...... بس ابھی بتاتی......" وہ بات کاٹ کر بولی پھر تیزی سے باہر نکلی۔

"ارے سن......" انہوں نے روکنا چاہا مگر وہ جا چکی تھی...... بے بسی اماں کے چہرے سے صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

کون سی رُت تیرے نام لکھوں
ستمبر میں جنم لیتی کوئی خواہش کہ
اکتوبر میں پیار کی بارش

لرزتے، تھرکتے ساز اس کے آس پاس بکھر رہے تھے۔ خیالوں، خیالوں میں کھوئی اس نے روٹی لگانے کے لیے ہاتھ تندور میں ڈال دیا...... تندور کی گلابی چنگاریاں ابھی آگ بھڑکا رہی تھیں...... اس پر کسی نے جیسے تیزاب پھینک دیا...... ہلکے سے جھٹکے پر ہاتھ باہر آیا...... ہاتھ کی جلد سرخی چھلکا رہی تھی اور وہ نارمل کھڑی تھی...... دور سے دیکھتی اماں بھاگ کر اس کے پاس آئیں...... اس کا ہاتھ جل چکا تھا۔

"مانو......" تکلیف جانے کس بات کی تھی؟ اماں سے برداشت نہیں ہوا تو پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑیں۔

"تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے مانو...... تو، تو انگارہ چھونے سے بھی ڈرتی تھی پھر آج اتنی تکلیف کیسے برداشت کر گئی؟ بتا اپنی ماں کو...... ایسی کون سی بات ہے جو تجھے یہ سب سہنے پر مجبور کر رہی ہے...... بول۔" ان کی آنکھوں میں آنسو تھے...... اسی کی وجہ سے آنسو...... وہ کتنی ہی دیر دیکھتی رہی......

"اماں یہ زندگی ہے...... آپ کہتی ہیں ناں پہاڑ جیسی...... تو اگر تکلیفیں سہنے کی عادت نہ ڈالیں تو پہاڑ کیسے سر ہوگا؟" اس کی پلکیں جھکی رہیں...... اور چہرے پر سپاٹ تاثرات چھائے رہے، اماں کا دل گہری کھائی

کون سی رُت تیرے نام لکھوں
نومبر کی ساری رعنائیاں کہ
دسمبر کی تنہائیاں

وہ اماں کو کیا بتاتی...... اس نے بولنا ترک کر رکھا تھا کیا اسے اپنا راز آشکار کرنے سے خوف آتا تھا...... وہ راز جو درختوں، فصلوں، پرندوں اور دوپہروں نے سنا...... پھر سدا کی طرح صامت ہو گئیں...... وہ نظریں نہیں اٹھاتی تھی کہ شرمندہ تھی...... ایک، ایک سے...... یا شاید خود سے...... وہ خود سے بیزار تھی، ہر ایک چیز سے اکتا گئی تھی...... اس لیے کہ دل مردہ ہو گیا تھا...... اور اس کا اندر مرگھٹ بن گیا۔

ایک اور بے کیف ساون اختتام پذیر ہو گیا...... پژمردہ سی شام سسک، سسک کر اس کے سامنے دم توڑ گئی۔

شب کی تاریکی سندر نگر کی بستی کو خود میں جذب کیے کھڑی تھی...... سیاہ رات میں سرگوشیاں کرتے چاند کی حالت اس سے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ کالے پانی کی جیسی رات، سیاہی میں گھلی چاندنی، ہوا کہیں جنگلی جھاڑیاں اوڑھے سو رہی تھی۔ کچھ دیواروں کے پرے پیلے سرسوں کے پھولوں کی باسی مہک پورے صحن میں پھیل رہی تھی...... وہ اندر چارپائی پر لیٹی تھی اور چھوٹی، چھوٹی روشنیوں والے جگنو چوکھٹ سے جھانک کر واپس پلٹ رہے تھے...... آج کچھ زیادہ ہی روشنیاں تھیں گویا جگنوؤں کی بارات اتری ہو...... صحن بھرا، بھرا لگتا تھا، منڈیریں چمکتی تھیں...... وہ لاتعلق سی پڑی رہی۔

"مانو......" کمرے کی تاریکی میں مردہ سچ کے ساتھ اس کے نام کی پکار گونجی...... زخم خوردہ انداز...... یہ پکار جگنوؤں کی تو ہرگز نہیں ہوگی...... اس نے سر اٹھا کر دیکھا...... پھر سر جھکا دیا...... چوکھٹ میں اس کی سہیلی کھڑی تھی...... عزیز ترین دوست......

"مانو میری طرف دیکھو......" وہ آہستگی سے چلتی ہوئی چارپائی کے قریب زمین پر بیٹھ چکی تھی...... مانو بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی...... تاریک کمرے

"ناراض ہو مجھ سے؟" بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا...... ایک سسکی لبوں سے آہ کی صورت نکل کر کمرے کی سرد تاریکی میں دم توڑ گئی...... مانو میں مڑنے کی سکت نہیں تھی۔

"میں جانتی ہوں...... میں تمہاری مجرم ہوں...... بلکہ صرف میں ہی مجرم ہوں......" وہ بے آواز روتے ہوئے کہہ رہی تھی...... بھیگے لہجے کے علاوہ کمرے کی تاریکی اور چوکھٹ سے جھانکتے جگنو اس بات کے گواہ تھے، تکلیف میں مانو ہی نہیں...... اس سے جڑے لوگ بھی تھے۔

"میں نے سب کے ساتھ بہت برا کیا...... تمہارا اور بھائی کا دل توڑا...... میں گناہ گار ہوں...... میں جھوٹی ہوں، بہت بری ہوں مگر...... مگر میرے دل میں میل نہیں ہے مانو...... میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے......" چارپائی کے بازو تھامے وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی...... منظر نے یقیناً اس سے باز پرس کی تھی۔ یا شاید پورے گھر والے یہ بات جان چکے تھے...... وہ آنکھیں موندے پڑی رہی...... وہ بے حسی میں ایسا نہیں کر رہی تھی...... بات یہ تھی کہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"تم مجھے جو سزا دینا چاہو میں اسے فخر سے اپنا انعام سمجھوں گی...... کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گی، بس ایک بار مجھ سے بات کر لو......" رات کی سیاہی بہت بوجھل ہو کر ان پر گزر رہی تھی...... گن، گن کر سانسیں لیتی مانو کی آنکھیں جل اٹھیں...... وہ سزا ہی تو نہیں دے سکتی تھی...... دے دیتی تو اسے کیا حاصل؟ ختم ہوئے تو بہت وقت گزر چکا...... قصہ جاری تھا سو زیست رواں تھی...... وہ زندہ تھی۔

"تم میری بات نہیں سننا چاہتی مگر میں پھر بھی کہوں گی...... میں نے کسی حسد، جلن میں تمہیں چوٹ ہرگز نہیں پہنچائی...... میں جانتی تھی تم دل میں بھائی کے لیے کچھ پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہو۔" وہ بوجھل

جگنوؤں کی بارات ابھی لوٹی نہیں تھی...... اور یہ رات دونوں پر بہت گراں گزر رہی تھی۔

"میں یہ بھی جانتی تھی کہ بھائی کی شادی تمہارے ساتھ ہی ہونی ہے کہ یہ ہمارے بڑوں کا فیصلہ تھا...... میں نے شرارت میں آ کر تمہیں بھائی کے جذبات سے آگاہ کر دیا اور تمہارے چہرے پر آتے گلال...... مانو قسم لے لو میں دل سے تمہاری خوشی چاہتی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی...... تمہارے چہرے کی بس وہ ایک چمک...... وہی چمک دیکھنے کے لیے تم سے جھوٹ بولتی گئی۔"

وہ اب ہچکیوں کے درمیان ناہموار لہجے میں اسے اپنے جھوٹ کا بتا رہی تھی...... اور حقیقت جاننے کے باوجود بھی مانو کے دل پر ایک، ایک لفظ برچھی کی طرح پڑ رہا تھا۔ اس کی مجرم اس کے سامنے تھی...... اور ستم کی انتہا تھی کہ وہ کچھ ایسی بھی مجرم نہیں تھی......

"میں مانتی ہوں کہ بھائی اس بات سے تاحال لاعلم رہا...... مگر مجھے کبھی اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا...... اگر تم اسے چاہنے بھی لگی تھیں تو یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی...... آخر بھائی نے بھی تمہاری طرف ہی لوٹنا تھا مجھے کیا تھی خبر کہ......" وہ ہچکی لے کر خاموش ہوئی...... پھر کتنی ہی دیر سارے میں سناٹا چھایا رہا...... جھینگروں کی بھن، بھن سماعتوں کے بہت قریب گونجتی تھی۔

"اور پھر غلط فہمی کا شکار تو میں بھی ہو گئی...... تب جب بھائی کی ڈائری کے صفحات پڑھے...... میں بھی جیسے ایک دم سارے راستے سہل ہو گئے ہوں...... بھائی بھی تم سے اتنا پیار کرتا ہے جتنا تم...... پھر جانے کیسے سب ہوتا چلا گیا...... میں سمجھ نہ سکی کہ بھائی کا دل کہیں اور مائل ہو جائے گا...... میں کبھی تمہارے جذبات انہیں نہیں بتا سکی......" وہ شاید رو کر تھک چکی تھی تب ہی آواز قدرے خشک معلوم ہو رہی تھی۔

"میں نے صرف تمہارے اور بھائی کے رشتے کو لے کر تمہارے دل میں محبت ڈالی تھی...... میں تمہاری گناہ گار ہوں، مجھے معاف کر دو۔"

مانو نے خاموشی سے اسے راکھ میں دبی چنگاریاں پھرولنے دیں...... اور اب وہ چپکے سے وہ راکھ اڑتی دیکھ رہی تھی، جگنو باہر جل رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں بجھ رہے تھے...... جیسے جل ہوئے تھے ہتھیلیاں سلگ گئی تھیں۔

''کیا مجھ سے بھی بات نہیں کرو گی......؟ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں مانو...... تمہارے ساتھ مزید کچھ برا نہیں ہوگا...... بھائی اب بھی تمہارے ہیں...... تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کرسکتے وہ......'' شبنم کی بات پر آنسو کا پھندا اس کے حلق میں پھنس گیا...... وہ بری طرح تڑپ اٹھی تھی۔

''اس کے ساتھ زیادتی کرسکتا ہے وہ؟'' وہ بھرائی آواز میں بولی تھی...... تاریک کمرے کی فضا نے پہلی بار اسے سنا...... شبنم کچھ لمحے کے لیے سناٹے میں رہ گئی۔

''تم اس کا کیوں سوچ رہی ہو؟''

''کیونکہ میں ایک چوٹ کھائی انسان ہوں...... خود کو درد میں دیکھ کر خود غرض بن جاؤں......؟ جاؤ شبنم جاؤ...... تمہاری کوئی غلطی نہیں...... میں خود کی خود مجرم ہوں...... میں نے کیوں نہیں سوچا کہ کسی کے کہتے رہنے سے محبت نہیں ہوجاتی...... مجھے ایک نئے فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش مت کرو...... ابھی چلی جاؤ یہاں سے۔'' وہ ایک ہاری ہوئی انسان تھی۔ تھکے ہارے انداز میں کہہ رہی تھی...... شبنم بے بسی سے لب کاٹتی اسے دیکھتی رہی...... پھر اٹھ کر باہر نکل گئی۔

''کسی کے کہہ دینے سے محبت نہیں ہوجاتی...... یہ فریب ہے جو ٹھوکر دیتا ہے...... مانو اپنی مجرم خود ہے......'' اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی...... چارپائی پر پڑی کھجور کی چٹائی، انگاروں کی طرح دہک رہی تھی...... وہ پوری طرح پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔

''یا اللہ......! اسے میرے دل میں ڈالنے والا تو تھا...... اب اسے میرا مقدر بنادے...... یا پھر میرے دل سے نکال دے۔''

مضطرب انداز میں اس نے دوبارہ کروٹ لی...... اور آنکھوں کے کونے سے کتنے ہی موتی ٹوٹ کر شب کے سیاہ آنچل میں گم ہوگئے۔

☆☆☆

بوگن ویلیا کی گلابی بیل آدھی دیوار پر پھیلی اونگھ رہی تھی۔

اس روز ڈی جی خان کے نیلے امبر کا رنگ مٹیالا ہورہا تھا...... اور پیلی دھوپ سے دھرتی پر زردی بکھری تھی۔

شاہ خاور کی عمر رسیدہ شعاعوں میں ہلکی سی نرمی...... مگر بلا کی گرمی تھی...... اس کے باوجود لان میں پھولوں کی کیاریوں میں پھول اس قدر کثرت سے کھلے تھے کہ تعداد اور رنگوں میں ان کا شمار ناممکن تھا...... حدت کے باعث سارے میں مرجھائے پھولوں کی باس پھیلی ہوئی تھی...... یہ گرمیوں کے چلچلاتے دن تھے...... سورج کی آنکھیں بند کرنے اور ڈوب جانے کے بعد بھی شام کی ہتھیلی اور ان گنت لمحے صحرا کی بھاپ اڑاتی ریت پر جیسے تڑپتی رہتی تھی...... درختوں اور چرند پرند کو جھلسا دینے والی بھاپ......

ان سے پرے تفاخر سے کھڑے اس خوب صورت بنگلے کا ماحول باہر کی نسبت قدرے ٹھنڈا اور پُرسکون تھا...... کاریڈور میں داخل ہونے پر اندر بیٹھا سعد دور سے نظر آرہا تھا...... اور سعد کے سامنے صوفے پر بیٹھی لاریب یاسیت کا شکار لگتی تھی...... دونوں کے مابین سکوت طاری تھا...... جو تھوڑے، تھوڑے وقفے بعد ٹوٹ کر ازسرِنو چھا جاتا تھا۔

''تم بھی یہی کہنے آئے ہو...... کہ میں نے غلطی کی؟''

''نہیں...... تم نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے......''

''تو میں غلط ہوں؟''

''شاید نہیں......'' سعد نے رسان سے کہا......

''لاریب غلط تو منظر بھی نہیں...... وہ اس بات سے سراسر بے خبر تھا......''

''میں کیسے یقین کرلوں......؟'' وہ سر جھٹکتے ہوئے بے یقینی سے بولی۔ ''یہ سب اچانک نہیں ہوا...... وہ جانے کب سے...... اور......'' دکھ کی شدت سے اس سے بولا نہیں گیا...... سعد پُرسکون انداز کے ساتھ گلاس میں بھرے شربت کو تک رہا تھا۔

''منظر کے لیے اچانک ہی ہوا ہے لاریب...... وہ تم سے زیادہ شاکڈ ہے۔''

''میں جانتی ہوں کتنا......'' اس نے طنزیہ کہا...... سعد اس کا اشارہ بھانپ رہا تھا۔

''تمہیں میری بات کا یقین نہیں......؟'' سعد نے پوچھا۔

''سچ بتاؤں سعد...... نہیں...... سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد شک کی گنجائش نہیں ہے...... وہ خط صاف ظاہر کرتا تھا...... ان کے تعلق کو...... اور تم کہتے ہو......'' وہ ناراضی سے کہہ کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔ سعد کا سر اثبات میں ہل گیا۔

''ہے ناں......؟ سچ بھی یہی ہے......'' سعد نے پُراسرار تاثر دیتے ہوئے آہستگی سے کہا...... لاریب چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''مطلب......؟'' اس کی خوب صورت پیشانی شکن آلود ہوگئی...... سعد نے جوس کا سپ لیا۔

''وہ خط صاف، صاف ظاہر کررہا تھا منظر اور مبینہ کی محبت کو......''

''تو تم مان رہے ہو؟'' لاریب کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''بالکل...... وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں...... اور بے حد کرتے ہیں۔'' لاریب آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ہونٹ چبارہی تھی۔ آنکھوں کے گوشے ڈھیرے ڈھیرے چھلکنے لگے۔

''مجھے یہ جان کر اچھا لگا......'' سعد نے بنا نظریں چرائے کہہ دیا۔

''سعد......'' وہ ہلکا سا احتجاج کرتے ہوئے شکوہ کناں ہوئی۔

''اور جانتی ہو...... یہ حقیقت نہیں ہے...... کبھی، کبھی آنکھوں دیکھا سچ بھی تحقیق ایک غلط فہمی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا......'' لاریب رونا بھول کر اس کا چہرہ تکنے لگی...... وہ کیا کہہ رہا تھا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ اس کے یوں رنگ بدلنے کو کوئی نام دینے سے قاصر تھی......

''میری بات تحمل اور ٹھنڈے دماغ سے سنو لاریب...... تم میرے لیے بہن کی طرح ہو اور منظر میرا عزیز دوست...... میں نہیں جانتا کیا صحیح ہے کیا غلط مگر مجھے لگتا ہے کہ میں جو کررہا ہوں وہ کسی قسم کے نقصان کا باعث نہیں بنے گا...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے نہیں معلوم آگے حالات کیا موڑ لیں...... مگر جو میں جانتا ہوں، وہ عیاں کردینا ضروری سمجھتا ہوں......''

وہ کچھ بھی کہہ دینے سے پہلے سنجیدگی سے تمہید باندھتے ہوئے کہہ رہا تھا...... اور زخم خوردہ لاریب منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتی جارہی تھی۔

''دیکھو لاریب...... میں زیادہ کچھ تو نہیں جانتا مگر جو تمہیں بتانے لگا ہوں وہ ضرور تمہیں منظر کو...... بے قصور ماننے پر مجبور کردے گا...... کیونکہ قصور تو شاید میرا بھی ہے...... اور سب سے بڑھ کر قسمت کا......'' وہ ہولے سے پھیکا سا مسکرایا۔

''پتا ہے لاریب...... مبینہ نے جو آخری خط لکھا وہ تمہارے ہاتھ آیا...... اسی طرح اس نے جو پہلا خط لکھا وہ میں نے موصول کیا تھا......'' سعد کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی...... اور لاریب کی آنکھوں میں ابھی تک الجھن تیرتی دکھائی دیتی تھی۔

''یہ اتفاق ہے کہ آج تک منظر کے گھر سے اماں جان کے جتنے بھی خطوط آئے ہیں وہ سارے مجھ سے ہو کر گزرے ہیں کیونکہ منظر یونیورسٹی سے واپسی پر جاب پر چلا جاتا ہے جو کہ تم جانتی ہو...... اور خط عموماً اسی ٹائم ملتے ہیں...... اکثر تین بجے کے قریب...... ایک دو بار ایسا ہوا کہ اماں جان کے خط بھول جانے پر میں کئی گھنٹے بعد یاد آنے پر منظر کے حوالے کیا کرتا تھا مگر اس شام......''

اس نے گہری سانس لی اور ایک پتھر کی بے جان مورتی پر ڈالی...... سارے ماحول میں ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔

''وہ خط میرے لیے بیک وقت حیرت اور مسرت کا باعث تھا...... اتنی محبت اور اتنی چاہت سے گندھا وہ محبت نامہ...... سچ پوچھو تو مجھے سحر زدہ کرنے کے لیے کافی تھا...... میں سمجھا منظر بھی اپنی کزن سے

محبت کرتا ہے اور میں اسے چھیڑنے کا بھی پورا، پورا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس شام میں اپنے گھر جانے کے لیے ریڈی تھا اور وہ خط فرصت کے لمحات میں منظر کو دینے کا سوچ کر سنبھال کر کسی محفوظ جگہ پر رکھ گیا...... پھر اسے میری بے پروائی سمجھو یا کچھ اور گھر سے واپس آجانے تک میں اس خط کو مکمل طور پر بھول چکا تھا...... وہ خط فراموش کیے جانے کے لائق تھا تو نہیں مگر پھر بھی...... وہ کسی بھی طرح میرے ذہن کی سلیٹ سے مٹ چکا تھا۔"

اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے وہ بے بسی سے پیشانی مسل رہا تھا...... سامنے بیٹھی لڑکی ہنوز ساکت تھی۔

"پھر منظر اور تمہارا ذکر شروع ہوتا ہے...... میں سمجھ رہا تھا کہ تم دونوں اچھے دوست سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو...... ایک دو بار میں نے سوچا بھی مگر پھر خیال جھٹک دیا...... پھر جانتی ہو منظر نے اس واقعے کے بعد مجھے بتایا کہ اس کی زندگی میں تمہاری کیا "حیثیت" ہے۔"

سورج کی زرد کرنوں میں سرخی گھل رہی تھی...... ٹیولپس کے پھولوں پر بہتی گلابیت خوب صورت میں ٹھٹکا دینے پر مجبور کرتی تھی...... نیلے امبر کا سورج تھکے انداز میں اپنی کرنیں سمیٹ لینے پر ہلکان ہونے جا رہا تھا۔

"دوسری جانب کی کہانی سے میں لاعلم ہوں لاریب...... مگر منظر واقعی اس سب میں بے قصور ہے...... وہ اپنے دل میں صرف تمہارے لیے جذبات رکھتا ہے، تم نے اس پر اپنا یقین توڑ دیا...... وہ بہت ہرٹ ہوگا۔"

اس کا دل مٹھی میں لے کر سعد نے اس کی طرف دیکھا...... لاریب دھواں، دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ کناروں سے پانی چھلکنے کو بے تاب ہو رہا تھا...... اسے ہر منظر دھندلا ہوتا دکھائی دیا۔

لاریب نے اپنا منظر کھو دیا......

اس نے...... "منظر" کو کھو دیا......

دل کی دھرتی پر محبت زخمی پیروں سے کھڑی ہو کر نوعمر بچے کی طرح قدم اٹھاتی جا رہی تھی دل کی شفاف دھرتی لہو رنگ ہو رہی تھی۔

"منظر......" لاریب نے اپنے دل میں...... بے تحاشا درد اٹھتے پایا......

☆☆☆

دھیرے، دھیرے دور ہوتے سورج کے وقت ندی کنارے شور سا بپا تھا۔

سکون سے بہتی ندی کی لہروں میں آج معمول سے بڑھ کر اضطراب اٹھ رہا تھا...... تیزی سے بہتے پانی میں ندی اپنے پہلوؤں سے جھاگ اگل رہی تھی۔

سورج کی آتشی شعاعیں پانی کی سطح سے ٹکرا کر آہستگی سے دور تک سفر کر رہی تھیں...... یوں جیسے پانی کے درمیان آگ لگی ہوئی ہو...... بانو کی بے تاثر نگاہیں پانی سے چھلکتے اضطراب پر جمی تھیں...... ندی کے دوسرے کنارے سبز بیلوں پر لگے سنہری خربوزے پانی میں ڈوب ابھر رہے تھے۔

"تم یہاں بیٹھی ہو؟" اس کے عقب سے آواز گونج کر لہروں کے شور میں دم توڑ گئی...... وہ جانتی تھی پیچھے کون تھا...... وہ واقعی جان گئی تھی کہ وہ دراصل "کون" تھا۔ اس کی نگاہیں جھاگ پر جمی رہیں۔

"مجھے تم سے بات کرنا تھی......" بانو کو چڑ ہو گئی تھی اس جیسے جملے سے......

"تم نے کیا سوچا پھر......؟"

"کچھ نہیں......" اس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

"اماں جان بہت ناراض ہیں مجھ سے۔" منظر کی بات پر اس نے سر مزید جھکا لیا...... یہ محبت اسے اور کہاں، کہاں شرمندہ کروانے والی تھی...... کس، کس کے سامنے ذلیل۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں...... مجھے علم ہوتا تو میں کبھی تمہارے پاس وہ سب سننے نہیں آتا...... مجھے تمہاری اذیت کا اندازہ ہے بانو......" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سن رہی تھی...... آتشی رنگ اب بھی پانی پر جھلملا رہے تھے۔

"تم دیکھ رہی ہو بانو...... کیسے خزاں کا موسم اتر آیا ہے...... ہر سمت بھورا پن...... ہریالی کی سبز خوشبو تو کہیں کھو سی گئی ہے۔" اس کے لہجے میں اداسی کوٹ، کوٹ کر بھری تھی...... بانو کے دل پر گھونسا پڑا...... وہ گردن موڑ کر منظر کی صورت تکنے لگی۔ وہ سامنے ندی پار کھیتوں کو دیکھ رہا تھا...... مگر بانو، (مبینہ ارشاد) جانتی تھی ہریالی کی خوشبو کہاں سے کھو گئی ہے...... وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

"مجھ سے ناراض ہو......؟"

"نہیں...... خود سے ہوں......"

"خود سے ناراضی اچھی نہیں ہوتی۔"

"اچھی تو دوسروں سے بھی نہیں ہوتی...... بلاوجہ اور بے فائدہ......" وہ ایک سانس لے کر پلکیں جھپکانے لگی۔ منظر خاموش تھا۔

"کبھی، کبھی حالات انسان کے بس سے دور ہو جاتے ہیں...... ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا ہے...... یا یوں سمجھو قسمت کو ایسے منظور تھا......" وہ پل بھر کو چپ ہوا شاید سانس لینے کو رکا...... ہلکے، ہلکے شور میں ان کی آواز سرگوشیوں کے جیسی تھی۔

"میں جب لاریب سے ملا...... تو جانتی ہو وہ مجھے پہلے سے جانتی تھی......" منظر کے لبوں کو دھیمی ہنسی چھو گئی...... وہ افسردہ ہوا...... آزردہ بھی اور خوش...... صرف اس لڑکی کے ذکر پر...... بانو آنکھیں پھیلائے ایک ٹک اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"میں اس سے پوچھ نہیں سکا کہ وہ مجھے کیسے جانتی ہے...... مگر تمہاری طرح میری بھی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی جب میں نے اس کے گھر پر اس کے ہاتھوں سے بنائی اپنی تصویریں دیکھیں...... وہ ایک خوب صورت آرٹسٹ ہے...... جس کے ہاتھوں نے پہلی بار مجھے پینٹ کیا......"

وہ کسی منظر میں کھویا ہوا جادوئی کیفیت میں بول رہا تھا...... اور بنا پلکیں جھپکائے بانو کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا پھنستا جا رہا تھا۔

"لاریب کہتی ہے ہمارا ملنا پہلے سے طے تھا، اس لیے وہ دن رات مجھے سوچتی آئی ہے......" بات کے اختتام پر وہ مسکرا دیا...... گویا ایسی معصومانہ بات پر لطف اندوز ہوا ہو...... بانو کی آنکھوں میں سرخی پھیلنے لگی تھی۔

"اور تم کیا کہتے ہو؟" وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی پوچھ رہی تھی۔ منظر اس کی آواز پر چونک گیا۔

"میں...... ہاں شاید ایسا ہو...... مجھے بھی اس لیے اس سے محبت ہو گئی ہو کہ ہمارا ملنا اسی طرح طے ہو......"

"کس طرح......؟" منظر سمجھ رہا تھا وہ کیا جاننا چاہ رہی ہے...... وہ دھیرے سے مسکرایا...... ایک کانپتی ہوئی مسکان......

"لاریب کو یاد نہیں...... مگر ہم پہلے بھی ایک بار ٹکرا چکے ہیں۔ اس نے یقیناً وہیں مجھے دیکھا......"

"کہاں......؟"

"حادثے والی جگہ...... لاریب کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟"

"ایکسیڈنٹ......؟"

"ہاں سرما کے دنوں میں لاریب کا ایک کار سے ٹکرا کر شدید ترین ایکسیڈنٹ ہوا تھا...... میں اس وقت وہیں قریب تھا اور اسے بچانے کے لیے بھاگا، بے ہوش ہونے سے قبل اس نے یقیناً مجھے وہیں دیکھا...... اور میں آج تک حیران ہوں کہ اسے میرا چہرہ یاد رہ گیا......"

"پھر تم کیسے اسے یاد نہیں......؟" وہ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے "لاریب نامہ" سننے میں دلچسپی نہیں تھی مگر پھر بھی...... وہ جاننا چاہتی تھی اس لڑکی کے بارے میں...... وہ منظر کے چہرے پر رقم اس لڑکی کی محبت کو محسوس کرنا چاہتی تھی...... یہ اذیت ناک تھا اور اس نے جانا...... وہ اذیت پسند بنتی جا رہی ہے۔

"میں نے بتایا ناں کہ حادثہ شدید قسم کا تھا، وہ جانے کتنے گھنٹے بے ہوش رہی...... پھر اس نے اس نقطے پر سوچنا شروع کر دیا کہ میں صرف اس کا تخیل ہوں...... وہ مجھے کہیں نہیں ملی...... یہ سچ بھی ہے...... اتنے شدید ایکسیڈنٹ کے بعد اتنی سی بات

دماغ سے محو ہو جانا کوئی غیر یقینی بات نہیں ہے۔"

اس نے بات ختم کر دی..... مانو نے مزید بولنے کی سکت خود میں ختم ہوتی پائی۔ وہ خود کو ان دونوں میں ایک بیکار کردار محسوس کر رہی تھی۔

"غلطی تمہاری نہیں ہے..... نہ میری..... قصوروار اگر سعد اور شبنم بھی ہیں تو ہم انہیں قصوروار ٹھہرا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے..... دکھ تو اس بات کا بھی ہے کہ لاریب نے میری بات کا یقین نہیں کیا..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کبھی میری کوئی بات نہیں سنے گی....." وہ مایوسی سے کہہ رہا تھا۔

مانو نے اس کے چہرے پر صاف پڑھا..... "وہ لڑکی جتنی دور ہو رہی تھی..... اتنی قریب محسوس ہو رہی تھی۔" مانو اسے دیکھتی رہی..... دیکھتی رہی..... اذیت زہر بن کر اس کے رگ و پے میں اتر رہی تھی۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح چیخ رہی تھی۔

"اور میں..... میں اس سب میں کہاں ہوں منظر..... تمہیں میرے گھاؤ نظر نہیں آئیں گے؟" یہ بہت کٹھن تھا..... شکوہ کرنا چپ رہنے سے کہیں بڑھ کر دشوار تھا..... پھر اس نے خود کو کہتے سنا..... وہ رکھائی سے کہہ کر سورج کی سمت دیکھنے لگی۔ وہ ہرگز رونا نہیں چاہتی.....

"ایسا نہیں ہے مانو..... میں نے کہا ناں....."

اس نے تیزی سے منظر کی بات کاٹی تھی۔

"تم نے یہی کہا کہ شبنم اور سعد اس سب کے ذمے دار ہیں..... تو میں کیا کروں؟ شبنم تمہاری بہن ہے اور وہ لڑکا سعد تمہارا دوست..... میں نے کب ان کو اپنے دل اور زندگی کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دی..... بتاؤ مجھے....." گرم سیال تیزی سے اس کے چہرے پر بہہ رہا تھا، منظر سے کبھی کسی کے آنسو برداشت نہیں ہوئے تھے..... وہ مانو کے آنسوؤں کی آنچ سے قطرہ، قطرہ پگھل کر بہہ رہا تھا۔

"ایسے بات مت کرو پلیز..... تم جانتی ہو میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"تم دیکھ سکتے ہو..... تم سب کو اپنے، اپنے دکھ نظر آتے ہیں، میں کسی کی کچھ نہیں لگتی....." وہ بے دردی سے آنسو پونچھ کر زخمی نظروں سے سبز بیلوں کو دیکھ رہی تھی۔ پورا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

"تم بھول نہیں سکتیں.....؟" اس نے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا۔ اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں، میں نہیں بھول سکتی..... کچھ بھی....."

اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ وہ ایسی نہیں تھی مگر دکھ غصے کی شکل میں باہر آ رہا تھا..... منظر سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس اذیت کو محسوس کر رہا تھا جو وہ خود سہہ رہا تھا..... کچھ فاصلے پر پکی فصلوں پر سورج کی تھکی ہاری کرنیں پڑ رہی تھیں..... فصلیں تیار تھیں اور ہر سو واقعی سونا بکھرا ہوا تھا..... منظر نے ذہن سے ہر چیز کو جھٹک دیا۔

"میں تمہارے ساتھ شادی کرنے پر تیار ہوں....."

منظر نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔ شور مچاتی ندی میں لحظہ بھر کو سکوت چھایا..... مانو کے چودہ طبق روشن ہوئے، پانی کے بیچ آگ دراصل اب لگی تھی۔

☆☆☆

شہابے رنگ کے امبر پر سے اب بھی نیلاہٹ اتری ہوئی تھی..... اور مرجھائے پھولوں کی باس ہنوز سارے ماحول پر چھائی تھی۔

"تم ٹھیک ہو لاریب.....؟" لاریب نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ شاید ناراض ہو گا مجھ سے....."

"ہاں شاید....." سعد نے کہا تھا۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے..... سعد؟"

"اسے منانا چاہیے....." سعد کا مشورہ تھا۔

"میں کیوں مناؤں....." وہ فوراً خفگی سے منہ بنا کر بولی..... سعد بے ساختہ ہنسا۔

"تمہیں لگتا ہے..... وہ واپس آ جائے گا ناں.....؟"

وہ دلاسا چاہ رہی تھی۔

"اس کا اندازہ تمہیں بہتر ہو گا لاریب....."

سعد نے نرمی سے جواب دی..... لاریب کے چہرے پر اداسی چھا رہی تھی۔

"وہ کزن ہے اس کی..... چاہے مجبوری میں بھی وہ....." آواز رندھ گئی، وہ اپنے باپ کی طرح منظر کی مجبوریوں پر خوف زدہ تھی۔

"یہ ضروری تو نہیں....." سعد نے اسے یاسیت سے نکالنا چاہا..... وہ کافی دیر وہاں بیٹھا اسے سمجھاتا رہا..... پھر جاتے وقت لاریب نے سعد کو کہتے سنا۔

"منظر کی محبت تمہارے لیے بے غرض ہے لاریب..... اور بہت زیادہ بھی..... وہ تمہارے لیے ضرور آئے گا....." وہ دونوں گیٹ پر ہی کھڑے تھے..... اور سعد کے لبوں پر حوصلہ افزا مسکراہٹ تھی۔

"تھینک یو سعد..... تھینک یو سو مچ..... مجھے تقدیر پر پورا بھروسا ہے جو میرا ہے اسے میرے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے....." وہ بھیگی آنکھوں سے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

"اور اگر کسی کو پوری شان سے پا نہ سکو..... تو اس کو پورے وقار سے کھو دو....." میرے نزدیک یہ کٹھن فیصلے کا آسان طریقہ ہے..... اور بہترین بھی....."

"شادی....." ندی کنارے بیٹھی مانو کی سرسراتی آواز کسی گہری کھائی سے آئی اور سبز بیلوں پر لگے جگنوؤں کی طرح آگ لگے پانی میں ڈوب گئی..... ٹھیک اس کے دل کی طرح..... وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ ایک منظر خاموش تھا..... ایک منظر ساکت۔

"تت..... تم کیا کہہ رہے ہو؟" اسے یقیناً اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ منظر ڈوبتے سورج کو نہیں دیکھ رہا تھا..... وہ خود سے دور ہوتی محبت کو دیکھ رہا تھا۔

"تم نے صحیح سنا ہے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں....."

مانو سورج ڈوبتے دیکھتی آئی تھی..... وہ آج ڈوبتے دل کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہارے ساتھ جو ہوا وہ درست نہیں..... اور مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ اپنی محبت سے دستبردار ہونا آسان نہیں ہوتا..... میرے گھر والوں کے ساتھ میں بھی تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا....." ضبط کے کڑے مرحلے سے گزرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مانو کی طرح وہ رو نہیں سکتا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ مرد آنکھوں سے کم، کم ہی رویا کرتا ہے..... اور پھر محبت سے دستبرداری کہاں ممکن ہے؟

"تم اماں جان کے دباؤ میں آ کر....." مانو کا گلا بیٹھ گیا..... وہ دھندلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"بالکل نہیں..... میں تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں چاہتا۔"

"اور خود کے ساتھ.....؟" مانو سوال کر رہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا محبت امتحان بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔

"کبھی، کبھی ہو جاتا ہے ایسا....." اس کے مبہم جواب میں جانے کیا کچھ تھا۔

"تم جانتے ہو..... تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

"ایک لفظ "سمجھوتا" بھی ہوتا ہے..... پھر محبت کیا ہے؟ یہ لازمی نہیں....." منظر اس کی سمت دیکھ کر کرب سے ہنسا..... یوں کہ آنکھوں سے پانی چھلک پڑا تھا..... اس کی مسکراہٹ دل کو چیرتی تھی۔ مانو کا مردہ دل لہو ٹپکانے لگا۔

"اور لاریب کا کیا ہو گا؟" وہ آج کے بعد بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ اسے بار، بار اس لڑکی کا خیال کیوں آ جاتا تھا..... پھر بعد میں سمجھ گئی کہ وہ خود غرض نہیں تھی..... اس لیے تو ہار کے بھی جیت گئی تھی۔

"لاریب....." منظر کے دل میں ٹیس سی اٹھی.....

"وہ سمجھدار لڑکی ہے، میں سمجھا دوں گا اسے..... وہ سنبھل جائے گی۔" منظر نے تو بات ختم کر دی..... سورج غروب ہو گیا..... محبت ڈوب گئی..... دل خالی رہ گئے..... فضائیں بے رنگ ہو گئیں اور وہ..... وہ ششدر سی ہو کر اسے دیکھے جا رہی تھی..... وہ پہلی بار منظر سے مل رہی تھی..... وہ منظر اجنبی تھا..... وہ منظر جو لاریب کا تھا..... اور وہ منظر جو کبھی اس کا تھا ہی نہیں.....

کیسی حلاوت تھی ایک لفظ....."لاریب"

میں...... کیسے پکارنے کا انداز تھا اس کا...... اور ایسا انداز جس کے سامنے مانو کو اپنا آپ ہلکا ہوتا نظر آیا...... کیا کسی کے بولنے پر کوئی نام اتنا بھی خوب صورت لگ سکتا تھا......؟ مانو کو ہر نام پر سے خوب صورتی چھنتی پڑتی محسوس ہوئی۔ پرندوں سے آسمان بھرا ہوا تھا اور اس بھرے آسمان تلے سے اٹھ کر منظر اس سے دور ہوتا جارہا تھا...... دور اور دور...... بہت دور......

''سمجھوتا...... ہاہاہا......'' لفظ منہ چڑاتا قہقہہ زور دار آواز سے بلند ہو کر دور تک گیا...... پھر سکوت ایسے طاری ہو گئے جیسے دنیا ویران ہو گئی...... قیامت کے جیسے آثار...... وہ جارہا تھا...... وہ جانے کے لیے ہی تو آیا تھا...... کاش وہ اس شام اس ندی کنارے اسے کبھی نہیں ملی ہوتی...... وہ تنک کی مورتی میں ڈھل گئی تھی۔

''اور اس شام مانو نے کیا دیکھا......؟''

اس نے لاریب کو دیکھا...... صرف منظر کی ایک پکار میں اس نے لاریب کو دیکھ لیا...... اس کی محبت کو پالیا...... اس کے جذبات کو جالیا...... وہ کہتا تھا...... ''مانو'' اور مانو وہی مانو رہتی تھی...... اس نے کہا ''لاریب''...... لاریب ''امرت'' بن جاتی تھی۔

اس شام بے رونق آسمان تلے ایک، ایک قدم اٹھاتی اور وہ ہر چیز کو بے رونق ہوتا پا رہی تھی...... سنہری رنگوں نے کہیں بھی ان مٹ نشان نہیں چھوڑے تھے۔ اس کی محبت کا امتحان تھا اور محبت آزمائش بن کر اتر رہی تھی۔

پہلے ''منظر'' اس کا نہیں تھا۔ اب اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں رہتا تھا...... وہ صرف لاریب کا تھا...... ہاں اس پر صرف لاریب کا حق تھا۔

''اور اگر کسی کو پوری شان سے نہ پاسکو...... تو اس کو پورے وقار سے کھودو......''

لاریب نے کہا تھا عشق کا عین، عقل کے عین کو کھاتا ہے...... کاش وہ دیکھ پاتی، عشق کا عین، عقل کا عین عطا بھی کردیتا ہے...... وہ بے حواس چلتی جارہی تھی...... اور اس کا رخ جامن تلے پیڑ والے گھر کی طرف تھا...... آج کتنے ہی دنوں بعد...... اور سب کی نظریں اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں...... بے قرار نگاہیں...... اس نے خود کو اماں جان کے سامنے کھڑا اور جھکتے پایا...... وہ نیچے بیٹھی ہوئی تھی پھر اس کچے گھر نے...... جامن کے درخت نے...... بے رنگ فضاؤں، ویران آسمان...... خود اس نے...... اور سب نے اسے کہتے سنا۔

''میری خاطر مان جائیں...... لاریب اور منظر کے لیے مان جائیں......'' چھوٹے سے گھر میں بھونچال آیا تھا...... سب بھونچکا رہ گئے...... سب کی بے یقین نگاہیں اس کو چاروں طرف سے چبھ رہی تھیں...... وہ جانتی تھی، وہ حواس میں تھی۔

''دلی رضا فیصلوں میں شامل نہ ہو تو وہ فیصلے بنا ریت گارے کی عمارت کے جیسے ہوتے ہیں...... جو سب کچھ دے سکتے ہیں سوائے ایک خالص خوشی کے...... دلی راحت کے...... منظر کے لیے سچی مسکراہٹیں خرید لیجیے اماں جان......''

وہ کہہ رہی تھی...... اماں جان خفگی سے اسے دیکھ رہی تھیں...... وہ کچھ نہیں جانتی تھی...... وہ اتنا جان پائی کہ جب اٹھی تو اماں جان کی گردن انکار میں ہلتی نہیں دیکھ پائی تھی...... وہ مایوس نہیں ہوئی تھی...... وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ چہرے پر سکون لیے وہ سب کی طرف پشت کیے جارہی تھی...... کوئی آبدیدہ ہوا...... کوئی افسردہ...... کوئی خوش...... کوئی متاثر...... کوئی احسان مند...... وہ بے تاثر انداز میں سر جھکا کر چلتی کہہ رہی تھی...... خود سے ہی کہہ رہی تھی۔

''محبت مجھ سے قربانی مانگ رہی تھی...... میں نے اپنی محبت قربان کردی...... منظر کو قربان کردیا...... اسے لاریب کو دان کردیا...... میں ہاری نہیں جیت گئی ہوں...... میں ایک بہادر لڑکی ہوں......'' وہ زور سے رو دینا چاہتی تھی...... بس ایک آخری دفعہ...... محبت قربان کردینے کے جشن میں...... مگر وہ جشن نہیں منا سکی...... وہ ہنس رہی تھی۔

''میں مانو ہوں...... جل سکتی ہوں...... جلا نہیں سکتی...... ٹوٹے کانچوں پر رقص سجا سکتی ہوں...... کانچ کسی اور کی راہ میں نہیں پھیلا سکتی...... میں مانو ہوں...... میں بہار کا آخری پھول ہوں......'' وہ جارہی تھی...... اور دہراتی جارہی تھی......'' میں بہار کا وہ پھول ہوں جو مرجھا تو سکتا ہے مگر ٹوٹ نہیں سکتا......

محبت پالینا آسان ہے اسے اپنے ہاتھوں سے سجا کر کسی اور کو پیش کردینا ہر کسی کا ظرف نہیں...... تمہیں یاد رکھا جائے گا...... منظر کی ہیروئن لاریب ہو سکتی ہے مگر اس زیست کے قصے کی اصلی ہیروئن تو تم ہی ہو...... تم سے پیار کیا جائے گا مانو...... آئی لو یو...... تم جیت گئیں، تم بہادر لڑکی ہو......'' دو آنسو آخری دفعہ اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر گرے اور ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے...... وہ ایک نظر پیچھے ڈال کر باہر نکل گئی۔ سندر نگر پر رات اتر آئی تھی...... سینہ ارشاد سندر نگر کا غرور ٹھہری تھی۔

اور ہاں مجھے یاد آیا......

''ہر دفعہ پالینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا...... بہت دفعہ کھو دینا بھی زندگی بھر کی تڑپ سے بچالیتا ہے۔''

☆☆☆

صبح کی سپیدی پھیلی کافی دیر گزر چکی تھی...... اور سورج پر آج آلکسی سوار تھی...... شرق سے اٹھتے ہوئے ہلکے لال رنگ افق پر اڑتے پرندوں تک ہی پہنچ رہے تھے...... ہلکی، ہلکی لرزتی تھرکتی ہوا، آج معمول سے بڑھ کر خوشگوار تھی۔

جھیل کنارے کے پار پھولوں پر سے سفید تتلیاں نیند جھٹک کر اڑ، اڑ کر اس کے پاس آرہی تھیں...... اور اس کے گرد قطار میں پھیلتی جارہی تھیں۔

''کیا تم لاریب ہو......؟'' وہ چہرے پر حیرانی لے کر اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اوہ...... تمہیں رونا آرہا ہے؟'' منظر نے اشتیاق سے اسے دیکھا۔ وہ آنسو ضبط کیے سرخ پڑتی جارہی تھی۔

''ویسے تمہیں معلوم ہے...... تم میں سب سے اچھی بات یہی ہے کہ تم رونے والے منہ بناتی رہتی ہو مگر روتی نہیں ہو......'' منظر نے ستائشی انداز میں کہا اور سوں، سوں کرتی لاریب کے چہرے پر ہنسی کی آبشار پھوٹ پڑی...... اگلے لمحے وہ تیزی سے آنکھیں خشک کررہی تھی۔

''بہت برے ہو تم...... بہت زیادہ......'' وہ بھیگی آواز میں خفگی سے بولی تھی...... وہ اس وقت جھیل کنارے پڑی سنگی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور یہ وہی پارک تھا جہاں وہ واک پر ملتے رہتے تھے...... لاریب وہاں پھولوں کی بہتات ہوتی دیکھ رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں، میں کتنا برا ہوں...... اور آپ اس برے کے ساتھ مزید کتنا برا کرنے جارہی تھیں۔''

''میں سوری کرچکی ہوں......'' وہ سخت شرمندہ تھی۔

جھیل کا پانی ہلکی ہوا کے باعث ارتعاش پیدا کررہا تھا۔

''کیا تم بیمار رہی ہو، تمہاری رنگت پیلی پڑ رہی ہے...... اور آنکھوں کے گرد حلقے لگ رہے ہیں۔'' وہ آنسو پیتی چپ رہی۔

''ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ...... تمہیں میں اتنا عزیز ہوں کہ تم میرے لیے رات کو سونا چھوڑ دوگی......'' لاریب سٹپٹا گئی، منظر کی ہنسی اُف......

''جھوٹ...... تمہیں سب پتا ہے...... بس انجان بنتے ہو...... اتنے دنوں میں کوئی کال نہیں کی تم نے ایک بھی......'' اسے ایک نیا دکھ یاد آگیا۔

''کال تو تم بھی کرسکتی تھیں...... ہوں؟'' منظر نے برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

''میں کیوں کرتی......؟'' سوں، سوں کرتی وہ پھر سے ناراض ہوئی...... منظر کے لیے یہ صورتِ حال پُرلطف تھی...... وہ بہت دنوں بعد ہلکا پھلکا ہوا تھا۔

''پھر میں تو ٹھہرا غریب سا بندہ......''

''تو غریب سے بندے یہاں کس لیے آئے ہو......؟'' وہ تیکھی نظروں سے گھور کر بولی...... منظر فوراً خوفزدہ ہو کر پیچھے کو سرکا۔

"میرا ارادہ تو نہیں تھا ویسے...... تمہارا ہی سوچ کر آیا۔"
"کیا سوچ کر......؟" پیشانی پر بل گہرے ہوئے۔
"میں نے سوچا کہ...... کہ......
تم تنہا کیا عشق کرو گے؟
آدھا...... آدھا کر لیتے ہیں"
وہ شرارتی انداز میں گنگنایا...... لاریب بے ساختہ امڈتی ہنسی کو چھپانے کے لیے دوسری سمت دیکھنے لگی......
وہ آج خوش تھی...... بے انتہا خوش...... محبت گہرائی رکھتی ہو تو جیت ہی جاتی ہے...... محبت کے ساز اس کے اندر اس کے اندر کہیں بہت قریب سے بج رہے تھے...... وہ خود کو اڑتی تتلیوں جیسا پا رہی تھی۔
"تمہیں معلوم ہے لاریب...... میں ایسے پھول کی طرح ہوں جس پر بیٹھنے کا صرف ایک تتلی حق رکھتی ہے...... اور وہ سفید تتلی صرف اور صرف تم ہو......" وہ بہت مضبوط لہجے میں اسے یقین دلا رہا تھا...... لاریب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ ان کی محبت کو پہلے بھی کبھی زبان کی ضرورت نہیں رہی تھی...... اتنی سی دوری کے بعد تو دلوں میں اہمیت کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔
"اور مانو......" دل میں دبا سوال اسے سنجیدہ ہونے پر مجبور کرتا تھا...... وہ ابھی تک بے یقین تھی کہ منظر اس کے لیے لوٹ آیا تھا۔
"مانو بہت اچھی لڑکی ہے......" منظر مسکرایا...... وہ سنجیدگی نہیں چاہتا تھا۔
"ہاں...... وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہو گی...... ہم سے کہیں بڑھ کر......" اس کا دل تشکر کے احساس سے بھر رہا تھا۔ اس کے دل میں مانو کی قدر پناہ دیکھے بہت بڑھ گئی تھی۔
"کیا تم اس کی مشکور ہو رہی ہو؟" منظر نے چھیڑا۔
"ہاں...... بلکہ احسان مند......" وہ کھلے دل سے اعتراف کر رہی تھی۔
"اور میری......؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔
"تمہیں تو بعد میں دیکھوں گی......" اس نے کہا اور دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

نکھری، نکھری دھوپ چار سو بکھری رہی تھی......
اور افق پر اس دن بیک وقت کئی رنگ تھے، وہ دونوں چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتے چل رہے تھے۔
"سوسن لاریب...... اس موقع پر کچھ کہنا چاہیں گی؟" شوخی سے بولتے ہوئے وہ جانے کس سمت اشارہ کر رہا تھا...... لاریب کے لبوں کے کنارے ہلکی تبسم سے پھیلے۔
"بس اتنا کہ جیسے منظر دنیا جیسا نہیں...... ویسے منظر جیسا بھی کوئی نہیں......" زرد پتے ان کے پیروں میں آ کر چرمرا رہے تھے...... ہوا ہنسی میں سرگوشی کرتی محبت دربار عشق میں دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتی دل کے سنگھاسن کی اور بڑھ رہی تھی......" محبت کو بادشاہت مبارک ہو......"
"سنو......" منظر نے آہستگی سے پکارا...... محبت رک کر سننے لگی۔ فتح کے نشے میں سرشار اسے کسی بھی چیز کی جلدی نہیں تھی۔
"اتنی بے اعتباری اچھی نہیں ہوتی...... یقین میں اتنا کچا پن کسی بھی رشتے کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔"
"میں وعدہ کرتی ہوں...... تم کبھی مجھ میں...... بے اعتباری نہیں دیکھو گے......" محبت نے عہد دیا تھا...... دل کی چوکھٹ پر اعتبار کے دیے قطار در قطار روشن تھے۔
"اور سنو...... اگر تم بے اعتبار ہوتیں تو تمہارا اعتبار لوٹا دینے میں...... میں جان کی بازی لگا دیتا......"
اس کے لبوں پر بچی مسکراہٹ کھلی تھی...... کچی کلیوں کے جیسی خوشبو دار مسکان...... وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھے گئی...... وہ جو محبت زدہ تھی...... محبت کے ہم قدم چلتے ہوئے اسے بتا نہیں سکی......
"اگر میں بے اعتبار ہوتی...... تو تمہاری جان کی بازی لگا دینے سے پہلے اعتبار اپنا لیتی...... ایک منظر تمہارے لیے...... ایک تمہاری محبت کے لیے......" وہ سنہری رنگوں میں ڈوبے دور جا رہے تھے...... عشق پرت در پرت ان کے گرد اتر رہا تھا۔

☆☆☆ (ختم شد)

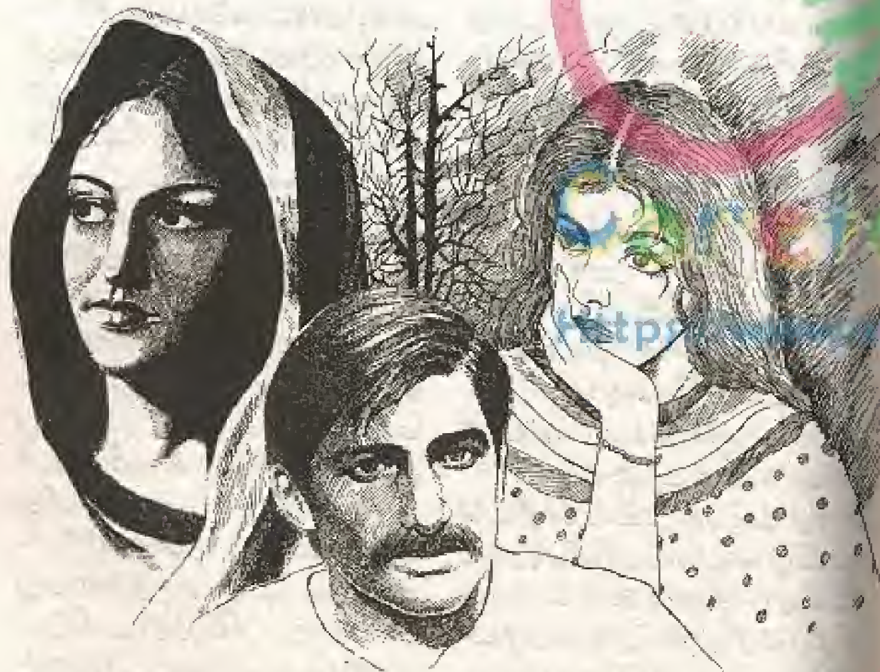
ناولٹ

یہ زندگی کے رستے

ام ایمان قاضی

"بھابی یہ حدیبیہ ابھی تک لوٹی نہیں کالج سے، تین بج گئے ہیں خدا خیر کرے۔" بوا نے گھبرا کر پوچھا۔ نفیسہ بیگم جو کہ جائے نماز لپیٹ رہی تھیں۔ چونک کر اُن کی طرف مڑیں۔

"ہاں آپا آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔ آج اسے ایرج کی طرف جانا تھا۔ صبح مجھے بتا کر گئی تھی۔ اور ہاں آپ کے بھائی صاحب بھی لیٹ آئیں گے۔ آپ کھانا کھا لیں۔" نفیسہ بیگم کہتے ہوئے کچن کی جانب



بڑھ گئیں۔ اور بوا پیچھے بڑبڑاتی رہ گئیں۔

''ہونہہ، لڑکی نے کہا اور انہوں نے مان لیا ارے کتنی دفعہ کہا ہے، جوان جہان بچی ہے اس پر نظر رکھا کرو، اول تو کہیں آنے جانے ہی مت دو، بہت ضروری بھی ہو تو اماں، باوا میں سے کوئی ساتھ جائے نہیں تو مجھ نگوڑی کو ہی خبر کر دو، میں ہی چلی جاؤں گی پر نہ جی...... یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ماں، باپ کو کوئی فکر ہی نہیں، کیسے اطمینان سے کہہ رہی ہے اریج کی طرف چلی جائے گی۔ کون لے کر جائے گا کس کے ساتھ آئے گی۔'' نفیسہ بیگم تک اُن کی یہ ساری باتیں پہنچ رہی تھیں مگر وہ کان لپیٹے سنتی رہیں اور کوئی جواب دیے بغیر کھانا لا کر اُن کے سامنے دھر دیا۔

''بھابی تم نے بتایا ہی نہیں کہ کس لیے گئی ہے۔ حدیبیہ تمہارے بھائی کے گھر۔'' بوا کی سوئی ابھی تک حدیبیہ میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔ نفیسہ بیگم طویل سانس لیتی ہوئی سیدھی ہوئیں۔

''کل بھائی صاحب کا فون آیا تھا جب آپ سو رہی تھیں۔ بتا رہے تھے کہ بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، حدیبیہ کو یاد کر رہی ہیں تو کل جب اریج کو کالج سے پک کرنے آئیں گے تو حدیبیہ کو بھی ساتھ ہی لے جائیں گے۔ ایک دن رہ جائے گی اُدھر ہی۔ پھر کل آتے ہوئے دونوں کو کالج چھوڑ دیں گے۔''

''اوئی ماں...... میں مر گئی، بھلے ہی تمہارے بھائی کا گھر ہے، ہزار رشتے ناتے طے ہوئے ہوں مگر جوان لڑکا موجود ہے وہاں، کیسی ماں ہو تم بھابی، ایک دو گھنٹے نہیں، پورا دن نہیں...... رات بھی رہنے کو بھیج دیا...... اور بھائی نے بھی اجازت دے دی۔'' وہی ہوا جس کا نفیسہ بیگم کو ڈر تھا۔ بوا کھانا چھوڑ کر ان کی کلاس لینے لگ گئیں۔

''آپا! وہاں عفان اکیلا نہیں رہتا۔ اور بھی لوگ ہیں، ماشاء اللہ بھرا پُرا خاندان ہے اور وہ حدیبیہ کے ماموں کا گھر ہے، کسی غیر کے گھر نہیں گئی، میرے بھائی نے باقاعدہ آپ کے بھائی سے اجازت لی تھی اسے لے جانے کی جہاں تک رشتے ناتوں کے طے ہونے کی بات ہے، ہم بڑوں کے درمیان ہی ہوئی ہے ابھی تک یہ بات...... بچوں تک معاملہ ابھی نہیں پہنچا کہ پہلے حدیبیہ کی تعلیم مکمل ہو جائے پھر عفان بھی کسی جاب سے لگ جائے تو ہی باقاعدہ رشتہ طے کریں گے۔ آپ بے فکر رہیں اور کھانا کھائیں۔'' نفیسہ بیگم بات مکمل کر کے جلدی سے وہاں سے اٹھ گئیں پتا تھا کہ بوا اگلا ایک گھنٹا ایسے بولتی ہی رہیں گی۔

☆☆☆

''اے ثریا کنڈی بند کر لے اندر سے، میں ذرا بازار تک جا رہی ہوں۔ ایک گھنٹے تک آ جاؤں گی، صفائی کر کے سالن بنا لینا، روٹیاں میرے آنے پر ڈالنا اور ہاں منی سوئی ہے اندر اس کا خیال رکھنا۔'' اماں نے چادر پہنتے ہوئے ہدایات کا پلندا اس کے کانوں میں انڈیلا اور خود چلتی بنی۔

''ہونہہ خس کم جہاں پاک......'' ان کے جاتے ہی ثریا نے ہاتھ جھاڑے۔ کنڈی لگا کر اندر جا کر نائم دیکھا اور خود صفائی میں جت گئی۔ وہ تو شکر ہوا اماں سبزی بنا کر رکھ گئی تھیں۔ سالن بنانے کے دوران ہی منی اٹھ گئی تھی۔ اس نے فیڈر بھر کر اس کے منہ سے لگایا وہ دوبارہ سو گئی تو ثریا نے اطمینان کی سانس لی۔ آٹا گوندھ کر اس نے کچن کا دروازہ بند کیا۔ ایک نظر منی کو آ کر دیکھا پھر گھڑی پر وقت دیکھ کر چھت پر آ گئی۔ اخیر اگست کی دھوپ جسم کو جھلسنے لگی تھی۔ مگر یہاں پروا کسے تھی۔ وہ وہاں واقعی اس کا منتظر تھا۔

''شکر ہے آج جلدی آ گئی ہو، لگتا ہے خالہ گھر پہ نہیں ہے آج۔'' اس نے اندازہ لگایا۔

''ہاں ابا کے پیسے آئے ہیں کل دبئی سے، وہ ٹھکانے بھی تو لگانے تھے ناں، ہمارے لیے اس عورت کے پاس چونی تک نہیں ہے اور اپنے اور بیٹی کے لیے ہر روز بازار کے چکر لگتے ہیں رہی سہی کسر اس کے میکے والے پوری کر دیتے ہیں۔ وہ تو آج کسی شادی میں گیا ہے سارا خاندان ورنہ ٹبر کا ٹبر ابا کی کمائی دونوں ہاتھوں

سے اڑا رہا ہے اور اپنی بیٹی بنیادی ضروریات کو ترس رہی ہے، ابا کو احساس ہی نہیں ہے، سچ ہے سگی ماں کے مرنے سے باپ بھی سوتیلے ہو جاتے ہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''ارے، ارے اتنے دنوں بعد ملے ہیں تو اس وقت کو رونے رُلانے والی باتوں میں نہ ضائع کرو، فکر مت کرو، بس یہ چند دن ہی صبر سے گزار لو پھر میں جب تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا تو یہ مشکل دن یاد بھی نہیں رہیں گے تمہیں۔'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر یقین دلانا چاہا۔

''اچھا وہ پھر تمہارے ماموں کے بیٹے نے کوئی الٹی سیدھی حرکت تو نہیں کی۔'' اسے یاد آیا تو ثریا سے پوچھا۔

''نہیں، آج کل کمانے کا شوق چرایا ہے تو شہر جاتا ہے اسی سلسلے میں، صبح کا گیا رات کو لوٹتا ہے مگر میری جو اماں ہے ناں اس کے ارادے مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، ایک دن یونہی مامی اپنے بیٹے کے رشتے کی بات کر رہی تھی تو بولیں فکر کا ہے کی ہے جب گھر میں لڑکی موجود ہے، یہ سارا خاندان جن کو مفت میں نوکرانی مل گئی ہے تو ساری زندگی ایک رشتے میں باندھ کر مجھے غلام بنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم، ابا سے کب بات کرو گے؟'' وہ بے قراری سے بولی۔

''ارے بابا تمہارے ابا جیسے ہی دبئی سے آتے ہیں بات کرتا ہوں اور اگر کوئی نمبر ہے تمہارے پاس تمہارے ابا کا تو وہ مجھے دو، میں بات کر لوں گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ جیسے تم مجھے بتاتی ہو کہ تمہارے ابا تمہاری سوتیلی ماں کی آنکھوں سے دیکھتے اور اسی کے کانوں سے سنتے ہیں تو وہ بھی ایسی صورت میں جب تمہاری ماں تمہارا رشتہ اپنے بھائی کے آوارہ بیٹے سے کرنا چاہتی ہے۔ مجھے کس کھاتے میں ڈالیں گے، جس کا سوائے ایک بہن کے دنیا میں کوئی نہیں اور ابھی تو میں کوئی کام دام بھی خاص نہیں کرتا۔'' وہ فکر مندی سے بولا۔

''تم ہمت تو کرو ناں...... ابا سے میں خود بات کروں گی۔ ساری زندگی ترس، ترس کر گزاری ہے تو زندگی کے اس اہم معاملے پر چپ کر کے میں ساری زندگی ظلم نہیں سہہ سکتی، میں اماں سے کسی طرح ابا کا نمبر لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ تم فکر نہ کرو......'' اس دن کیونکہ ثریا کو کسی کے آ جانے یا دیکھ لیے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ سو انہوں نے جی بھر کر باتیں کیں اور مستقبل کے منصوبے بنائے، منی نیچے روتی رہ گئی تھی۔

ثریا بھی اپنی چھوٹی سی جنت میں خوش تھی جب تک...... جب تک اس کی اپنی ماں زندہ رہی، ایک بھائی اور ایک بہن پر مشتمل یہ مختصر خاندان ایک خوشحال گھرانا تھا۔ ابا شروع سے دبئی میں تھے سو گھر میں روپے پیسے کے حوالے سے کوئی تنگی ترشی نہ تھی۔ وہ ساتویں جماعت میں اور اس کا بھائی چھٹی جماعت میں تھا۔ جب اماں معمولی سے بخار میں مبتلا ہو گئیں اور اللہ کو چونکہ ان کی زندگی زیادہ منظور نہ تھی سو وہی معمولی بخار ان کی موت کا سبب بن گیا۔ ان دونوں بہن، بھائی کی دنیا تو اندھیر ہوئی ہی تھی۔ ابا بھی اپنی خدمت گزار وفا شعار بیوی کی اچانک موت سے بوکھلا گئے۔ اتنا عرصہ کام دھندا چھوڑ کر بچوں کے سر پر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے کہ پیچھے ان کی جگہ کوئی اور لے لیتا۔ ایسے میں کسی ہمدرد کے مشورے پر ساجدہ بیگم جو کہ مطلقہ تھیں کو بیوی کے گزر جانے کے تین ماہ بعد ہی بیاہ لائے، بیٹا آٹھویں تک ہی پڑھ سکا تھا۔ سو کچھ عرصے بعد اس کے لیے بھی دبئی میں جس ورکشاپ میں وہ کام کرتے تھے وہیں کام ڈھونڈا اور اسے بھی بلوا بھیجا...... ثریا، عابدہ بیگم کے رحم و کرم پر رہ گئی تھی۔ زبان اور ہاتھ کی بے حد تیز ساجدہ بیگم جس کی طلاق اس کی انہی دو خوبیوں کی وجہ سے ہوئی تھی سے بھائی، بھابی بے حد تنگ تھے سو دوسری دفعہ رخصت کر کے سکون کی سانس لی۔ شادی کے تین ماہ بعد ہی ساجدہ بیگم نے بھائی اور بھابی کو بھی اپنے ساتھ اسی گھر میں شفٹ کر لیا کہ جو ثریا کا بھی گھر تھا۔ اور ثریا کے ابا سے بہانہ بھی کیا کہ جس کا شوہر دبئی میں ہو، اس کی بیوی جوان بچی کے ساتھ تنہا کیسے رہ سکتی ہے؟ بہانہ کارگر

...ثابت ہوا اور ساجدہ بیگم کے بھائی، بیوی اور ایک بیٹے سمیت ان کے گھر میں مستقل رہائش پزیر ہو گئے۔ بس تب سے ہی ثریا کے بڑے دنوں کا آغاز ہوا تھا۔ پڑھائی میں وہ ویسے ہی واجبی سی تھی۔ گھر کے کاموں کا جب سارا بوجھ اس کے نازک کاندھوں پر آن پڑا تو کیسی پڑھائی، کہاں کی پڑھائی...... مشکل سے ہی اس نے اپنا مڈل مکمل کیا اور تعلیم کو مکمل طور پر خیر باد کہہ دیا، ساجدہ بیگم اور اس کی بھابی جن کا آپس میں پہلے اینٹ کتے کا بیر تھا۔ اب خوب گاڑھی چھننے لگی تھی۔ دونوں کے دو ہی پسندیدہ کام تھے، ٹی وی دیکھنا اور محلے بھر میں گشت کرنا، ویسے بھی بھابی، اب ساجدہ بیگم سے تھوڑا دبنے لگی تھیں کہ اب وہ عام سی ساجدہ بیگم تھوڑی تھی، دبئی پلٹ کی بیوی تھی۔ خود بھی عیش کر رہی تھی۔ اپنے خاندان کو بھی کرا رہی تھیں۔ پیار کرنے والے ابا کی نظریں اور دل کیسے بدل گیا تھا ثریا آج تک سمجھ ہی نہیں پائی تھی ہاں ایک بھائی کا سہارا تھا جو کبھی، کبھار فون پر بات کر لیا کرتا تھا اور کسی آتے جاتے کے ہاتھ ثریا کے لیے کچھ نہ کچھ بھجوا بھی دیا کرتا تھا۔ وہ بھی ساجدہ بیگم یہ کہہ کر تھیا لیتیں کہ جوان جہاں ہو آخر کو کل تمہیں بیاہنا بھی ہے۔ یہ سب تمہارے جہیز کے کام آئے گا مگر بعد میں وہی چیزیں اور کپڑے، جیولری وغیرہ ساجدہ بیگم اور اس کی بھابی کے تن پر سجے دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا۔

ایسے میں ساجدہ بیگم امید سے ہو گئیں تو ثریا پر ذمے داریوں کا بوجھ مزید بڑھ گیا۔ وہ کاموں تلے دبتی چلی گئی۔ ابا اور بھائی نے صرف تین بار ہی پاکستان کا چکر لگایا تھا۔

''بیٹا، اپنی ماں کا خیال رکھا کرو، جیسے کہے ویسے ہی کیا کرو، بچیوں کو کیونکہ پرائے گھر جانا ہوتا ہے تو ضد، کوتاہی، کام چوری کو ماں، باپ کے گھر چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ تم تو میری بہت اچھی بیٹی ہو، امید ہے اپنے ابا کی اپنی ماں کے سامنے عزت رکھو گی، دیکھو اس نے کی ہے اگر تم اپنی من مانی کرو گی تو اپنے ابا کو دکھ ہی دو گی ثریا۔'' ابا سے اس کی تفصیلی ملاقات بس اسی دن ہو پائی تھی۔ جب انہوں نے واپس جانا تھا۔ وہ ساجدہ بیگم کے ساتھ اس کے پاس آئے تھے اور یہ ساری باتیں کہی تھیں۔ ثریا جو یہ سوچے بیٹھی تھی کہ اس بار ابا آئیں گے تو ساجدہ بیگم کی ساری زیادتیوں کا احوال سنائے گی، آنکھوں میں آئے آنسو چھپا کر بس سر جھکا کر جی ابا کہہ کر رہ گئی۔ ہاں بھائی اس بار جو چیزیں لایا تھا وہ اس نے ساجدہ بیگم کی نظر سے چھپائی تھیں کہ ابا ہی اتنا سامان لائے تھے کہ ساجدہ بیگم کی نظر بھائی کے سامان سے چوک گئی تھی۔ منی کی دیکھ بھال کی ذمے داری اسی کے سر تھی۔

انہی دنوں میں جب وہ اپنے دکھ درد سنانے کو ایک ہمدرد کندھے پر سر رکھ کر رونا چاہتی تھی، اپنی ماں کو یاد کرنا چاہتی تھی۔ اسے ٹی وی دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا مگر ٹی وی پر اماں اور اماں کی بھابی کی اجارہ داری تھی۔ اماں نے اب فرمائش کر کے ابا سے ڈی وی ڈی بھی منگوا لیا تھا۔ ثریا سارا دن کچن میں کام کرتی اس کا دھیان کمرے میں لگی فلم کی طرف ہوتا تھا ایک دفعہ اماں کی بھابی جنہیں وہ مامی کہتی تھی کی مہربانی سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اسے بہت پسند آئی تھی۔ اس میں بھی اس کی طرح کی ایک لڑکی تھی جس پر اس کی سوتیلی ماں ایسے ہی ظلم کرتی تھی مگر ہیرو جب اسے اس کی ماں کے چنگل سے چھڑا لیا تو اس کے سارے دکھ درد دور ہو گئے تھے۔ اس فلم کو دیکھ کر اسے اپنی زندگی میں آنے والے مرد کا خیال آیا تھا اور تب ہی اس کو ہمسائے والے جمال کا خیال آیا......

اونچا لمبا قد، فلموں کے ہیرو جیسا جمال، جس نے جب ثریا جیسی خوب صورت لڑکی کو اپنی طرف ملتفت دیکھا تو خود کو اس کی طرف توجہ دینے سے نہ بچا سکا۔ جمال کی چھت اور ثریا کی چھت کی درمیانی دیوار ایک ہی تھی وہیں ان کا پہلا تعارف ہوا تھا۔ مامی کا بیٹا

کر سکتا تھا جبکہ گھر میں ماحول ہی ہر وقت فلموں اور ڈراموں والا تھا، وہ نویں پڑھ کر اسکول چھوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دو ہی شوق تھے۔ ایک فلمیں دیکھنا جس کے مواقع گھر میں موجود تھے اور آوارہ گردی کرتا۔ ماں اور پھپھو کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی سو اس کے ان دونوں مشاغل کو خوب ہوا ملی...... باپ صبح کا گیا شام کو لوٹتا، ماؤں کی طرف سے سب ٹھیک ہے کی رپورٹ سن کر ایک طرف پڑ کر سو جاتا۔ ثریا کی راتوں کی نیند تب اڑی جب اسے پتا چلا کہ اماں نے اپنی بھابی کو تسلی کرا دی تھی کہ اپنے بیٹے کے لیے رشتے کی فکر میں خوار نہ ہو، وہ ثریا کے ابا کو کہہ کر اپنے آوارہ بھتیجے کو دبئی بھجوا دے گی یوں لڑکا بھی کام سے لگ جائے گا اور گھر کی لڑکی بھی گھر میں ہی رہے گی۔ بس بات ابا کے کان میں ڈالنی باقی تھی۔ مانی (اماں کا بھتیجا) نے جب سے یہ بات سنی تھی اس کا التفات ثریا سے بڑھ گیا تھا اور ثریا کی زندگی مشکل سے کٹھن ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''اُف اللہ...... اب کیا ہوگا؟'' کالج میں خوشگوار موسم میں کلاسز اٹینڈ کرتے ہوئے حدیبیہ کو اندازہ نہیں تھا کہ موسم چھٹی تک اس حد تک اپنا رنگ بدل لے گا۔ ابو نے اس سے رکشا لگوا کر دیا تھا مگر اب گیٹ سے باہر نکل کر اس کا کہیں نام و نشان دکھائی نہیں دیا، لڑکیاں تیزی سے اپنی، اپنی سواریوں پر سوار ہو کر گھروں کو روانہ ہو رہی تھیں۔ حدیبیہ بے حد پریشان ہو کر یہاں وہاں اپنا رکشا تلاش کرنے لگی۔ کالج تیزی سے خالی ہوتا گیا، اب تو سامنے والی روڈ پر بھی اکا دکا گاڑیاں تھیں۔ حدیبیہ بارش میں بری طرح بھیگتی ہوئی روڈ پر آ گئی تا کہ کسی لڑکی کے ساتھ مین روڈ تک ہی چلی جائے پھر وہاں سے لوکل کنوینس میں گھر تک چلی جائے گی، شکر ہے جو پیسے وہ کینٹین میں خرچ کرنے کی مد میں لائی تھی وہ بیگ میں موجود تھے کہ مسلسل کلاسز کی وجہ سے اور اس کی دوست

''ارے حدیبیہ! آ جاؤ تم بھی آ جاؤ۔'' دفعتاً ایک گاڑی چلتے، چلتے رکی اور اس میں سے ایک لڑکی نے سر نکال کر کہا۔ وہ رک گئی۔ گاڑی میں تین چار لڑکیاں پہلے سے موجود تھیں۔ اپنی کلاس کی شناسا لڑکیوں کے چہرے دیکھتے ہی وہ دل میں شکر ادا کرتی ان کے ساتھ ہی پھنس کر بیٹھ گئی۔ راستے میں ہی لڑکیوں نے بتایا کہ گاڑی چلانے والا ان کی کلاس فیلو ثمرین کا بھائی تھا جو اسے روزانہ واپسی پر لینے آتا تھا۔ صبح کے وقت اس کے ابو چھوڑتے تھے۔ آج جب اس کا بھائی حسب معمول اسے لینے آیا تھا تو پتا چلا کہ ثمرین تو آج کالج آئی نہیں تھی۔ وہ گھر سے پہلے نکل جاتا تھا اس لیے علم نہ ہو سکا۔ ثمرین کی ایک کزن اور اس کے محلے کی دو اور لڑکیاں جو کہ لوکل بس میں سفر کر کے جاتی تھیں نے ثمرین کے بھائی کو دیکھ کر روک لیا کہ شدید بارش کے سبب ہو سکتا ہے سواری نہ مل پائے تو وہ انہیں ڈراپ کر دے سو وہ تینوں لڑکیاں گاڑی میں سوار ہو گئی تھیں پھر حدیبیہ کو بھی سڑک پر چلتے دیکھا تو پتا چل گیا کہ وہ بھی انہی جیسے مسئلے کا شکار ہے تو اسے بھی بلا لیا۔ وہ سب لڑکیاں چونکہ ایک ہی محلے کی تھیں سو تھوڑی دیر بعد ہی مین روڈ پر اپنے گھر کے قریب اتر گئیں۔ اب آخر میں حدیبیہ رہ گئی تھی۔ اس نوجوان نے شائستگی سے حدیبیہ سے اس کے گھر کا ایڈریس پوچھا اور اس کے سمجھانے پر اس نے گاڑی کا رخ اسی سمت موڑ لیا۔ دس منٹ لگے تھے انہیں گھر تک پہنچنے میں۔ حدیبیہ کا گھر چونکہ مین روڈ پر ہی تھا سو وہ اس نوجوان کا شکریہ ادا کرتی گاڑی سے نیچے اتر گئی۔ کپڑے اور چادر بری طرح بھیگ گئے تھے، حدیبیہ کی بدقسمتی کہ امی اور ابو، مامی کی عیادت کو گئے تھے اور حدیبیہ کو گاڑی سے اترتے ہوئے بوا نے دیکھ لیا تھا۔ وہ پہلے ہی ایک گھنٹا دیر ہو جانے پر ہول رہی تھیں اور بارش کی آواز میں بھی رکشے کی آواز پر کان دھرے بیٹھی تھیں...... کسی گاڑی کی آواز پر فوراً گیٹ کھول کر باہر جھانکنے پر حدیبیہ کو بھیگی

اور جواباً نوجوان کو مسکرا کر گاڑی بڑھا کر لے جاتے دیکھا تو ماتھا ٹھنک گیا۔

''ہاں تو بی بی کب سے یہ چکر چل رہا ہے' ماں، باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔'' حدیبیہ جیسے ہی بارش سے بچ کر تیزی سے برآمدے میں آئی بوا کے تخت پر بیگ پھینک کر چادر اتار کر نچوڑنے لگی مگر اب ناگواری سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ بوا کو حدیبیہ کی ہر بات اور ہر فعل پر اعتراض تھا تو وہ بھی انہیں کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی۔ ان کی بہت سی ناگوار باتوں کو اگر برداشت بھی کرتی تھی تو امی اور ابو کی تاکید تھی کہ وہ زبان کی کڑوی ضرور ہیں مگر دل کی بے حد اچھی ہیں اگر کچھ کہتی بھی ہیں تو برداشت کرلیا کرے۔

''کیا مطلب؟'' آج چونکہ امی نہیں تھیں سامنے تو وہ بھی اپنی ناگواری چھپا نہیں پائی۔ ایک تو بے وقت کی بارش نے موڈ ویسے ہی خراب کر رکھا تھا اوپر سے بوا کی غیر مناسب بات اور تشویش نے اسے بری طرح تپا ہی دیا۔

''بس کرو بی بی، یہ انجان بننے کے ڈرامے ابھی کیسے منک، منک کر بات کر رہی تھیں اس لڑکے سے نہ جانے کب سے یہ چکر چل رہا ہے اگر جو میں نہ دیکھ لیتی تو کسی وقت تم نے تو ماں، باپ کے سروں پر خاک ڈال دینی تھی۔'' وہ پتا نہیں کیا کچھ بولے جا رہی تھیں جب حدیبیہ نے انہیں چیخ کر چپ کرایا۔

''خدا کے لیے چپ ہو جائیں آپ بوا...... ایک تو پہلے ہی میرا دماغ خراب ہو رہا ہے اوپر سے پتا نہیں کیا، کیا اول فول بولے جا رہی ہیں آپ۔'' غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''ہاں بھئی ہماری باتیں تو تمہیں اول فول ہی لگیں گی۔ عشق کی پٹی آنکھوں پر بندھ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' بوا کون سا کم تھیں۔ فوراً ہی ہاتھ نچا کر بولیں۔

''امی نے ہمیشہ اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اللہ نے آپ کو اولاد نہیں دی۔ آج مجھے اس کی مصلحت سمجھ میں آئی ہے۔ آپ اس قابل ہی نہیں تھیں بوا۔ اولاد بھی اللہ ان لوگوں کو دیتا ہے جو اس کے لائق ہوں۔ آپ کی گندی ذہنیت نے تو ان کو بھی نہیں بخشا تھا...... میری فکر کرنے والے اور مجھ سے جواب دہی کرنے والے میرے والدین موجود ہیں اس لیے میری فکر میں گھلنا چھوڑ دیں اور آئندہ براہ مہربانی میرے کسی معاملے میں دخل اندازی مت کیجیے گا۔'' وہ بیگ اٹھا کر بولی اور متنفرانہ نظر ان پر ڈال کر اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس کا.... بے اولادی کا طعنہ بوا کو ایسا لگا کہ وہ ساکت کھڑی حدیبیہ کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتی چلی گئیں۔ حلق تک آئے باقی لفظ وہیں کہیں پڑے دم توڑ گئے تھے۔ امی، ابو کے آنے تک بھی حدیبیہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ پھر جب بوا نے روتے ہوئے اپنی مظلومیت اور حدیبیہ کی بدتمیزی کا حال اپنے الفاظ میں سنایا تو ابو نے غصے سے اسے بلا بھیجا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں حدیبیہ، آپ نے بوا سے بدتمیزی کی ہے، زبان چلائی ہے؟'' ابو کی اس طرح سرزنش پر وہ رو پڑی تھی۔

''ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے بیٹا کہ آپ کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھا سکتیں لیکن آپ کی بوا کی بات بھی ٹھیک ہے کہ خراب موسم میں آپ کو ایسے کسی سے لفٹ نہیں لینی چاہیے آپ کالج میں رہ کر انتظار کر سکتی تھیں۔ پرنسپل یا کلیریکل آفس سے فون کر کے مجھے مسئلہ بتا سکتی تھیں۔'' ابو نے اطمینان سے حدیبیہ کی پوری بات سنی پھر سمجھانے لگے۔

''تو یہ ساری بات وہ ایسے بھی تو سمجھا سکتی تھیں۔ انہوں نے ڈائریکٹ میرے کردار کو ہی نشانہ بنا لیا ابو۔'' وہ زود رنجے پن سے بولی۔

''ہاں تو شتر بے مہار چھوڑ دو میاں، بیٹی کو۔'' بوا کے لقمے پر حدیبیہ نے شکایتی نظروں سے ابو کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''دیکھا آپ نے۔''

''الفاظ چاہے جو بھی ہوں، وہ آپ سے بے حد محبت کرتی ہیں اور آپ کا بھلا چاہتی تھیں۔ آپ نے

بھی جواب میں بہت سخت الفاظ استعمال کر کے ان کا دل دکھایا ہے۔ مجھے پوری امید ہے ہماری بیٹی آئندہ ہمیں کسی شکایت کا موقع نہیں دے گی اور ہاں بہت دن ہو گئے حدیبیہ بیٹی کے ہاتھ کی چائے پیے ہوئے کیا خیال ہے۔'' ابو نے بات کا رخ دوسری طرف پھیرنا چاہا۔ جانتے تھے اور بہت بار دیکھ اور سن بھی چکے تھے کہ بوا بہت دفعہ نفیسہ بیگم اور حدیبیہ سے بہت سخت الفاظ میں بات کرتی ہیں لیکن مصلحتاً چپ رہ جاتے تھے کہ کچھ کہہ کر ان کی دل آزاری کرنا مقصود نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی تھیں۔

☆☆☆

بہن کی شادی کرتے ہی ثریا کو بے شمار وعدوں کی ڈورے باندھے جمال اپنے بہنوئی کی مدد سے دبئی چلا گیا تھا۔

اماں اور پھپھو کے بڑھاوا دینے پر مانی کی جرائتیں بڑھ چکی تھیں۔ ثریا اپنا آپ بے حد چھپا کر رکھتی پھر بھی وہ اسے ستانے کا کہیں نہ کہیں موقع نکال ہی لیا کرتا...... انہی دنوں ڈیڑھ سال بعد جمال نے چکر لگایا تو وہ اسے سامنے پا کر بری طرح رو دی اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو رو، رو کر سنایا۔

''مجھے بتاؤ میں کیا کروں تمہارے لیے...... ڈھونڈ ڈھانڈ کر بڑی مشکل سے تمہارے ابا کا ایڈریس کسی سے لیا اور ان سے جا کر رشتے کی بات بھی کی۔ انہوں نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ان کا رویہ اچھا خاصا بے عزت کر دینے والا تھا میرے ساتھ...... انہوں نے کہا کہ ان کی بیٹی کی نہ صرف بات طے ہو چکی ہے بلکہ شادی بھی ہونے والی ہے۔'' جمال نے بے بسی اور دلگرفتگی سے اسے بتایا۔

''تم...... تم بھائی سے ملتے جمال۔'' ثریا نے تڑپ کر کہا۔

''تمہیں تو پتا ہیں ناں سارے حالات، میری اماں مجھے اپنے آوارہ بھتیجے سے بیاہ کر ساری عمر کے لیے نوکرانی بنا کر رکھنا چاہتی ہیں۔'' ابھی اس کی بات منہ ہی میں تھی کہ جھٹکے سے کسی نے اسے چٹیا سے پکڑ کر کھینچا۔

''بے حیا، بے غیرت، شرم نہیں آتی غیر مردوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑی ہے نامراد...... میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ چھت پر کیوں اتنی، اتنی دیر لگا کر آتی ہے کم بخت......''

''دیکھیں آنٹی آپ اسے اس طرح ماریں مت۔'' جمال نے کہا تو اس کی طرف پلٹیں۔

''جاؤ میاں تم اپنا راستہ ناپو...... جب اپنا خون ہی گندا ہو تو کسی کا کیا دوش لیکن ایک بات سن لو غور سے...... تم کو اگر آرام سے جانے کا کہہ رہی ہوں تو اپنے گھر کے مردوں کو فضول جھگڑوں میں نہیں پھنسانا چاہتی...... ورنہ ایک منٹ میں تمہاری وہ درگت بنواؤں گی کہ سدا یاد رکھو...... اب جاؤ اور آئندہ اس کے آس پاس تو کیا محلے میں بھی نظر آئے تو ٹانگیں تڑوا کر رکھ دوں گی تمہاری۔'' اماں چیخ کر بولیں۔ جمال کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر جانتا تھا کہ اس وقت اس کی پوزیشن کتنی کمزور ہے سو درمیانی دیوار پھلانگ کر اپنی چھت سے فوراً نیچے چلا گیا۔ اماں اسے بالوں سے پکڑے، پکڑے نیچے لائی تھیں اور فرش پر دھکیل کر ایک بار پھر مارنا اور کوسنا شروع کر دیا۔

''بس کرو ساجدہ، میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ نکاح کر دو اس کا مانی کے ساتھ...... مگر تم ہی کہتی رہیں کہ کچھ دن رک جاؤ...... اب دیکھ لو نتیجہ...... اب مانی کو پتا چلا تو وہ بھی پتا نہیں مانتا ہے یا نہیں اس سے شادی کو...... آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا بھلا آسان کام ہے؟'' نام نہاد مامی نے تنفر سے کہا۔

''اچھا، اچھا بھابی...... اب گھر کے مردوں تک بات پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے، تمہارا مانی بھی کم نہیں ہے۔ کیا میں نہیں جانتی اسے، تم بس جلدی سے تیاری کرو...... بازار سے جلدی، جلدی میں ضروری خریداری کر آتے ہیں، بھائی اور مانی آتے ہیں تو آج ہی فوری نکاح کا بندوبست کر لیں۔ میں اب مزید دیر نہیں کرنے کی۔ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو دنیا تو دنیا اس کے

باپ نے بھی مجھے ہی قصوروار ٹھہراتا ہے کہ سوتیلی ماں تھی خیال ہی نہیں کیا، اب یہ تھوڑی پتا ہے کہ سب کو کہ لڑکی نے خود ہی آنکھ مٹکا کر رکھا تھا۔ ماں کہاں تک پہرے داری کرتی، اٹھ تو کم بخت تیری تو میں آکر خبر لیتی ہوں۔'' اماں نے ایک بار پھر اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور کمرے میں لے جا کر بند کر دیا۔ پھر باہر سے تالا لگا دیا۔ منی کو دونوں نند، بھاوج ساتھ ہی لے گئیں۔ ثریا زور، زور سے رونے لگی۔

''کھولو...... کھولو مجھے...... مجھے نہیں رہنا اس گھر میں، مجھے مار دو، زہر دے دو لیکن تمہارے اس آوارہ مائی سے شادی نہیں کروں گی ابا، بھائی آ کر دیکھو...... مجھے بچا لو......'' وہ دروازہ بجا رہی تھی اور زور سے چلا رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد جب اس کی آہ و بکا ذرا ماند پڑنے لگی تو کسی نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔

☆☆☆

کالج سے چھٹی تھی...... حدیبہ گھر پر ہی تھی۔ امی، مامی کے ساتھ کسی خاندانی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ ابو کسی دوست سے ملنے گئے تھے، بوا کچن میں لگی ہوئی تھیں جبکہ حدیبہ بے حد بور ہو رہی تھی۔ لاؤنج میں آ کر اس نے فون اٹھایا اور امیج سے بات کرنے لگی اور اس وقت فون رکھا جب بوا کو کھانے کی ٹرے لے کر آتے دیکھا۔ پچھلی دفعہ بوا سے ہونے والی جھڑپ کے بعد وہ ان سے کم ہی مخاطب ہوتی تھی اگرچہ ان کی باتیں اب بھی وہی تھیں دل جلانے والی۔

''اب اس موئے فون سے فرصت مل گئی ہو تو کھانے کو بھی شرف بخش دو۔'' ان کا لہجہ اب نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو چلا تھا۔ امی، ابو شاید زیادہ محسوس نہ کرتے ہوں گے مگر حدیبہ کو ان کی ہر بات دل پر لگتی محسوس ہوتی۔

''ایسے ہی شوق ہے آپ کو خود کو تھکانے کا، کیا تھا اگر ایک کام والی رکھ لیتے ہم لوگ بھی۔ لوگوں کے گھروں میں ملازمین کی فوج ہوتی ہے اور یہاں کپڑے بھی خود دھوؤ، استری بھی خود کرو، برتن بھی دھو اور تو اور جھاڑو پوچا بھی خود کرنا پڑتا ہے۔ جس سے صاف بات ہے مجھے تو الرجی ہوتی ہے حالانکہ ہم افورڈ کر سکتے ہیں مگر پتا نہیں کیوں نہیں رکھتے۔'' اس نے اپنا پسندیدہ کھانا تناول کرتے ہوئے ایک بار پھر بوا کے تھکے، تھکے چہرے کو دیکھ کر اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑا۔

''بس بھی کرو بی بی...یہ ملازمہ رکھنے کی ضد...... کون سا تم اٹھ کر کوئی ہاتھ پاؤں چلا لیتی ہو، سارا کام تو تمہاری ماں اور میں ہی کرتے ہیں پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کاہے کی تکلیف ہے۔'' بوا بھی چمک کر بولیں۔ حدیبہ ایک بار پھر منہ بنا کر رہ گئی۔

''دیکھو میری بچی! بڑے جو بھی کہتے ہیں اس میں ان کے سالہا سال کے تجربات کا نچوڑ شامل ہوتا ہے۔'' بوا بولی تھیں۔ ''ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو...... کتنے دن سے تیل نہیں لگایا تم نے کیسے روکھے بال ہو رہے ہیں۔ ایک ہی بیٹی ہو اپنی ماں کی پھر بھی تمہارا ایسی باتوں کا خیال وہ کم ہی رکھتی ہے۔'' وہ ہاتھ دھو کر آئی تو انہوں نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اپنے پیروں کے پاس ہی بٹھا لیا۔

''آپ بیٹی کو اپنے چنگل سے آزاد چھوڑ دیں تو امی بیچاری کو اپنی محبت جتانے کا موقع ملے ناں۔'' حدیبہ نے سوچا ضرور پر کہا نہیں کہ تب امن کا خطرہ درپیش تھا۔ بوا کے ہاتھ بڑی مشاقی سے اس کے گھنے بالوں میں چل رہے تھے اور سچ بھی یہی تھا کہ اس کے لمبے اور گھنے بال بوا کی محنت اور دیکھ بھال کا ہی نتیجہ تھے۔

☆☆☆

اس نے پوری آزادی سے ایک آسودگی بھری سانس لی اور گھوم پھر کر دو کمروں، ایک برآمدے، باتھ روم اور کچن پر مشتمل اس مختصر پورشن کا گھوم پھر کر جائزہ لینے لگی جہاں نہ تو کسی سوتیلی اماں کی ناراضی کا ڈر تھا نہ ان کی بھابی کا اور نہ ہی اماں کے آوارہ بھتیجے مائی کا...... اس روز اماں اور اس کی بھابی کو رشتے پر جاتا دیکھ کر جمال بیرونی دروازے پر تالا پڑا دیکھ کر ہی ساری صورت حال سمجھ گیا تھا اور خالی اور سنسان گلی دیکھ کر جب اس نے سن گن لی تھی تو اندرونی کمروں سے ثریا کی چیخیں بھی سنائی دے گئی تھیں جو وہ باہر نکلنے کے لیے مار رہی تھی، اس نے تھوڑی دیر رک کر کچھ سوچا اور ایک بار پھر اپنے خالی گھر کی چھت پھلانگ کر ثریا کے گھر کی چھت سے ہوتا ہوا ان کے صحن میں اتر آیا تھا اور آ کر اس کمرے کو جس کے باہر کنڈی لگی ہوئی تھی کھول دیا تھا۔ ثریا، جمال کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر وہ گنگ رہ گئی تھی اور اپنی حیرت پر قابو پاتے ہی روتے ہوئے اسے سارا احوال کہہ سنایا تھا۔

''مجھے لے چلو یہاں سے جمال، اس گھر، ان لوگوں، اس شہر سے کہیں دور...... یہ لوگ نکاح کا بندوبست کرنے گئے ہیں، میں ساری زندگی اس دوزخ میں نہیں رہ سکتی۔'' جس پل روتے ہوئے ثریا نے کہا تھا۔ جمال نے بھی فوری ایک فیصلہ کیا تھا اور ثریا کو اپنا ضروری سامان سمیٹنے کا کہہ کر وہ خود اپنے گھر آ گیا تھا۔ اپنا ضروری سامان، کاغذات اور قیمتی اشیا لے کر ان دونوں نے چند ہی گھنٹوں میں اپنا گھر تو کیا یہ شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسے لے کر اپنی بہن کے گھر آ گیا تھا۔ بہن کو مختصر ساری صورت حال بتائی تھی۔ اس کا بہنوئی اس کا پہلے سے رشتے دار بھی تھا اور اب دبئی میں اکٹھے کام کرنے کی وجہ سے خاصی دوستی بھی تھی تو ان دونوں (بہن، بہنوئی) نے اس کی شادی کروانے میں اس کی بے حد مدد کی تھی۔ دونوں نے چونکہ پندرہ دن بعد دبئی واپس چلے جانا تھا تو طے یہی پایا تھا کہ ان کے گھر کا ایک پورشن جہاں پہلے اس کے بہنوئی کے بھائی کی فیملی آباد تھی انہوں نے یہ پورشن اس کے ہی بہنوئی کو فروخت کر دیا تھا جو آج کل خالی تھا۔ یہ لوگ وہاں شفٹ ہو جائیں اور جمال اس کا باقاعدہ کرایہ دیا کرے گا۔ جمال اور اس کی بہن نے گھر کی انتہائی ضروری چیزیں لے کر اس پورشن کو... فی الحال رہنے کے قابل بنا دیا تھا۔ باقی چیزیں بھی آہستہ آہستہ آ ہی جاتی تھیں۔ چلتے، چلتے ثریا نے اپنی سوتیلی ماں کو ایک بڑی زک یہ پہنچائی تھی کہ اس کی الماری سے تمام نقدی اور سونا جو کہ اچھی خاصی مالیت کا تھا اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

اب ثریا یہاں بے حد خوش تھی اسے کوئی فکر نہیں تھی کہ اس کے اس اقدام سے اس کے پچھلوں پر کیا گزری ہو گی، اس کے خیال میں وہ حق پر تھی اور اس پر جتنی زیادتیاں اس گھر میں کی گئی تھیں اب یہ اس کا حق بنتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرتی۔ جمال کی بہن بے حد اچھی عورت تھیں وہ اپنی بھابی کی وجہ سے ملنے والی دوسراہٹ سے بے حد خوش تھیں کیونکہ پہلے اسے یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ دو چھوٹے بچوں کے ساتھ وہ اکیلے گھر میں کیسے رہیں گی۔ کیونکہ پہلے تو اس پورشن میں ان کے دیور کی فیملی آباد تھی لیکن اب ان کے جانے کے بعد وہ اکیلے رہنے سے پریشان تھیں۔ یہاں سے ثریا کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔ بے جا پابندی اور بے جا آزادی دونوں ہی فرد کی زندگی میں بگاڑ لاتے ہیں، ثریا نے جو زندگی کا پہلا رخ دیکھا تھا اس میں بہت پابندیاں تھیں، سختی تھی، محبت اور اعتبار کا فقدان تھا، اس کے حالات کے پیش نظر جمال کی طرف سے اسے تحاشا محبت ملی تھی، اعتبار ملا تھا مگر اس کی شخصیت میں جو عنصر تبدیلی لایا تھا وہ تھی بے جا آزادی...... جمال تو چند ہی دنوں بعد واپس دبئی چلا گیا تھا، اس کی بہن نے بھی ثریا پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کی تھی نتیجتاً اس نے جمال کی محبت اور اعتبار کا تو مثبت اثر لیا تھا مگر آزادی اور بے جا آزادی کو اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا سو توازن نہیں رکھ پائی تھی۔

جمال کے دبئی جانے کے بعد دو ماہ بعد اس نے پہلی فرمائش ٹی وی اور ڈی وی ڈی پلیئر منگوانے کی کی تھی جو کہ چند ہی دن میں پوری ہو گئی تھی۔ فلمیں دیکھنا اور جی بھر کر دیکھنا اس کا وہ شوق تھا جسے کبھی پورا نہیں ہونے دیا تھا اماں نے، نہ اماں کی بھابی نے، سو اب رات دن کی تخصیص کے بغیر وہ یہ کام کیا کرتی تھی۔ جمال کی بہن اپنے بچوں سمیت دن میں کئی بار چکر لگاتی، وہ گھر کی فکر کیے بغیر اپنے اسی شوق میں الجھی ملتی تھی۔

دولت اور اختیار کا صحیح استعمال بہت کم لوگ کر پاتے ہیں...... اور ثریا نے ان دونوں چیزوں کا بے جا استعمال شروع کیا تھا۔ انہی دنوں اس نے محلے میں نئی، نئی دوستیاں بھی گانٹھ لی تھیں، اسی کے جیسے شوق اور مشاغل رکھنے والی عورتیں اس کی دوست بن گئیں۔ ایک دو تو ایسی تھیں جنہوں نے اس کے ہاتھ میں کچھ کھلا پیسہ دیکھ کر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ جمال کی بہن نے دبے، دبے لفظوں میں اسے سرزنش کی تھی جب ثریا کے دو کمروں کے چھوٹے سے گھر میں ایک نوجوان ملازمہ کو دیکھا تھا، وہ اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث ایک ہی گھر ہونے کی وجہ سے ہفتہ دس دن چکر نہیں لگا سکتی تھی، ہاں اس کے بچے آتے جاتے تھے اپنی مامی کے پاس ٹی وی دیکھنے کے لیے ثریا کو توفیق نہیں ہوئی تھی کہ جا کر نند کی خیر خیریت ہی دریافت کر آتی حالانکہ وہ دن میں دو بار تو ضرور ہی آتی، کچھ اچھا کھانے کا بنایا ہوتا تب ہی ضرور بھیجتیں اس کے طور طریقے اب جمال کی بہن کو کھٹکنے لگے تھے، اس نے دبے لفظوں میں فون پر بھائی سے بھی بات کی تھی مگر وہ ہنس کر ٹال جاتا کہ ثریا نے چونکہ بہت محرومیاں دیکھی ہیں تو اب اس کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے ورنہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ چپ ہو گئی تھیں مگر اب جب ملازمہ کو دیکھا تو حیران ہی رہ گئیں۔

''ثریا بھابی گھر کا کام ہی کتنا ہوتا ہے جو آپ نے ملازمہ بھی رکھ لی...... اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' تیز اور چالاک سی لڑکی جو اس کے پہلی نظر میں ہی بے حد بری لگی ملازمہ کے روپ میں دیکھ کر اس نے ثریا سے کہا جو حسب معمول ٹی وی کی اسکرین پر نظریں گاڑھے ہوئے پتا نہیں کیا شوق تھا اس عورت کا جو روز بروز بڑھ ہی رہا تھا۔ جمال کی بہن کے انداز میں ناگواری محسوس کر کے ثریا کو بھی ناخوشگواریت کا احساس ہوا۔

''آپا آپ کو شاید پتا ہو کہ میں دو جی سے ہوں اور ایسی حالت میں گھر کا کام کرنا تو ایک طرف کھڑا ہونا بھی محال ہے، دوسرے اب مجھے اپنے گھر کے ہر کام کے لیے آپ کی اجازت لینی پڑے گی کیا۔ جبکہ آپ کے بھائی کو میں بتا چکی ہوں۔'' کچھ دن پہلے تک کی ڈرپوک سی بھابی کو ایسی ٹون میں بات کرتا دیکھ کر وہ دنگ رہ گئیں۔

''نہیں یہ تو بات نہیں ہے، تم مالک ہو اس گھر کی جو چاہے کرو لیکن مجھے بتا دیتیں تو میں کوئی قابل بھروسا عورت ڈھونڈ دیتی تمہیں۔'' وہ کہتے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس کے انداز سے ان کا دل ایسا کھٹا ہوا کہ بھابی کی گود ہری ہونے کی خبر بھی ان کو خوش نہ کر سکی......

''یہ بھی قابل بھروسا ہے، یہیں میری سہیلی کے گھر بھی کام کرتی ہے اسی نے رکھوا کے دی ہے۔'' اس نے جتاتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتی باہر نکل گئیں۔ ثریا نے ہونہہ کہہ کر دوبارہ سے اپنی توجہ ٹی وی کی طرف مرکوز کر دی۔

☆☆☆

اریج آج اس کے گھر آئی ہوئی تھی سو حدیبیہ کے جوش اور خوشی کا اور ہی عالم تھا، دونوں نے کچن میں اکٹھے مل کر اپنی پسندیدہ ڈشز بنائی تھیں اور اب کمرے میں گھسی بے سروپا باتیں کرتے ہوئے مسلسل ہنسے جا رہی تھیں، بے فکری کا جوبن کوئی بات نہ بھی ہو تب بھی چہرے پر مسکراہٹ کے پھول خود بخود کھلا دیا کرتا ہے، ان کے کمرے سے آنے والی دبی، دبی ہنسی کی آواز بوا کو خواہ مخواہ کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

''اے بھابی! تم تو بالکل ہی بے پروا ہو کر بیٹھ جاتی ہو بیٹی کی طرف سے...... اندر بیٹھی دونوں پتا نہیں کیا باتیں کر رہی ہیں؟ جو قہقہے رکنے کا نام نہیں لے رہے، لڑکیوں کو اتنی کھلی چھوٹ دینا بھی اچھا نتیجہ نہیں لاتا۔'' آخر تنگ آ کر انہوں نے سویٹر بنتی نفیسہ بیگم کو ہی لتاڑ دیا۔ وہ چونکہ عادی تھیں سو کوئی خاص نوٹس نہیں لیا انہوں نے۔

''آپا بچیاں ہیں، یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے ہر بات پر خواہ مخواہ ہنسی آئے چلی جاتی ہے، ہماری بچیاں کیسی ہیں ہمیں پتا ہے، وہ ہمارے اعتماد کو کبھی نہیں توڑیں گی، آپ اِدھر بیٹھیں ایک بات کرنی تھی آپ سے۔'' نفیسہ بیگم نے ان کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

''کل بھائی جان نے مجھ سے حدیبیہ کے رشتے کے لیے بات کی ہے، عفان ماشاء اللہ سے اب برسرِ روزگار ہو گیا ہے، رات آپ کے بھائی سے بھی بات کی تھی۔ انہیں اور تو کوئی اعتراض نہیں ہے بس یہی کہا کہ حدیبیہ کی مرضی معلوم کر لو اور ابھی بے شک رسم کر لیں مگر شادی حدیبیہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد...... آپ کیا کہتی ہیں؟'' نفیسہ بیگم نے اپنے خاوند کی دیکھا دیکھی بوا کو ہمیشہ گھر کا ایک اہم فرد جانا تھا اور ہر معاملے میں ان کی رائے کو مقدم جانا تھا...... اور یہ تو ویسے بھی ان کی چہیتی بھتیجی تھی جسے بے شک بوا کی باتوں سے بہت کوفت ہوتی تھی مگر وہ یہ بات بھی جانتی تھی کہ وہ اس کی محبت میں کتنی شدت پسند ہیں۔ بوا بھی سب بھول بھال کر نفیسہ بیگم کے پاس بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

گزرتے وقت میں جہاں جمال مزید دولت مند ہوا تھا وہیں اس کی محبت بھی دوچند ہو گئی تھی کہ وہ ثریا کو اپنے لیے بھاگوان جانتا تھا تو ویسے بھی وہ اس کے دو جڑواں بچوں کی ماں تھی۔ مگر ماں بننے کے بعد بھی ثریا کے رنگ ڈھنگ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ وہ اپنی سرگرمیوں میں اور شیر ہو گئی تھی...... گھر سارا ملازمہ کے حوالے تھا، گھر میں ہوتی تو سوتی یا فلمیں دیکھتی یا پھر سہیلیاں ہی اس کی زندگی کا محور و مرکز تھیں۔ بچے اس نے پیدا کر کے جمال پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ ملازمہ جو پہلے جز وقتی تھی اب اس کا معاوضہ بڑھا کر اسے کل وقتی کر لیا تھا۔

اس لڑکی کو بھی اور کیا چاہیے تھا اس کے دونوں ہاتھ گھی میں اور سر کڑھائی میں تھا، جب بچے چھوٹے تھے تو ان کو افیم چٹا کر سلا دیا کرتی تھی۔ وہ تو ثریا اور جمال کی قسمت اچھی تھی کہ مسلسل اس عمل سے وہ صرف سست پڑے تھے اور کوئی منفی ردِعمل نہ ہوا تھا ان پر...... جمال کی بہن بھی ثریا کی فطرت جان کر خود پیچھے ہٹ گئی تھی اگرچہ اب بھی بھابی اور بچوں کی خبر گیری کو آتی تھیں، ملازمہ کو بھی روک ٹوک کر کے جاتی تھیں، فون پر اس نے بارہا جمال کو اس کی بیوی کی گھر اور بچوں سے غفلت سے خبردار کرنا چاہا تھا مگر وہ ہنس کر ٹال جاتا۔

☆☆☆

یہ ان کا کالج میں فائنل ایئر تھا جب امتحانوں سے کچھ عرصہ پہلے کالج کی طرف سے شمالی علاقہ جات جانے کا غلغلہ اٹھا۔ اریج اور حدیبیہ بے حد پُرجوش تھیں۔ مگر جب بوا کو پتا چلا تو گویا گھر میں ایک طوفان ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''غضب خدا کا جب ماں، باپ ہی خود بے راہ روی کی طرف جانے والے راستوں کی نشاندہی کریں اور حوصلہ افزائی بھی کریں تو پھر کیوں نہ تباہی پھیلے، اب لو بھلا بتاؤ، یہاں سے تم لوگ بھیجو بچیوں کو ٹرپ پر اور وہاں وہ شتر بے مہار جانے کیا، کیا گل کھلاتی پھریں، اب دو سو لڑکیوں کو سات آٹھ استانیاں بھلا خاک سنبھال پائیں گی۔'' انہوں نے کالج لیکچرارز کا کہا۔ حدیبیہ نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے اور خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا مگر آنسو بھری نظروں سے بالکل پُرسکون انداز میں سبزی بناتی ماں کو ضرور دیکھا تھا جو نند کی کڑوی کسیلی ایسے سن رہی تھیں جیسے بہت خوشگوار ماحول میں خوشگوار باتیں ہو رہی ہوں۔

''میں نے ابو سے اجازت لے لی ہے اور میں ضرور جاؤں گی۔'' اسے بوا کے رخنہ ڈالنے کا ڈر تھا۔ اس لیے زور دے کر اپنی امی کو مخاطب کیا بوا کو یکسر نظر انداز کر کے۔

''ایسی منہ زوری لڑکیوں کو زیب نہیں دیتی۔'' بوا اب کسی لڑکی کا قصہ سنانے لگیں جو ماں، باپ کو کالج ٹرپ پر جانے کا بہانہ بنا کر ہی گھر سے نکلی تھی مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ گھر سے تو یہ کہہ کر گئی مگر آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

''لڑکیوں کے ذہن میں ہو یا نہ ہو یہ بات...... مگر آپ جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے رویے اور اپنی

زبان سے لڑکیوں کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کردیتی ہیں اور مجھے وہ دن بھی دور نہیں لگ رہا جب آپ مجھے بھی یہ قدم اٹھانے پر مجبور کردیں گی۔ سن لیا آپ نے۔''

حدیبیہ جو کافی دیر سے اپنی ماں کی خاموشی اور بوا کی لن ترانیاں سن رہی تھی زیادہ دیر صبر نہ کرسکی اور بالآخر پھٹ ہی پڑی، اس نے چلا کر بوا کو کہا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں جاکر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھالی، بات سن کر امی کے ہاتھوں سے چھری گر کر کٹی سبزی پر جاپڑی جبکہ بوا ایک بار پھر ساکت رہ گئیں۔

''کیا اپنے بچوں کو صحیح راہ دکھلانا غلط ہے یا میں ایک بار پھر غلط کررہی ہوں۔'' دماغ میں سوچوں کے اودھم مچاتے سمندر میں جو سوچ سب سے اوپر ابھر کر آئی وہ یہ تھی۔

☆☆☆

ثریا اب زیادہ خود اعتماد، زیادہ خوب صورت اور زیادہ دولت مند ہوگئی تھی۔ آج بہت دنوں بعد وہ گھر پر تھی سو جمیلہ (نوکرانی) کا موڈ کچھ خراب ہی تھا کہ مالکن کی غیر موجودگی اسے کچھ زیادہ فائدہ پہنچاتی تھی۔ ماہانہ رقم تو اس گھر سے بندھی تھی سو بندھی تھی۔ روزانہ کا کھانا وہی تیار کرتی تھی سوائے بھی ثریا نے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اپنا اور بچوں کا کھانا لے جایا کرے، اس کے علاوہ اس گھر میں اس کی عیاشیوں کا سامان بہت تھا، برتن اور کپڑے دھونے والے صرف، صابن سے لے کر ثریا کا دبئی سے آنے والا روز مرہ استعمال کا سامان اس صفائی سے اڑائے لے جاتی کہ اس عاقبت نا اندیش عورت کو احساس ہی نہیں ہوپاتا تھا۔ ایک دفعہ اگر کبھی ثریا اس کے گھر جاکر دیکھ لیتی تو آدھے سے زیادہ استعمال کی چیزیں، عام برتن سے چھوٹی موٹی چیزیں اس کے گھر کی تھیں۔ وہ حیرت سے گنگ رہ گئی جب اس نے اپنے سات سالہ بیٹے کو ایک ماہر رقاص کی طرح رقص کرتے دیکھا۔

''ارے دانی میری جان، کہاں سے سیکھا تم نے اتنا پیارا ڈانس، میں تو اتنی کوشش سے بھی نہیں سیکھ سکی، ہائے کتنا شوق تھا مجھے۔'' بجائے اس بچے کو روکنے کے، سرزنش کرنے کے اس نے اسے بلا کر گلے سے لگایا تھا، آج غور سے دیکھا تھا تو پتا چلا تھا ورنہ اسے تو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے دونوں بچوں کی عادات کیسی ہیں، وہ کیا کھانا پسند کرتے ہیں، ہاں جمیلہ ہی سب کچھ جانتی تھی اس کے بچوں کے بارے میں، کب وہ ٹیوشن جاتے، کب قاری کے پاس جانا ہے، اسے تو اسکول اور ٹیوشن سے بھی زیادہ دلچسپی نہ ہوتی اگر جو جمال کا شوق نہ ہوتا، وہ ہر فون پر بچوں کی پڑھائی کے بارے میں خاص طور پر پوچھتا۔ اپنے آپ کو بچوں کی ذمے داری سے آزاد کرا کے وہ خوش تھی کہ اس نے اپنی من پسند زندگی بھی حاصل کرلی ایک بے حد چاہنے والا اور جان اور دولت لٹانے والا شوہر اس کا تھا، ذاتی گھر تھا، پیارے، پیارے بچے تھے، وہ تو کسی بھی نقصان میں نہیں رہی تھی۔ اس نے کبھی بھول کر اپنے پچھلوں کو یاد نہیں کیا تھا...... نہیں جانتی تھی کہ اولاد تو بہت نازک پودے کے مانند ہوتی ہے جن کی مناسب وقت پر توجہ اور دیکھ بھال سے آبیاری نہ کی جائے تو وہ مرجھاتے ہیں کملا جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ بے وقت کی توجہ سے پھول پھل تو جاتے ہیں مگر خود رو جھاڑیوں کے مانند اس کے بیٹے دانیال کی ہمہ وقت بہن کے ساتھ رہنے سے کچھ زنانہ عادات پروان چڑھ رہی تھیں۔ گھر میں ہر وقت فلموں کے ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا، رہی سہی کسر ماں کی طرفداری نے پوری کردی تھی۔ اب وہ بھی کبھار جب ماں موجود ہوتی بہن کے کپڑے پہن کر لپ اسٹک اور میک اپ کے دیگر لوازمات لگا کر اپنے اس زنانہ شوق کی تسکین کرلیتا جو خالصتاً اس کی غافل اور عاقبت نا اندیش ماں کی دین تھا۔

''ارے دانی تو، تو بالکل دلہن بن گیا۔'' نوکرانی ایسی صورت حال میں خوش ہو کر کہتی جبکہ اس کی بیٹی رانیہ کی شخصیت ماں کے برعکس دبلی، دبی سی تھی۔ وہ لڑکی تھی اور لڑکیاں لڑکوں کی نسبت ماں، باپ کی توجہ زیادہ چاہتی ہیں، رانیہ کو اپنے گھر کی نسبت اپنی پھپھو کے گھر کا ماحول زیادہ پسند تھا، اس لیے جیسے ہی وہ اسکول سے آکر بیگ پھینک کر پھپھو کے گھر بھاگ گئی تھی جہاں کا پرسکون اور محبت بھرا ماحول اس کے اندر کی محروم لڑکی کی تسکین کرتا تھا، اگرچہ پھپھو کے بچے اس سے بڑے تھے، اس سے اس کی دلچسپیاں شوق و مشاغل مختلف تھے مگر پھر بھی اسے اپنے گھر سے زیادہ پھپھو کا گھر اچھا لگتا، وہ روز سوچتی کہ کاش ایسا ہو کہ آج تو اس کی امی بھی پھپھو کی طرح اس کی پسند کا کھانا بنائے اس کی منتظر ہوں مگر ہر روز اس کی امید دم توڑ جاتی، امی گھر پر ہوتیں تو یا تو فلموں میں مگن ہوتیں یا سوئی ہوئی ملتیں، جمیلہ ہی اسے کھانا دیتی جس میں یقیناً ایک ماں کی محبت مفقود ہوتی تھی۔

☆☆☆

حدیبیہ کے ماموں، ممانی آج باقاعدہ رشتہ لے کر آئے ہوئے تھے، ایرج اور حدیبیہ حسب معمول کمرے میں گھسی ہوئی تھیں۔ امی اور بوا نے ہی مل کر کھانے کا انتظام کیا تھا۔

''بھابی تم تو سختی ہی نہیں کرتی ہو بیٹی پر، ذرا جو عقل ہوا سے...... اب یہی دیکھ لو ذرا فکر نہیں ہے کہ دو بوڑھیاں کچن میں لگی پڑی ہیں، اٹھ کر ذرا مدد ہی کرادے، یہی رشتے جب سسرالی رشتوں میں بدلتے ہیں تو جن باتوں پر اب خوش ہو کر ہنستے ہیں وہی باتیں پھر بری طرح چبھتی ہیں۔''

''میں نے خود ہی آج منع کردیا تھا حدیبیہ کو کہ میں خود کرلوں گی ویسے وہ کروا تو لیتی ہے ناں چھوٹے موٹے کام، سچ مائیں تو سختی کو میرا دل ہی نہیں مانتا...... ایک تو وہ فطرتاً اچھی بچی ہے پھر میں بھی سوچ کر زیادہ روک ٹوک نہیں کرتی ہوں کہ پرائے گھر میں جاکر نہ جانے کیسے حالات ہوں، اپنے ماں، باپ کے گھر تو بچیاں پوری آزادی سے زندگی گزاریں پھر زیادہ روک ٹوک بھی بچیوں کو باغی کردیتی ہے۔ صفائیاں بھی ساری اسی نے کی ہیں کل سے لگی ہوئی تھی۔'' امی نے حدیبیہ کی طرف سے صفائی دے کر بوا نوالہ اور دیکھو شیر کی آنکھ کے مقولے کی قائل تھیں مگر بوا کی اس قدر سختی اور ترش رویے کے بعد ان کے پاس گنجائش ہی نہیں بچتی تھی۔ بیٹی سے سخت لہجہ یا انداز اپنا میں سو در گزر کر جاتیں اور بوا کو یہی بات ان کی حدیبیہ کو دی گئی بے جا آزادی لگتی تھی۔

''اچھا بھابی تمہاری بھابی کے انداز اور باتوں سے لگ رہا ہے کہ منگنی کرنے کا تہیہ کیے بیٹھی ہیں، میں تو

کریں ورنہ یہ غیر شرعی جھنجٹ میں ہمیں نہیں پڑنا۔ کئی جگہوں پر دیکھا سنا منگنی کے بعد لڑکا لڑکی کے درمیان کوئی پردہ نہ رہا پھر اسی بات کو جھگڑا بنا کر کئی گھروں میں رشتے ٹوٹ گئے اور تو اور لڑکے خود ہی بدظن ہو گئے کہ جب لڑکی میرے ساتھ اتنی فری ہے تو اور غیر محرموں کے ساتھ ایسے ہی ہوگی اور حدیبیہ کی تو ویسے بھی اپنے کزنوں کے ساتھ بہت بے تکلفی ہے۔" بوا کی یہ بات سخت سہی ان کے دل کو لگی ضرور۔

"بھائی کہہ رہے ہیں کہ عفان کو چھ ماہ کے کورس پر غیر ملک جانا ہے تو وہ منگنی ابھی اور شادی اس کے واپس آنے کے بعد کریں گے۔"

"بھئی ہمیں نہیں کرنی کوئی منگنی شگنی ابھی بتاؤ اپنے بھائی اور بھاوج کو...... جب لڑکا خیر سے واپس آجائے تب ہی شادی کریں گے ہم۔" بوا کی بات اور لہجہ دوٹوک تھا۔ امی چپ رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

جمال کی بہن ایک صدمے کی سی کیفیت میں بیٹھی تھیں۔ انہیں اپنی بھابی کی غافل اور بے پروا خصلتوں کا اندازہ تو بہت پہلے ہی ہو گیا مگر جب بھائی نے ہی آنکھیں بند کر رکھی تھیں تو وہ اکیلی کیا کر سکتی تھیں۔ سو چپ ہو جاتیں اتنے پیارے بچوں کی طرف سے ان کی ماں کی بے پروائی انہیں سخت دکھ دیتی...... رانیہ اپنی ماں کی نسبت پھپھو سے زیادہ قریب تھی سوائے تو وہ سنبھال لیتی تھیں، خیال بھی رکھتی تھیں مگر بچی میں ماں کی عدم توجہی سے جو احساسِ کمتری پنپ رہا تھا وہ اسے ختم کرنے سے قاصر تھیں مگر دانیال کا کیا کرتیں اس سے انہوں نے بہت بار بہن کے کپڑوں میں ملبوس ہونٹوں اور رخساروں کو میک اپ کے لوازمات سے رنگے دیکھا تھا اور سختی سے سرزنش بھی کی تھی مگر وہ ماں کا سر چڑھا تھا، کہاں ان کو خاطر میں لاتا، بہت بار...... بے عزت ہونے کے بعد وہ ہر بار یہی سوچتیں بھاڑ میں جائے یہ عورت وہ آئندہ اس کے گھر قدم نہیں رکھیں گی مجبور ہو کر بھاوج سے باز پرس کرنے چل پڑتیں ایک بار پھر منہ کی کھانے کے لیے۔

"تو کیا ہوا آپا...... میں تو ڈر ہی گئی کہ پتا نہیں کیا غضب ہو گیا۔ دانیال لڑکا ہے اور لڑکا ہی رہے گی۔ ایسی چھوٹی، چھوٹی معصومانہ حرکتیں کرنے سے اس کی جنس تھوڑی تبدیل ہو جائے گی، آپ کو تو فخر کرنا چاہیے کہ آپ کا بھتیجا اتنا پیارا ڈانس کرتا ہے کہ انڈیا کے اداکار بھی دیکھ لیں تو آنکھیں ملتے رہ جائیں۔ ورنہ رانیہ سے تو مجھے مایوسی سی مایوسی ہے، کیسے دبلی دبائی سی لگتی ہے جیسے کھاتے پیتے گھر سے نہ ہی ہو۔" آپا کے باز پرس کرنے پر ثریا کی اپنی ہی منطق تھی۔

"مگر بھابی ثریا، آپ آنکھیں کھول کر دیکھو تو نظر آئے گا کہ اس کی صرف رقص کرنے اور لڑکیوں والے لوازمات میں دلچسپی ہی نہیں ہے بلکہ اس کا لہجہ، انداز چلنے پھرنے اور بولنے کا انداز کس قدر زنانہ ہو گیا ہے اور رہی سہی کسر آپ کی دی گئی شہ پوری کر دیتی ہے، ابھی پرسوں مجھے کسی نے بتایا کہ اپنی سہیلی کے بیٹے کی سالگرہ آپ نے اسے ڈانس کرنے کے لیے اٹھا دیا۔ اب بھی وقت ہے اسے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اللہ نہ کرنے کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو سر پکڑ کر روئیں گی آپ۔" آپا نے جب اپنی بات ضائع ہوتے دیکھی تو نیل پالش سے اپنے ناخنوں کو رنگتی بھاوج کو دکھ سے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ فکر مت کریں آپا...... میری اولاد ہے، مجھے زیادہ پتا ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔" اس نے ناخنوں کو دیکھتے، دیکھتے ہی تنی سے کہا اور انداز ایسا تھا گویا اب تم دفع ہو جاؤ، ویسے بھی جمال کی آپا کی روک ٹوک کی وجہ سے ثریا کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ وہی تو وجہ تھیں کہ جمال بھی اب فون پر اس کے معمولات، بچوں کی سرگرمیوں اور تعلیمی حالت جاننے کی خواہش کرتا نظر آتا تھا اور بعض دفعہ اس کے منہ سے بھی نکل جاتا کہ "ثریا گھر اور بچوں پر دھیان دیا کرو، آپا بتا رہی تھیں کہ تمہیں تمہیں آنے جانے سے نہیں روکا لیکن بچوں اور گھر کو نوکرانی کے سہارے چھوڑ دینا ٹھیک نہیں ہے، تم بے شک اپنا آنا جانا میل ملاپ رکھو مگر بچوں کو آپا کے حوالے کر کے جایا کرو آپا کو ہی بلا لیا کرو۔"

کچھ سالوں سے یہ آپا نامہ سن، سن کر اسے آپا سے نفرت ہو گئی تھی جنہوں نے بلاوجہ اس کے جان چھڑکنے والے شوہر پر اس کے خلاف کر دیا تھا۔ لہٰذا جو تھوڑی بہت مروت وہ ان سے پہلے برت لیتی تھی اس سے بھی گئی تھی۔ اور آپا ایک بار پھر اس گھر کی دہلیز سے وقت آنے سے پہلے وہ منظر دیکھ کے گئی تھیں۔ جس نے ان کی راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ اس بار انہوں نے جمال کو جوں کا توں حال کہہ سنایا تھا اور جمال نے بھی ثریا نامہ شروع کرنے کے بجائے چپ ہو کر قدرے تشویش سے ان کی بات سنی تھی۔ گھر سے بچوں سے ثریا کی بے پروائی کے قصوں کو بھی وہ ثریا اور اپنی بہن کی مخصوص نند بھاوج والی روایتی چپقلش سمجھتا تھا اور ثریا سے بے حد محبت کے پیش نظر اسے بار جن دے جاتا تھا کہ ساری زندگی محرومیوں میں پلنے والی لڑکی اب اپنے شوق پورے کر رہی ہے تو آخر سدھر ہو ہی جائے گی۔ پھر آپا بتاتی تھیں کہ وہ رانیہ کو زیادہ تر اپنے پاس ہی رکھتی ہیں اب وہ مطمئن ہو جاتا کہ آپا ہیں ہر مسئلے کو حل کرنے کے لیے مگر اب جو بات کل کر آپا بتا رہی تھیں اس نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆☆☆

حدیبیہ اب ساکت بیٹھی ایزی کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے بتایا تھا کہ "ان کی طرف سے منگنی کی خواہش کو رد کر دینے کے بعد اس کی امی سخت غصے میں ہیں اور ماموں پر دباؤ ڈال رہی ہیں کہ ان کا بیٹا کوئی گرا پڑا نہیں ہے جس کے لیے وہ لوگ ان کو رشتہ دینے میں پس و پیش سے کام لے رہے ہیں۔ اب امی کی ضد ہے کہ وہ خالہ کی بیٹی کا رشتہ لے کر تمہاری بوا کو منہ توڑ جواب دیں جنہوں نے اس دن امی، ابو کو اتنی سنا دیں۔ ابو بھی بظاہر ساری صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی جو ان کے گھر میں تین دن سے درپیش تھی۔ حدیبیہ شروع سے بوا سے چڑتی تھی۔ خار کھائی تھی ان کے انداز، ان کی باتوں ان کے رویے سے پر اس وقت زندگی میں پہلی بار اس نے بوا سے شدید نفرت محسوس کی۔

"تم...... تم کچھ کرو حدیبیہ، پھپھو سے کہو ابو کو فون کر کے منگنی کے لیے ہاں کر دیں پھر شاید کچھ بات بن جائے، عفان بھائی بھی بہت پریشان ہیں، امی کی ضد پر امی رکی ہوئی ہیں۔ ورنہ اب تک خالہ سے بات بھی کر آتیں جو رشتہ دینے کو گویا تیار ہی بیٹھی ہیں اور باتوں، باتوں میں کئی بار امی کو سنا بھی چکی ہیں۔" وہ خاصے بگڑتے ہوئے موڈ اور سوجی آنکھوں سمیت کالج سے آئی تھی اور بوا کے دروازہ کھولنے پر ایک کھولتی نظر ان پر ڈال کر اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔ بوا حیرانی سے اس کا رویہ دیکھتی رہ گئیں جس نے ان کے سلام کے جواب میں فقط ایک گھوری سے انہیں نوازا تھا، وہ اس کے پیچھے ہی آ گئیں۔

"بتا دیں ان کو کہ خوش ہو جائیں اب...... مامی نے منگنی والی بات نہ ماننے کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے اور اب عفان کا رشتہ اپنی بہن کے گھر کر رہی ہیں، کیا تھا جو آپ ان کی بات مان لیتے...... مگر کہاں...... آپ کو کہاں اپنی اولاد کی خوشیاں نظر آتی ہیں، آپ اور ابو تو اس گھر میں رہنے والی اس عورت کے غلام ہیں ناں جو ہمیشہ سے میری خوشیوں کو ایسے ہی برباد کرتی آئی ہیں، پتا نہیں کس محرومی کا بدلہ لے رہی ہیں مجھ سے...... ہم سب سے......" وہ چیخ، چیخ کر رو رہی تھی۔

"کون سی ایسی انوکھی فرمائش کر دی تھی انہوں نے جو آپ لوگ اپنی ضد پر اڑ گئے اور اس عورت نے کتنی فضول باتیں سنائی ہیں مامی کو کیا، کیا زمانے کے بگڑنے کے قصے لے کر بیٹھ گئیں کہ مامی کہتی ہیں اب اس گھر میں قدم نہیں رکھنا۔ میں کہہ رہی ہوں امی...... امی کی بات آپ نے نہ مانی تو میں خودکشی

[illegible]
اس نے دروازے میں بت بنی کھڑی پھپھو کو دیکھ کر بھی چپ اختیار نہیں کی۔ امی کو زور دے کر کہا اور دھپ، دھپ کرتی بوا کے نزدیک سے ہو کر چلی گئی۔ امی نے آنسو بھری نظروں سے بوا کو دیکھا اور نظریں چرا کر بیٹی کے پیچھے چل دیں۔

☆☆☆

''یہ کیا، کیا تو نے بد بخت عورت، میری دی گئی آزادی، محبت اور اعتبار کا یہ صلہ دیا ہے مجھے کہ میری زندگی بھر کی پونجی کو برباد کر دیا۔'' جمال اپنے بال نوچ رہا تھا، غصے سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ ثریا خود صدمے سے بے حال تھی۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے، جھولتے خوشیاں وصولتے اس نے یہ کب سوچا تھا کہ ایک ایسا دن بھی اس کی زندگی میں بدبختی کی مہر لگانے آنے والا ہے۔

اپنی بہن کے اصل صورت حال کے آگاہ کرنے پر جمال کو جیسے ہی چھوٹ ملی تھی وہ پہلی فرصت میں پاکستان آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے آنے سے پہلے ثریا کو نہیں بتایا تھا۔ گھر آنے پر اسے واقعی گھر میں صرف ملازمہ ہی ٹی وی دیکھتی دکھائی دی تھی۔ جمال کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں موجود فروٹ باسکٹ نیچے گر پڑی تھی جس میں انگور کے دانے چن، چن کر کھاتی وہ فلم کے کسی سین میں مگن شاید خود کو فلم کی ہیروئن سمجھ رہی تھی۔

''بچے اسکول گئے ہیں صاحب اور بیگم صاحبہ اپنی دوست کے گھر گئی ہوئی ہیں۔'' اس نے گھبرا کر بتایا تھا جمال فوری طور پر بچوں کے اسکول گیا تھا۔ دونوں کے اسکول الگ، الگ تھے، دونوں کے ہی ٹیچرز اسی کے انتظار میں تھے شاید تبھی شکایات کا ایک ڈھیر تھا ان کے پاس، رانیہ کی رپورٹ سن کر اسے کافی تکلیف ہوئی کہ اس کی بچی کلاس کی سب سے زیادہ ڈل اور سہمی ہوئی بچی تھی اور پڑھائی میں بھی بہت پیچھے تھی مگر دانیال کے اسکول آ کر اس کی رپورٹ سن کر تو جمال کو لگا اس کی

[illegible]
میں بدلتی عادات اور خصلتوں کی بدولت اسے پورے اسکول میں بھن جی بلایا جاتا تھا اور گزشتہ تین ماہ سے وہ اسکول ہی نہیں آ رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں اس کا نام اسکول سے خارج کر دیا گیا تھا۔ وہ دل و دماغ میں غم و غصے کا طوفان لیے لوٹ رہا تھا جب محلے کے ایک پرانے ہمسائے احمد صاحب نے اسے پہچان کر روک لیا۔ ابتدائی سلام دعا کے بعد انہوں نے جو کچھ کہا تھا اسے سن کر جمال کو لگا کہ جیسے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جا رہا ہو۔

''جمال بھائی...... دولت اکٹھی کرنا اچھی بات ہے پر اس کی دھن ایسی بھی نہیں ہو کہ آپ کی اصل دولت یعنی اولاد آپ کے ہاتھ سے نکل جائے۔'' انہوں نے کہا تو جمال نے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس کیا اور استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا گویا آگے کی بات جاننا چاہ رہا ہو اس میں کچھ بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

''کوئی دو سال پہلے یہاں مجید کے ہوٹل کے اوپر والے چوبارے کے اوپر خواجہ سراؤں کا ایک گروہ آ کر ٹھہرا ہے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، ان کا پیشہ ہے شادیوں اور مختلف فنکشنز میں جا کر اپنا فن دکھا کر پیسے کمانا، تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ......'' انہوں نے رک کر جمال کا سفید پڑتا چہرہ دیکھا۔

''کہ آپ کے معصوم بچے کو میں نے اور بہت سے لوگوں نے ان کے پاس اٹھتے بیٹھتے اور......'' وہ رک گئے اور ان کی آواز جمال کے تاثرات دیکھ کر مزید آہستہ ہو گئی۔

''وہ...... وہ اب ان کے ساتھ جا کر، انہی جیسا بھیس بدل کر پرفارم بھی کرنے لگا ہے۔ میں نے ایک بار اپنی بیوی کو بھیجا تھا آپ کے گھر کہ جمال بھائی تو گھر پر ہیں نہیں ان کی بیگم کو اصل صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کر آئیں۔ مگر آپ کی بیگم تو الٹا غصہ ہو گئیں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، بچہ ہے تو ڈانس گانے کے شوق میں کبھی، کبھار وہاں جا کر ان کا رقص وغیرہ دیکھ آتا ہے،

بیگم تو بہت غصے میں واپس آئیں کہ جب ماں، باپ کو ہی اولاد کی پروا نہیں تو آپ کون ہوتے ہیں خدائی فوجدار بننے والے، میں بھی چپ ہو گیا اور جب، جب بچے کو وہاں جاتے دیکھتا خود کو اسے ٹوکنے سے باز نہ رکھ سکا۔ اور آج آپ کو دیکھ کر بھی پہلی فرصت میں بتا رہا ہو خدارا وہ کمسن ہے ابھی سے روک لیجیے اسے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا......'' اونچا، لمبا تنومند جمال لڑکھڑاتے ہوئے گھر آیا تھا۔ ثریا ہنوز غائب تھی، ہاں اس کی بہن کو اس کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ غمگسار بہن کو سامنے پا کر وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دیا۔ اور انہیں ساری بات کہہ سنائی وہ خود یہ بات سن کر حواس باختہ رہ گئیں۔ وہ آتے، آتے اس چوبارے پر بھی گیا تھا جسے ابھی تالا لگا ہوا تھا اور ثریا کی بدبختی کہ وہ اور دانیال آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ دانیال نے اسکول کا بستہ گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ پتا نہیں کب سے وہ یہ کھیل جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ بستہ پھینک کر باپ کی طرف لپکا تھا۔ اس کے انداز، اس کا رویہ، اس کے چلنے بولنے کے طریقے نے جمال کو بھونچکا کر دیا تھا۔ ابھی تو وہ پہلے تو اس نے پاکستان چکر لگایا تھا تب شاید بات ابتدائی مرحلے میں تھی مگر اب اسے لگا وہ خواجہ سراؤں کے کسی ایک رکن سے مل رہا ہے۔

''کہاں سے آ رہے ہو تم؟'' سپاٹ انداز میں اس نے دانیال کو خود سے الگ کر کے پوچھا۔ تھا تو بچہ ہی، باپ کے رویے پر سٹپٹا گیا۔

''جھوٹ مت بولو ابھی تمہارے اسکول سے آ رہا ہوں۔'' وہ زور سے چیخا تھا۔ دانیال نے خوفزدہ ہو کر سر اور آنکھیں جھکائی تھیں اور یہیں ثریا کی آمد ہوئی تھی۔ اس پل جمال کو نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ دانیال پر پل پڑا تھا اور اگر آپا اس دن بیچ میں نہ آتیں تو شاید وہ اسے جان سے ہی مار دیتا۔ رانیہ الگ ایک طرف کھڑی تھر، تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے اسے اتنا مارا تھا کہ جسم کے بعض حصوں سے خون رسنے لگا تھا یہی

کہ وہ غلطی پہلی تھی دوسری یا آخری اس نے ثریا کو بھی بے حد برا بھلا کہا تھا وہ اپنی محبوب بیوی کو تین بول بھی بول دیتا اگر جو آپا ایک بار پھر درمیان میں نہ آ جاتیں۔

وہ رات اگر ان پر بھاری تھی تو اس رات کی صبح ایک قیامت ہی لے کر آئی تھی ان سب کے لیے۔ دانیال کو مارتے ہوئے وہ بھول گیا تھا کہ بچے ہوں یا پھول ان کو نرمی سے برتا جاتا ہے ورنہ وہ ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، اگر وہ ہوش اور عقلمندی سے کام لیتا تو بچے کو محبت سے بھی سمجھا سکتا تھا اس کی ساری محرومیوں کو اپنی محبت میں سمو کر ہو سکتا تھا وہ اسے سدھار لیتا۔ اسے بے دردی سے مار کر اس نے بچے کی بغاوت کو ہوا دی تھی۔ اسے کہا تھا کہ وہ اگر ان خواجہ سراؤں سے ملا بھی تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔ یہی بات دانیال کی سانس روکنے کے لیے کافی تھی۔ میک اپ، زرق برق کپڑے، نت نئے پروگرام، مزہ پھر ان سے ملنے والے روپے، اگرچہ ثریا نے بچوں کو کبھی، روپے کی کمی نہیں ہونے دی تھی مگر اپنے فن کی داد وصول کرتے ہوئے روپے کمانا، ایک الگ ہی مزہ تھا۔ تھکن اور صدمے سے چور باپ کے خوف اور دہشت سے مزید سہمی ہوئی بہن اور ابھی تک صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہ کر سکنے والی ماں، وہ سب اس وقت نیند کے زیر اثر تھے۔ اس نیند کے جو ہر قسم کے حالات میں اپنے ہونے کا حق وصولنے آن موجود ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ سولی پر بھی بس وہ سب کو چھوڑتا چھوڑ کر رات کے پچھلے پہر بھاگ گیا تھا۔ صبح سب سے پہلے بیدار ہونے والا جمال ہی تھا جسے اس احساس زیاں نے سکون سے سونے نہیں دیا تھا کہ اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے پر ہاتھ اٹھایا اور کس بے دردی سے اٹھایا تھا۔ وہ ندامت سے چور ہوتے ہوئے اس کے کمرے تک آیا اور دھک سے رہ گیا۔

''ثریا...... ثریا...... دانیال کہاں ہے؟'' غافل پڑی ثریا کو جھنجوڑ کر اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا اور اس کا جواب جانے بغیر ہی سارے کمرے اور واش روم

دیکھے، گیلری میں سے ہوتا ہوا آپا کا درمیان والا ذیلی دروازہ کھولتا ہوا انہی کی طرف آ گیا۔ اتنی علی الصباح وہ کہاں جا سکتا تھا۔ یہ خیال ہی اس کا دل جیسے مٹھی میں لے کر بھینچے جا رہا تھا۔ پھر آپا کا پورا گھر چھان مارنے کے بعد اس کے قدم دوڑتے ہوئے اسی چوبارے کی طرف اٹھ گئے جہاں پر لگا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اور آج تین دن گزر جانے کے بعد بھی دانیال کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ پولیس، اخبار، ٹی وی ہر جگہ پر وہ مارا، مارا پھرا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے ہی بتایا تھا کہ اس نے بچے کو تو نہیں دیکھا مگر وہ لوگ جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح اچانک رات کے پچھلے پہر ہی اپنا حساب کتاب چکتا کر کے چلے گئے تھے۔ کہاں؟ وہ یہ نہیں بتا سکا تھا۔ ثریا اب صدمے سے غش پر غش کھا رہی تھی۔ جمال سارا دن پاگلوں کی طرح دانیال کو ڈھونڈتا رہتا۔ غصے میں آ کر ثریا کو دھنک کر رکھ دیتا جو خود صدمے سے نڈھال تھی۔ ایسے میں رانیہ مزید سہم گئی تھی۔ ایک دن جمال نے جب ملازمہ کو گھر کے کام نپٹاتے دیکھا تو اسے بھی برا بھلا کہہ کر گھر سے نکل جانے کو کہا۔

پرانی ملازمہ دو ماہ پہلے ہی چھوڑ کر جا چکی تھی یہ نئی ملازمہ تھی اور ٹھیک عورت نہ تھی۔ جمال کے اس انداز پر اسے سخت غصہ آیا اس کو ثریا سے بہت کچھ بٹورنے کا پروگرام بنائے ہوئے تھی اگرچہ ان دو ماہ میں بھی اچھا خاصا سمیٹ چکی تھی مگر اب صاحب نے آ کر اچانک کام خراب کر دیا تھا۔ اپنا بیگ اٹھا کر جس پل وہ باہر آئی رانیہ کو دیکھ کر ایک مکارانہ منصوبے نے اس کی آنکھوں میں چمک بھر دی تھی۔ صاحب کیا یاد کرو گے کسی کی بے عزتی کی تھی۔

"رانیہ بیٹا، یہاں آؤ، آپ کی امی کی طبیعت بگڑ گئی ہے ڈاکٹر کو لینے جانا ہے۔" وہ اسے لے کر چلتی بنی تھی اور شام کو کہیں آپا کو جا کر خیال آیا تھا کہ رانیہ کو انہوں نے دوپہر سے نہیں دیکھا ہے۔ دھیان دلانے پر ثریا چونکی تھی۔ جمال ایک بار پھر غائب تھا دانیال کے سلسلے میں ایک بار پھر ٹی وی اسٹیشن کا چکر لگانے گیا تھا۔ اور جب واپس آیا تو ڈھونڈ یا پٹ پڑی تھی کہ دوپہر کے بعد سے رانیہ غائب تھی۔ بعض لوگوں نے اسے نوکرانی کے ساتھ رکشے پر جاتے دیکھا تھا۔ جمال کی سمجھ میں پہلے تو بات نہیں آئی تھی کہ روتی ہوئی آپا اور بین کرتی ثریا کیا کہہ رہی تھیں لیکن جب سماعتوں نے ان روح فرسا الفاظ کو دل و دماغ کی زینت بنایا تو بیٹے کی جدائی سے نڈھال دل یہ صدمہ نہ سہار سکا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر وہ ایک جانب لڑھکا تو پھر اٹھ نہ سکا تھا۔ ثریا کا جمال، ثریا کی بے پروا اور انتہائی غافل طبیعت کے جان لیوا نتائج برداشت نہ کر سکا تھا۔ اور پھر جمال کے مرنے سے ثریا بھی مر گئی تھی۔ ہاں اس کا جسم ابھی زندہ تھا کہ اس میں سانسیں باقی تھیں اور یہ کہ ابھی روح پر مزید زخم لگنے باقی تھے کہ سکتے میں ڈھلا وجود تب حرکت میں آیا جب رانیہ کی گلی سڑی نعش ایک جگہ سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کی پہچان اس کے کانوں میں موجود ٹاپس سے ہوئی تھی۔ جو جمال نے اس کے لیے دبئی سے بھیجے تھے۔ نیم پاگل ثریا کو آپا کا خاوند بے سہاروں کے کسی ادارے میں چھوڑ آیا تھا جہاں دن بھر گدھوں کی طرح کام کرنے کے بعد رات کو جب بدن تھک کر چور ہو جاتا تب دماغ کی کھڑکیاں کھل جاتیں پھر ان کھڑکیوں سے ثریا کی زندگی کے تمام خوشگوار و ناخوشگوار جان لیوا مناظر پوری ترتیب سے چلتے چیخ، چیخ کر رونے پر مجبور کر دیتے۔

سکون پانے کو اس نے عبادت میں پناہ ڈھونڈی تھی اور معافی کا راستہ اپنایا تھا۔ پانچ سال سسک، سسک کر گزر گئے جب عبدالرحیم اپنے کسی جاننے والے کے ساتھ اس ادارے میں آیا اور کیاریوں میں گوڈی کرتی ثریا کو دیکھ کر گنگ رہ گیا۔ عبدالرحیم اس کا بھائی، اس کا ماں جایا اگرچہ (ساجدہ) اس کی سوتیلی ماں نے اس کے گھر سے بھاگ جانے کا قصہ نمک مرچ لگا کر سنایا تھا۔ ابا نے مرتے دم تک ثریا کا منہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی مگر عبدالرحیم نہ جانے کیوں دل میں بہن کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتا تھا۔ ابا، اماں مر کھپ گئے

[illegible]

کے بہت سال بعد تک ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی اور منی کی شادی کے بعد ہی حدیبیہ نے کئی سالوں کی منتوں مرادوں کے بعد ان کے ہاں جنم لیا تھا۔ منی اپنے میاں کے ساتھ سعودیہ عرب سدھار گئی تھی...... عبدالرحیم بہن ثریا کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ بہت پوچھنے پر بھی اس نے اپنے بارے میں کچھ بتا کر نہ دیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" چار سالہ حدیبیہ نے اپنے ابو سے پوچھا تھا۔

"یہ تمہاری بوا ہیں بیٹیا!" انہوں نے نرمی سے مسکرا کر کہا تھا اور ثریا تب سے حدیبیہ کی بوا تھی.... عبدالرحیم نے اسے خود بھی بہت عزت و تکریم دی تھی اور اپنی بیوی کو بھی تاکید کی تھی اس کی بہن کی طرف سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے۔

"پھر ایسا ہوا کہ جب، جب میں تمہیں دیکھتی مجھے ثریا یاد آتی، مجھے رانیہ نظر آتی، مجھے دانی رُلاتا میں سب کچھ کھو چکی تھی اب کچھ اور کھونے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ میں۔" مایوں کی دلہن بنی حدیبیہ کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ بوا کی درد بھری داستان سن کر اس دن حدیبیہ کے منہ سے نکلے بہت سے الفاظ ایسے تھے جو اُن کا دل چیر گئے تھے، انہوں نے خود حدیبیہ کی ممانی کو فون کر کے معافی مانگی تھی اور درخواست کی تھی کہ منگنی کے بجائے اگر وہ شادی کر لیں تو بھی وہ ان کی بات ماننے کو تیار ہیں، بے شک امتحان حدیبیہ اپنے گھر جا کر دے گی۔ وہ بھی تھوڑے سے پس و پیش کے بعد مان گئی تھیں۔ پھر چپ سادھے گم صم بوا کو دیکھ کر حدیبیہ کو اپنے کہے الفاظ پر شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مایوں والے دن آ کر ان سے معافی مانگی تھی۔

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی کے انتہائی رویے کے پیچھے کوئی وجہ نہ ہو۔ میں جانتی ہوں آپ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں مگر آپ کی سوچ اتنی انتہا کی کیوں ہے بوا؟ کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ ایسا...... آپ کے بارے میں جب بھی پوچھا وہ کچھ بتا ہی نہیں پائے۔

[illegible]

کر اس کا ماتھا چوما تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"آج میری رانیہ ہوتی تو بالکل تمہاری طرح ہی دکھتی۔" حدیبیہ تو یہ بات سن کر ان کے پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔ یوں اپنے کیے کا، اپنے دکھوں کا بوجھ اٹھاتے، اٹھاتے ثریا بوا تھک گئی تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ورق، ورق کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ حدیبیہ کی ہچکیاں اور بوا کی سسکیاں تھمیں تو اس نے ان کے ہاتھوں کو بے ساختہ محبت سے تھاما۔

"ایک بات کہوں آپ سے" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "آپ کی قسمت میں ایسا اور اس طرح ہونا ہی لکھا تھا بوا سب چاہے جو بھی بنتا، دانی کا پھر کچھ پتا چلا؟" اس نے جھجک کر پوچھا۔ بوا کی آہ نکل گئی۔

"نہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"ایک بات میری غور سے سن لو حدیبیہ! میری زندگی سے بہت سے سبق ملے ہوں گے تمہیں...... مگر اس عمر کے آخری حصے میں آ کر جو میں سمجھ پائی ہوں اگر اس کا ایک نکتہ بھی تب سمجھ جاتی تو آج میری زندگی بھی شاید مختلف ہوتی۔" حدیبیہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"وہ یہ کہ توازن سے ہی زندگی میں حسن ہوتا ہے۔ اس بات کو اپنے پلو سے باندھ لو اور اپنی بوا کی زندگی کے رازوں کی امین رہنا، عمر بھر...... تمہاری نظروں کی بدگمانی نے مجھے مجبور کر دیا کہ تمہیں وہ سب بتا دوں جو اب میرے اندر ناسور بن کر مجھے دھیرے، دھیرے ختم کر رہا ہے۔ میری محبت پر کبھی شک مت کرنا میری بچی۔" انہوں نے ایک بار پھر اسے گلے سے لگایا تھا اور آہستہ، آہستہ چلتی ہوئی اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"توازن ہی سے حسنِ زندگی ہے، کتنی دیر میں سمجھیں بوا یہ بات......" حدیبیہ نے سوچا اور اپنی آنے والی زندگی کو اس سنہری اصول کے تحت گزارنے کا تہیہ کر کے وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔

▲▲▲

منی ناول

صُفّہ

دُردانہ نوشین خان

پانچواں حصہ



مسجد صفہ میں قاری عبدالرحیم باسط، قاری غلام رسول اور اسلامک یونیورسٹی کے پرانے اساتذہ خصوصی دعا اور افتتاح کے لیے آرہے تھے۔ نمازِ جمعہ کے بعد دعا اور آخر میں خیرات اور لنگر تھا۔ عصر کے بعد اسلامی علمی کانفرنس تھی۔ یہ مسجد کی چھت پر بنے ہال میں ہو رہی تھی۔ عالمہ افشاں نصیر چند طالبات کے ہمراہ مدعو تھیں۔ صفہ بخاری کو تو حاضر ہونا ہی تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سفید کھلے عبایا میں صفہ بخاری، سیاہ عبایا میں عالمہ

"نوجوان نسل کو اخلاقی بے راہ روی سے دور کیسے رکھا جائے......" اس کے مشمولات میں تربیت، ماحول، حیا اور جدید ٹیکنالوجی زیر بحث آئے، خصوصاً جدید ٹیکنالوجی پر گرما گرم بحث چلی کچھ نے اسے موردِ الزام ٹھہرایا کچھ نے مبترا بھی کیا۔

مقررین کچھ یوں کہہ رہے تھے......

"زندگی کے مقاصد متعین کرنے میں ماحول کا اہم ترین ہاتھ ہے، یہ ماحول ہی ہوتا ہے جو کسی موقع کو جشن کسی کو غم کی تقریب بنا دیتا ہے۔ عید کے آنے سے پہلے عید کا انتظار عید کا ماحول بنا دیتا ہے، باجا، ڈھولک بج رہی ہو تو غیر متعلقہ بچے، بڑے بھی ناچنے لگتے ہیں...... آہ و بکا ہو رہی ہو تو سننے والے بھی غم زدہ ہو جاتے ہیں، انسان کی تربیت کا ماحول والدین بناتے ہیں، ماں، باپ کو بھی جو ماحول بچپن میں ملا ہوتا ہے اس کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اگر ماں، باپ میں باہم سمجھ داری نہیں تو ماحول غیر مؤثر اور ادھورا رہتا ہے۔"

اس سیمینار کا دوسرا موضوع صوفیانہ تھا......

"اعمال محض باطنی نیت میں ہیں۔"

قاری عبدالرحیم باسط نے نیت کی وضاحت ایک مثال سے کی۔ "الف مسجد کی طرف جا رہا ہے کہ صفِ اول میں جگہ لے، ب مسجد کی طرف جا رہا ہے کہ نماز ادا کر کے جلد کاروبار کی طرف لوٹے، ج مسجد کی طرف اس لیے جا رہا ہے کہ اس کا دوست جا رہا ہے اور د مسجد کی طرف جا رہا ہے کہ نماز کو خود پر لازم جانتا ہے۔ الف کی سبقت کی خواہش ب کا دنیا و آخرت ساتھ، ساتھ نبھانے کا خیال، ج کا ماحول سے متاثر ہونے کا عمل...... د کا اللہ کی حکم عدولی کا ڈر، یہ الگ، الگ نیتیں ہیں، عمل ایک ہے جب اللہ کے ہاں اس ایک عمل کی جانچ ہوگی تو عمل کے پس منظر میں کارفرما نیت سے تول ہوگا، نیت صداقت ہے...... صداقت، آزمائی جاتی ہے، حتیٰ کہ اس میں پوشیدہ نیت ریت میں سے سونے کے

اس کے بعد ایک آیت اور مشترکہ تفسیر و تشریح کا دور چلا۔ قاری غلام رسول نے اٹھارویں سپارے کی سورۃ مومنون کی طویل آیت کی تلاوت کی جس میں فلاح پانے والوں کی چھ قرآنی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے صاف، صاف بتا دیا کہ ایمان لانے والوں میں سے فلاح کون، کون پائے گا...... پہلی حقیقت تو یہ کھلتی ہے کہ صرف ایمان لانا فلاح پانے کے لیے کافی نہیں...... ایمان لانے والوں میں سے فلاح نہ پانے والے بھی ہوں گے۔" سب ہی وہاں قاری تھے، تفسیر و ترجمہ کے جاننے والے اور صاحب علم تھے...... مگر گفتگو میں توجہ کے انجذاب کا یہ عالم تھا کہ جیسے کوئی سربستہ راز تھا جس سے پردہ اٹھا ہے، ایک استاد نے کہا......

"ملاحظہ فرمائیں، فلاح پانے والوں کی نشانیاں بتاتے ہوئے اللہ نے نماز کا دو بار ذکر کیا...... نشانی نمبر ایک، وہ جو نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں اور پھر نشانی نمبر چھ میں کہ جو نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔"

"سبحان اللہ، برحق!"

"حفاظت کا مطلب ہے کہ نماز کو کھونے نہ دینا، دنیا کے کسی بھی امر کو اتنا حاوی نہ کرنا کہ نماز ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ اس کو بچا، بچا کر سنبھال کر اپنے ساتھ، ساتھ رکھنا حفاظت ہے۔" نماز کی بات چلی تو صفہ بخاری نے تشریح کے گلاب مہکا دیے، نمازیوں پُرلطف لگنے لگی گویا چمن کی سیر ہو۔

علامہ علی بیان بخاری نے کہا...... "جہاں اللہ نے نماز کو دو الگ مقام اہمیت عطا کیے وہاں حیا کو تین سطروں میں بیان کیا جبکہ دیگر شرائطِ فلاح یک سطری ہیں کہ مومنین لغویات پر توجہ نہیں دیتے...... زکوٰۃ دیتے ہیں، امانت اور وعدے کا خیال رکھتے ہیں۔ اہمیت ہرگز کسی کی بھی کم نہیں۔ حیا پر تفصیلی تاکید اس لیے ہے کہ عصمت کی حفاظت ذاتیات نہیں ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جو ذات سے نکل کر ماحول کو متاثر کرتا ہے جس طرح

مانس میں بلا اجازت شامل ہوتا ہے...... فیشن کس طرح پھیلتا ہے؟ صرف دیکھا دیکھی پھیلتا ہے، دیکھا دیکھی کو معمولی قرار دینا لاعلمی ہے، حیا مرد میں آ جائے تو معاشرے میں کیا مسئلہ رہے گا باقی......؟ حیا عورت میں آ جائے تو خرابی رہے گی باقی؟"

اس با مقصد، جامع، علم افزا مباحثے و مذاکرے نے روحانی ارتقا بخشا...... صفہ بخاری گھر واپس پہنچی تو شبانہ کا بھائی آ چکا تھا۔ سارا ٹبر اس کی آمد میں ایسا منہمک تھا کہ حویلی کی روش تک گاڑی کے چلنے کی آواز سے کوئی بھی باہر نہ نکلا...... موسم بھی سرما کا تھا۔ مغرب ہونے والی تھی۔ صفہ اندرونِ خانہ آئی تو گول کمرے سے آتی آوازوں پر ٹھٹکی، سندری اور مردانہ آوازیں مگر یہاں گول کمرے میں کیوں؟ مردانہ آواز کان پڑی۔

"یہ اتنی بڑی حویلی میں عورت ذات اکیلی رہتی ہے، سارے کمرے خالی پڑے ہیں...... اس کو تو ایک کمرا ہی کافی ہے۔"

"وہ مالکن ہیں جی، ہمیں سر چھپانے کو جتنا دے رکھا ہے عنایت ہے ان کی......" یہ شبانہ کی آواز تھی۔

"عنایت......" مرد ہنسا۔

"ہاں اور کیا لالا...... ہمیں آسرا ملا ہوا ہے۔"

"آسرا اس نے دے رکھا ہے تو ہم نے بھی تو دے رکھا ہے۔"

"اچھا چلو اٹھو یہاں سے، ماما بلا رہا ہے۔" سندری کی آواز تھی۔

"چلتے ہیں...... خیر ہے...... شبانہ...... تم بات کرنا بی بی سے...... ہمیں یہ اگلے تین کمرے دے دے۔"

ان لوگوں کے اٹھنے کی کھٹ پٹ سن کر صفہ نے قدم بڑھا دیے، اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ تا دیر یونہی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جن پر اعتماد تھا ان کا یہ رخ تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت تھا۔ دنیا کے دوہرے پن پر اچنبھا کم نہ ہو پا رہا تھا۔ وہ تو ان کے لیے سراپا اخلاص تھی اور ایسا ہی انہیں خیال کرتی تھی۔ ان میں سے کسی کی نظر اس کے

آج ماں، باپ کے بعد دوسری بار خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ان دیواروں کے اندر اس نے خود کو کبھی اکیلا اور غیر محفوظ خیال نہیں کیا تھا۔ کیا ان دیواروں کے اندر بھی خوف کا عفریت حملہ آور ہو سکتا ہے؟ اکتالیس سال کی عمر اس کی محافظ بننے میں ناکام رہی ہے...... پھر اس نے سب کچھ ذہن سے صاف کر کے درود شریف سے زبان کو معطر کیا۔ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر کے درود پاک کے حصار میں اتارا تو اعتماد لوٹ آیا۔ عبایا اتار کر شال اوڑھی وضو کیا، نماز مغرب، اوابین میں بہت سا وقت گزر گیا۔ شبانہ دو بار آ کر جھانک گئی۔ تیسری بار آئی تو وہ فارغ ہو کر پلنگ پر بیٹھی تھی۔

"السلام علیکم بخاری باجی...... میں تو دو چکر لگا گئی...... آپ کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔"

"ہوں......"

"آپ نے کہا تھا، حالات آئیں گی تو آپ فون کر دیں گی، میں فون کا انتظار کرتی رہی۔"

"آئی تھیں، سب کو اندھیرے سے پہلے لوٹ جانے کی فکر تھی کھانا تو خیرات والا کھلا دیا تھا۔"

"آپ کے لیے کھانا لاؤں؟ لالا خیر سے آ گیا ہے، پائے پکائے تھے، آپ کے لیے کدو کا سالن ہے۔"

"نہیں شبانہ، جزاک اللہ...... میں نے دو چار چمچ چاول کھا لیے تھے...... بس ایک کپ چائے لا دو......"

"ابھی لائی......" شبانہ چلی گئی...... ظاہری وسوسوں سے نکل کر صفہ اب مسجد میں ہونے والی مختصر بات چیت یاد کر کے مطمئن ہو گئی تھی۔ شبانہ چائے لائی، چائے رکھ کر صفہ کی پلنگ کے پائنتی بیٹھ کر لحاف کے اوپر سے ہی اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔

"لالا میرے لیے سونے کے جھمکے لایا ہے۔ بہت سوہنے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"پہنے کیوں نہیں......؟"

"وہ سندری نے مانگ لیے...... اسے بہت پسند آ رہے تھے۔ پسند تو مجھے بھی تھے مگر...... میں نے کیا کرنا

’’شبانہ...... تمہارا اثاثہ کل کو تمہارے کام آئے گا۔ مستقبل کا کچھ بھی اندازہ نہیں ہوتا...... تمہیں اپنی چیزیں اپنے پاس رکھنی چاہئیں۔‘‘

’’ہاں جی...... یہ تو ٹھیک ہے۔‘‘

’’اچھا...... اور کوئی بات......؟ حویلی کے بارے میں لالا کیا کہتا ہے؟‘‘ اس سوال پر شبانہ کا رنگ متغیر ہوا۔ حیران ہو کر صفہ کو تکنے لگی۔ یہی سوچا کہ اتنی خدا ترس بی بی کے ساتھ میرے بھائی کا یہ رویہ ہم پر اللہ کا غضب نہ لائے۔ پھر اپنے آپ کو قابو کر کے بتانے لگی۔

’’بس جی...... بڑی بی بی جی اور شاہ صاحب کو یاد کر رہا تھا۔‘‘

’’ہوں......‘‘ پر اور اک خاموشی......

’’شبانہ...... تم جاؤ بھائی کو وقت دو، میں چائے ختم کر کے عشا پڑھتی ہوں۔‘‘

’’بھائی بھائی کہیں ملنے گئے ہیں...... میں برتن دھولوں گی۔‘‘ شبانہ نے صفہ بخاری کا موبائل چارجنگ پر لگا دیا۔ کھڑکیاں دروازے چیک کیے، سلام کر کے کہا۔ ’’دروازہ بند کر لیتا باجی اندر سے۔‘‘ آج اس کی توجہ غیر معمولی تھی۔ صفہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔ پھر اس کی رات کی تسبیحات شروع ہو گئیں۔ آج کچھ علمی کتب بھی لائی تھی۔ رات جتنی بھی لمبی ہو اس کے لیے کبھی لمبی نہ رہی تھی۔

سرما کی صبح کے دس بجے تھے، سرونٹ کوارٹر میں زندگی جاگ رہی تھی۔ لالا صحن کی دھوپ میں بیٹھا امرود کاٹ، کاٹ کر کھا رہا تھا۔ ناشتا، چائے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اذان اور موذن اسکول جا چکے تھے، سندری کمروں کی صفائی میں مصروف تھی۔ شبانہ صحن میں چھاج میں سوجی لیے صاف کر رہی تھی۔ سندری نے اندر سے میلے کپڑے لا کر چارپائی پر رکھے تو لالہ نے کہا۔

’’اب تم ہماری ذرا سی دھوپ گیلے کپڑے پھیلا کر روک دو گی......‘‘ پھر خود ہی رائے دی۔ ’’آج میں یہ کپڑوں والی تار اُدھر کے صحن میں باندھ دیتا ہوں۔ ایسی بی بی کہاں باہر نکلی ہوئی...... جو پیچھے بھی تو اتنا صحن پڑا ہے۔‘‘

’’نہیں لالا نہیں...... بی بی بخاری کی اجازت کے بغیر اچھا نہیں لگتا......‘‘

’’تو لے لینا اجازت...... میں تار دیکھتا ہوں......‘‘ وہ پاؤں چپل میں ڈالنے لگا۔

’’پہلے میں اجازت لے لوں پھر......‘‘

’’خیر ہے شبانہ...... خیر ہے، ایک تار ہی تو لگا رہا ہوں...... میں تو کہتا ہوں یہ دیوار گرا کر ہم اپنا صحن وہاں آم کے درخت تک کر لیں......‘‘

’’لالا...... تو رد و بدل تو ایسے بتا رہا ہے جیسے یہ تو تیرا گھر ہو...... بخاری باجی کی مرضی کے بغیر ہم کچھ کیوں کریں...... اتنے نمک حرام نہیں ہیں۔‘‘

’’لے سندری...... یہ تو درویشی کے ساتھ رہ کر فقیر ہو گئی ہے...... اس کا تو بال نہ بچہ...... اکیلی جان کو ایک کمرا بہت......‘‘ شبانہ کے دل پر آری سی چلی، یہ اس کی زندگی کا حساس موضوع تھا۔

’’میں اپنا کمرا تم لوگوں کے لیے خالی کر دیتی ہوں۔‘‘ چھاج رکھ کر وہ اٹھ گئی اور بولی۔ ’’یہ بچوں کا کمرا سیٹ کر لو میں اپنا بکسا کھٹولا (چارپائی) لے جاتی ہوں، مجھے بخاری باجی اپنے پیروں میں جگہ دے دے گی۔‘‘

’’کیا ہو گیا ہے بی شبانہ...... ترا بھائی مذاق کر رہا ہے۔‘‘ سندری بولی۔

’’میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا...... تیری بخاری باجی اگر آگے والے تین کمرے دے دے تو بھی اس کے پاس چار کمرے ہیں۔ اصل میں گھر کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں کچھ پیسے جوڑ کے لایا ہوں، گھر کا کچھ اچھا سامان بنانا چاہتا ہوں، صوفے، کرسیاں، بڑا فریج...... یہ چیزیں کہاں رکھیں گے...... ہمارے بچوں کو بھی کچھ اچھی زندگی جینے کا حق ہے...... شبانہ......! تو ضد نہ کر، بی بی سے جا کر بات کر، وہ بڑے دل والی عورت ہے...... دنیا داری والی نہیں ہے۔ وہ نہیں روکے گی۔‘‘

شبانہ رک کر لالا اور سندری کو دیکھتے ہوئے بولی۔

’’بخاری باجی نے اماں، ابا کے کمرے ان کی یاد میں بند رکھے ہیں...... وہاں کا سامان اٹھا کر وہ کہاں کریں گی؟ میں ایسی نامناسب بات نہیں کر سکتی...... البتہ اتنا کہہ دوں گی کہ وہ ریڑا ایزا کرنے دیں...... دیواری آم تک بڑھانے سے ہمارے پاس آٹھ، سات مرلے زمین آجائے گی...... اس میں جتنے چاہو کمرے ڈلواؤ...... یہ بھی احسان کم نہ ہو گا باجی کا......‘‘

’’کمرے بنواؤ...... کمرے بنائے تو سارے پیسے تو کمروں میں لگ جائیں گے...... ان کے کمروں میں اے سی ہیں، آتش دان ہیں، ہم انسان نہیں ہیں کہ سردی، گرمی سے بچیں......‘‘ سندری دھلے ہوئے کپڑے نچوڑتی وہیں آ گئی۔

’’بات سن شبانہ...... ترا لالا ٹھیک کہہ رہا ہے، تجھے بخاری باجی پیار کرتی ہے تو اچھے طریقے سے بات کرے گی وہ برا نہیں مانے گی۔‘‘

’’یہ بات تو خود کیوں نہیں کر لیتی...... تیرا بھی تو وہ بہت خیال رکھتی ہیں۔‘‘ غصے میں جاتی شبانہ واپس پلٹی...... ’’لالا...... میں کوئی جھگڑا نہیں کر رہی...... میرا دنیا میں تیرے سوا کوئی نہیں ہے، میں یہ کمرا ابھی آج خالی کر دیتی ہوں، اس کا پکا فرش ہے، پکا کمرا ہے، ادھر صوفے کرسیاں رکھ دینا۔‘‘

لالا نے ناراضی و بیزاری سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ سندری بھی منہ پھلا کر کام کرنے لگی۔

☆☆☆

صفہ بخاری کی گود میں کتاب تھی اور وہ کسی دوسرے جہان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ توکل کی عالیشان مثال، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی جماعت کے ساتھ دریا کے سامنے پہنچ گئے اور پیچھے سے فرعونی لشکر آ لگا تھا قوم بے تاب ہو کر پکاری۔

’’موسیٰ، انہوں نے ہمیں آ لیا۔‘‘ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔ ’’ہرگز نہیں......‘‘ وہ کیسے کہہ سکتے تھے ہرگز نہیں، میں پہنچنے لگی تھی۔ نعروں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور کانوں میں پہنچ رہا تھا۔ خوف مڑ کر دیکھنے نہ دیتا تھا مگر کیسے کہہ دیا حضرت موسیٰ نے بالکل نہیں، میرے ساتھ اللہ ہے جو راہ دکھاتا ہے۔‘‘ اس ازحد یقین کا اندازہ لگائیے جب موسیٰ نے کہا بالکل نہیں...... ٹھاٹھیں مارتا پانی پاؤں چھو رہا تھا۔ ایسے میں ہر دل ہول کر سوچے گا...... یہ کیا ہوا اب نہیں بچتے...... مگر موسیٰؑ کے دل میں یہ سوال ایک پل کو نہ اٹھا۔ کیونکہ عین الیقین میں یہ سوال اٹھنا خارج از سوال تھا...... دوسری طرف اللہ کہتا ہے موسیٰ پانی میں عصا مار...... یعنی ایک ظاہری نظر آنے والی وجہ بنا دی...... جیسے موت کی نہ کسی ظاہری نظر آنے والی وجہ میں چھپا رکھی ہے۔ کسی عصا میں یہ طاقت کہاں سے آئی کہ دریا دو شق کر دے...... مگر اللہ نے سمجھایا ایک ظاہری کوشش، مکمل ترین ایمان کے ساتھ...... ایک ظاہری آنکھ کے لیے سبب مگر اصل مسبب الاسباب غیب میں ہے......‘‘ پھر صفہ کا موبائل بجنے لگا جو کہ بہت کم بجا کرتا تھا۔

شبانہ اندر آئی تو دُہری حیرت ہوئی، بخاری باجی اپنے کمرے سے باہر لاؤنج میں بیٹھی ہے اور فون سن رہی ہے۔ وہ صفائی کرنے لگی مگر دل میں ایک گونہ مسرت رہی، صفہ نے فون رکھ کر شبانہ کو آواز دی۔

’’دیکھو...... کل تم اسے چارجنگ پر لگا رہی تھی تو میں نے خیال کیا کہ اس کی ضرورت کب ہے...... اب نخبہ کا فون آ گیا...... بے شک ہر فعل جو ہم سے سرزد ہوتا ہے امرِ الٰہی ہوتا ہے۔‘‘

’’آپ نے کتنی اچھی بات کی۔ آپ تو ہمیشہ ہی اچھی بات کرتی ہیں، کب آ رہی ہیں نخبہ باجی......؟‘‘

’’اس کا تو نہیں بتایا۔‘‘

’’اچھا میں چائے بنا کر لاتی ہوں آپ کے لیے......‘‘

’’نہیں شبانہ...... روزہ ہے میرا......‘‘

’’اچھا......؟ سحری میں کیا کھایا؟ مجھے بتا دیتیں، میں سحری بنا دیتی۔‘‘

"چھوٹے دن ہیں...... ایسی کوئی فکر والی بات نہیں۔"

"سحری نہیں کی آپ نے؟" شبانہ پریشان ہوگئی۔

"ایک سیب لے لیا تھا...... فکر نہ کرو پگلی۔"

"وہ جو سائڈ ٹیبل پر کٹا ہوا رکھا ہے...... اس کی دو قاشیں کھائی ہیں آپ نے...... چائے کی عادت ہے آپ کو، میں چائے بنا دیتی...... صفہ بی بی! مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوتی ہے، تھکن نہیں ہوتی۔ آپ یقین کریں۔"

"میں یقین کرتی ہوں شبانہ، تم بہت اچھی ہو، میں نے اوون میں ٹی بیگ والی چائے بنائی تھی...... تم نے بچا ہوا سیب دیکھا...... چائے کا کپ نہیں دیکھا......" صفہ مسکرائی۔

شبانہ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگئی۔

"اچھا میری پیاری باجی...... میں آپ کی افطاری بناؤں گی۔"

شبانہ کے دل میں بارہا خیال آیا کہ دیوار بڑھانے والی بات کرے مگر ہر بار جھجک مانع رہی۔

سندری اور لالا رشتے داروں کو ملنے چلے گئے۔ سندری نے شبانہ کو بھی چلنے کو کہا مگر وہ بخاری باجی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی اسے افطاری بھی بنانا تھی۔ اس نے سنا لالا جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "یہ گھر کی بھیدی ہے۔" شبانہ افسوس کے ساتھ سوچتی رہی ملک سے باہر جا کر بھائی نے پیسے کو ہی عزت اور راحت کا پیمانہ بنا لیا ہے۔ اور اس نے تہیہ کیا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ صفہ بخاری کو تنہا نہیں چھوڑے گی۔

عصر کی نماز سے فارغ ہو کر شبانہ افطاری کی ہدایات لینے صفہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اندر سے آنے والی دھیمی پُرسوز آواز نے قدم روک لیے۔

"رب کونین میرے دل کی دعائیں سن لے
میں پریشان ہوں سرمایۂ راحت دے، دے
اپنے محبوب کی سچی محبت دے دے
رب کونین میرے دل کی دعائیں سن لے"

شبانہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "بخاری باجی کی کتنی اچھی آواز ہے۔ آواز میں اتنا درد تب آتا ہے جب اندر سے پکار آتی ہو۔ اللہ پاک میری صفہ بخاری باجی کو کبھی دکھ، پریشانی نہ دیکھیو، اس کا تیرے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے پیاروں کی جدائی پر تری رضا پر راضی و صابر ہوگئی ہے......" آواز بند ہوئی تو وہ کھنکھار کے اندر داخل ہوئی۔ صفہ بخاری مصلے پر دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔

"شبانہ آئی ہو؟" آہستہ سے پوچھا۔

"جی میں پوچھنے آئی ہوں، پھل تو رکھے ہیں افطاری کے لیے فروٹ چاٹ بنا لوں؟ کھانے میں گوشت کا سالن ہے...... تازہ دہی بھی ہے۔"

"بہت سامان گن گئی ہو...... آدھی پلیٹ فروٹ...... پانی کی بوتل...... کھجور میری دراز میں رکھی ہے۔"

"جی اچھا...... چائے تو پئیں گی ناں آپ؟"

"اوابین کے بعد......"

شبانہ جانتی تھی مغرب کے ساتھ ایک گھنٹا تو وہ لگا ہی دیتی تھیں۔ "پتا نہیں ایمان والوں کی بھوک کہاں چلی جاتی ہے، ہم جیسے تو روزہ کھول کر دیر تک کھانا تا پینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بخاری باجی ایک وجیسے، وجیسے غم میں رہتی ہیں، کیا سب خدا رسیدہ ویسے ہی رہتے ہوں گے۔ اگر یہ کالج کے بعد آگے بڑے کالج پڑھنے چلی جاتی تو پھر کسی امیر کبیر سے شان و شوکت سے شادی کر لیتیں تو ایسی والی صفہ بخاری کبھی نہ بنتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس منزل پر انسان پہنچنا چاہتا ہے اس کو ویسی ہی تربیت گاہ پکڑنا ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مال و متاع، شان و شوکت بھر بھر کر کھانا اور پھر اللہ سے لو لگانے کی امید......" شبانہ پھل کاٹتے ہوئے سوچے جا رہی تھی بلکہ پھر اس کی خود کلامی شروع ہوگئی۔

"ہاں اور نہیں تو کیا...... ڈاکٹر بننے سے پہلے ڈاکٹری پڑھی جاتی ہے، سلائی کڑھائی پہلے سیکھی جاتی ہے...... یہ جو فلموں والیاں ہوتی ہیں، ماحول کے مطابق خود کو چمکدار رکھنے، خوب صورت رکھنے کے لیے کیا، کیا جتن

کرتی ہیں...... اس کا مطلب، بندہ اپنی تقدیر آپ بناتا جوڑتا رہتا ہے......" پھر خود سے سوال کیا۔

"اری شبانہ...... تیری تقدیر کیا ہے؟ تو، تو کچھ نیا جوڑ نہ سکی...... اور لیس کو تو تجھ سے کوئی ذرا سا بھی اصلی پیار نہ تھا پر تجھے...... اس سے آج تک پیار کیوں ہے؟ اچھا جی چاٹ تو ہوگئی تیار...... توبہ ہے بخاری باجی...... آدھی پلیٹ...... بھلا پھل فروٹ سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ میں تو پوری پلیٹ بھروں گی۔"

پلیٹ فریج میں رکھی، دل تو بہت کر رہا تھا کہ دوسری پلیٹ دہی بھلے بنا لے مگر جانتی تھی بخاری باجی نے ایک ہی چیز کھانی ہے، افطاری کا اتنا سا تو کام تھا...... ابھی پون گھنٹا پڑا تھا...... شبانہ اپنے کوارٹر میں چلی گئی...... سوچا جب لالا اور بچے لوٹیں گے تو تھکے ہوئے ہوں گے سب کے بستر بچھائے، کمبل لحاف رکھے بکلی لائٹ جلا کر کے باقی بتیاں بند کر دیں۔ کمرے باہر سے بند کر کے پھر حویلی میں آگئی۔

افطاری، مغرب، رات کا کھانا، عشا کی نماز ہو چکی...... لالا اور سندری ابھی تک نہیں لوٹے تھے، شبانہ، صفہ بخاری کے پاس بیٹھنا اور باتیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں موٹی سی اسلامی کتاب دیکھ کر ہچکچا رہی تھی۔

"سندری ابھی نہیں آئی؟" صفہ نے پوچھا۔

"نہیں جی......"

"تم چاہو تو یہیں لیٹ رہو...... دوسرے کمرے سے جا کر کمبل لے لو۔"

"میں بس یونہی بیٹھی رہتی ہوں، آتش دان کے پاس۔" وہ اجازت ملتے ہی آتش دان کے سامنے بچھے جازم پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"نخبہ باجی کیسی ہیں؟" اسے نخبہ اچھی لگتی تھی۔

"ویسے تو ٹھیک ہے...... مگر جیسے خوش نہیں ہے۔"

"ہائے اللہ...... اتنی امیر، روپے پیسے والی، حسین پری جیسی...... ان کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟"

"ہم اکثر نہیں جانتے کہ کس کے پاس کیا کمی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہو...... کسی کا اندر تو نظر نہیں آتا ناں۔"

"ہوں......"

"بخاری باجی...... جوں، جوں زمانے میں مارکیٹیں، پلازے، کاروبار پھیل رہا ہے تو مجھے لگتا ہے ہماری دماغ کاروباری ہوتے جا رہے ہیں۔ لالا ہمیں تصویریں دکھا رہا تھا۔ اتنی بڑی، بڑی دکانیں جیسے آپ کی آدھی حویلی اور سونے سے بھری ہوئی دکانیں اتنے موٹے، موٹے زیورات، عمارت پر عمارت آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں ساری روشنی سے بھری ہوئی، مجھے تو لگتا ہے بھاری چمک میں رہ، رہ کر بندے کا اندر بھاری ہو جاتا ہے، باجی جی میں ہوں تو ان پڑھ...... بات کرنا مجھے نہیں آتی...... میری بات عجیب سی ہے مگر مجھے ایسے لگتا ہے۔"

"تمہاری بات عجیب نہیں ہے...... یہ وہ نکتہ ہے جس پر غور کرنے والوں نے غور کیا...... متاع کی کثرت اور کثرت کی حسرت نفس مطمئنہ پر بوجھ ہے۔"

"انسان کی ضرورت کیا ہے باجی؟"

"انسان کو اتنا ہی چاہیے جس سے سلامت رہے، خوراک ہو یا لباس......"

"بال بچوں والوں کی خواہش ہوتی ہے اولاد اچھے گھر میں پلے، اچھا پہنے، اچھا کھائے، اسکول، کھلونے سب اچھے ہوں۔"

"اولاد والوں کے لیے اسلام نے الگ احکام نہیں رکھے۔"

"جب سے لالا آیا ہے یہی کہتا ہے کہ گھر چھوٹا ہے، اسے ایک دم گھر چھوٹا سا کیوں لگنے لگا ہے؟"

"اگر وہ اپنے بیوی بچے کہیں الگ رکھنا چاہتا ہے تو میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے، زندگی اپنی راہیں نکال لیتی ہے...... تمہیں بھی کل کلاں میاں بلا لے، چلی جانا، میری خاطر مت سوچنا یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" صفہ نے کافی تفصیلی جواب دیا۔

"میرا میاں مجھے کیا بلائے گا، وہ تو مہینوں فون نہیں کرتا...... لالا کہتا ہے کہ چھوٹی دیوار گرا کر آم کے

یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے اور کمرے دیے جائیں۔" شبانہ نے رک رک کر لالا کی ساری بات بتادی۔

"کیا اس نے یہ بات کی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا تمہیں مجھ سے بات کرنے کو کہا ہے؟"

"لگتا ہے آپ کو سب کچھ پہلے سے پتا ہوتا ہے۔"

"شبانہ جہاں تک دیوار کا تعلق ہے میں اس کی اجازت دیتی ہوں...... لیکن حویلی کے کمروں میں کوئی کمرا نہیں دے سکتی...... مجھے اس حویلی کا چالیس، پچاس ہزار کرایہ مل سکتا ہے اگر میں ایک کمرا رکھ کر باقی کرایے پر چڑھا دوں...... پر مجھے لالچ نہیں ہے، مجھے دخل اندازی پسند نہیں...... لالا کو میرا جواب بتا دینا۔"

"آپ سولہ آنے سچ کہہ رہی ہیں، میں نے بھی یہی کہا تھا، آپ کا حکم اسے پہنچا دوں گی...... مرضی آئے نہ آئے۔"

صفہ بخاری نے مڑ کر شبانہ کو لحہ بھر غور سے دیکھا۔ آتش دان کی تمازت سے سرخ ہوتے رخسار، ہلکا سا سانولا رنگ، کڑھائی والی شال لپیٹے ہاتھ تاپ رہی تھی...... پھر پھاٹک کھلنے اور بچوں کی آوازیں آنے لگیں اور وہ شب بخیر کہہ کر چلی گئی۔

☆☆☆

آنے والے دن کا آغاز ہی بجھا بجھا سا تھا، ایک تو سرما کی بارش اور جھکے، جھکے بادلوں کے سبب دوپہر ایک بجے تک بھی دن نکلا ہوا نہیں لگتا تھا، حویلی میں سناٹا تھا سب ہی لحافوں میں وقت گزار رہے تھے...... اس سناٹے کو صفہ کے فون کی گھنٹی نے توڑا...... فون غم کی خبر لیے آیا...... مہرو خالہ گزر گئیں۔ کتنی دور ہی سہی، کبھی، کبھی کا رابطہ ہی سہی مگر خالہ حیات تھیں تو لگتا تھا کسی بزرگ کا سایہ موجود ہے۔ صفہ فون ہاتھ میں لیے سن ہو گئی۔

یادوں کے قافلے چلنے لگے، ہنستا بستا ماضی جی اٹھا...... اور خالہ بھی مر گئیں...... شبانہ کے سوا اس کا غم بانٹنے والا کون تھا بھلا۔ شبانہ نے سنا تو وہیں نیچے بیٹھ

رانی۔ بڑی بخاری بی بی، بخاری صاحب جی، اماں جولاں، اماں خیراں، مہرو خالہ سب کو یاد کیا گیا۔

"بخاری باجی، اب تو لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی گھر ہے...... کیسی چہل پہل ہوتی تھی، وہ علیشا باجی، اروا باجی محلے کی آپ کی سنگی سہیلیاں، میں بڑے شوق سے انہیں تکا کرتی تھی، آپ کی چاچی زبیدہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی بیٹی وردہ بی بی، اتنی پیاری صورت تھی۔ میں اپنی اماں سے کہتی اماں دیکھ، کتنی چٹی گوری ہے، اماں کہتی شبانہ تو جھلی ہے اس طرح نہیں کہتے، آپ بھی مجھے بہت اچھی لگتی تھیں، بخاری باجی...... کیسے وہی کی وہی جگہ ہوتی ہے اینٹوں، دیواروں، دروازوں کھڑکیوں کی وہی ترتیب ہوتی ہے اور اس میں سے روح نکال لی جاتی ہے۔ ان چیزوں کی بھی روح ہوتی ہے کیا؟" صفہ کے جوابات قلب میں چل رہے تھے۔

"کیوں دل لگاتے ہیں ہم؟ دنیا ہر بار ہی ہمیں کیوں الجھا لیتی ہے۔ ایسا سونا کس کام کا جو پگھل رہا ہے، کم ہو رہا ہے، ختم ہو رہا ہے ایسے، "سونے" پر کتنا رکھے ہوئے ہیں، ہر موت ایک نیا درس ہے، ہر موت ایک نیا کرب ہے، غم ازلی ہے، غم ثبات ہے۔"

صفہ خاموشی سے اٹھ کر وضو کرنے چلی گئی۔

شبانہ، سندری کو خبر کرنے گئی تو وہاں رقیوں سے کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں۔ وہ سب افسوس کے لیے حویلی میں آئیں تو صفہ سجدے میں پڑی تھی۔ شبانہ انہیں لاؤنج میں بٹھا کر خاموشی سے پیچھے کھڑی رہی۔ کہیں جا کر اس نے سر اٹھایا تو شبانہ نے تعزیت کے لیے آنے والیوں کا بتایا۔

تعزیت اور فاتحہ خوانی کے بعد صفہ نے سندری سے کہا۔

"اذان بیٹا کو کہہ دو مسجد صفہ کے امام صاحب کو اطلاع کر دیں اور وہ بعد نمازِ جمعہ دعا کروائیں۔ ویسے تو صفہ کے پاس امام، قاری صاحبان کے نمبر تھے مگر وہ بہت کم فون کرتی۔ اذان مسجد میں قرآن پاک پڑھنے روزانہ جاتا تھا اور اب کافی سمجھدار بھی ہو چکا تھا۔

جمعہ کے دن خالہ مہرو کے لیے ختم قرآن پاک، دعائے مغفرت اور خیرات کے بعد صفہ بخاری مسجد سے لوٹی تو جیسے ہی گاڑی حویلی کے پھاٹک پر رکی...... عجب منظر نظر آیا...... پھاٹک پر سوزوکی وین رکی ہوئی تھی۔ موذن اور لالا اس میں اپنا سامان لوڈ کر رہے تھے، اذان جو صفہ بی بی کے ساتھ گیا تھا گاڑی سے اتر کر پوچھنے لگا۔

"ابو یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

صفہ نے سنا کہ اس کا باپ شبانہ کا لالا کہہ رہا تھا۔

"ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"ہمارے ماموں نے ہمیں بڑا گھر دے دیا ہے۔ وہ ہمارے اسکول کے بھی ساتھ ہے۔" موذن خوش ہو کے بولا۔

صفہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

ابھی اندر جا کے عبایا اتارا ہی تھا کہ سندری آ گئی۔ چادر اوڑھے سر جھکائے آ کر رک گئی۔

"السلام علیکم باجی......"

"وعلیکم السلام...... اذان کے پاس آپ لوگوں کا خیرات کا حصہ ہے۔"

"مہربانی باجی...... آپ کی ہم پر بہت مہربانیاں ہیں...... آپ ناراض نہ ہوں، آپ سادات پاک ہیں، آپ کی خدمت میں سعادت ہے...... مگر گھر والے کی بات ماننا پڑتی ہے...... اذان کے ابو اپنی موجودگی میں ہمیں نئے گھر شفٹ کرانا چاہتے ہیں...... باجی، اجازت دو، اب ہم جا رہے ہیں...... کوئی کام ہو، کوئی حکم ہو، جب بلائیں گی، میں حاضر ہو جاؤں گی۔"

"اللہ تمہیں آباد رکھے...... میں راضی ہوں۔"

شبانہ اور اس کے پیچھے روتا ہوا تیرہ سالہ اذان آ رہا تھا...... شبانہ خاموشی سے صفہ بخاری کا عبایا تہ لگانے لگی۔

"تجھے کیا ہوا ہے؟" سندری نے اذان سے پوچھا۔

"امی...... مجھے نہیں جانا کہیں......" سندری یوں سوالیہ نظروں سے صفہ کو دیکھنے لگی جیسے اس نے پابند کر رکھا ہو۔

"اذان...... بچہ...... اپنے ماں، باپ کے ساتھ جاؤ......"

"بخاری بی بی......" یہ کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ شبانہ نے اسے گلے سے لگا کر چوما۔

"بخاری باجی، یہ کہتا ہے یہاں قاری صاحب آتے ہیں، ہمیں قرآن پڑھاتے ہیں، اچھی، اچھی باتیں بتاتے ہیں...... اور کہتا ہے مجھے بخاری بی بی کو اکیلا چھوڑ کے جانا اچھا نہیں لگتا۔" صفہ بخاری، تاثرات میں مخلل ہوتی بیچارگی کو مسکراہٹ سے مٹا کر بولی۔

"قاری صاحب کو میں کہہ دوں گی...... وہ اس گھر میں آپ دونوں بھائیوں کو پڑھا دیں گے۔ اور جب تمہارا دل کرے یہاں آ جانا...... میں دور تو نہیں ہوں۔"

"ہاں جی...... میں یہاں ہوں، ماما منشی یہیں ہیں، بخاری باجی کیوں اکیلی ہوں گی۔"

"شبانہ، تم بھائی، بھابی کے ساتھ چلی جاؤ، میں کسی کے لیے بھی پابندی نہیں رکھتی۔"

"میں اپنی مرضی سے یہیں رہنا چاہتی ہوں، لالا میرا بھائی ہے اس سے کوئی شکایت نہیں...... سندری کو سمجھایا ہے لالا چلا جائے گا تو دو بچوں کے ساتھ اکیلی ہو جاؤ گی مگر اس کی مرضی جو سمجھدار ہے۔"

"میرے بھائی کا گھر ہے وہاں۔" سندری نے جلدی سے کہا پھر اذان کا بازو پکڑا۔

"چل اذان...... تیرے ابو انتظار کر رہے ہیں۔ چل بیٹا...... جب دل کرے بی بی کے پاس آ جانا۔"

اذان سر جھکائے صفہ کے پاس آیا۔ صفہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا...... پڑھائی اور دینی تعلیم حاصل کرنے کی دعا اور تلقین کی۔ اذان کندھے جھکائے آگے سندری اس کے پیچھے چلے گئے، صفہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ منٹوں میں منظر صاف ہو گیا۔

حویلی کا منظر بھی اب بدل گیا۔ سرونٹ کوارٹر میں اب منشی ماما اکیلا رہتا تھا۔ شبانہ کو صفہ بخاری نے حویلی کے اندر جگہ دے دی تھی۔ شبانہ کی خواہش بھی

بھی تھی۔ صفہ نے اسے اس کے کمرے میں ٹی وی چلانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن شبانہ بہت کم ٹی وی دیکھتی تھی اس کی سب سے بڑی تفریح باتیں کرنا تھی۔ صفہ اس کا ساتھ کبھی، کبھی دیتی۔ علمی سطح کے فرق کے علاوہ صفہ طبعاً خاموش تھی۔ شبانہ کبھی، کبھی دن کے دن پڑوس یا برادری کے گھروں میں چلی جاتی تھی۔ لالہ واپس دبئی چلا گیا تھا۔ اذان جمعہ کا سارا دن آکر حویلی میں گزارتا۔ جمعے کی نماز مسجد صفہ میں پڑھتا...... اس دن اس کی شبانہ پھپو اس کے لیے اس کی پسند کی چیزیں پکاتی، سنبھال، سنبھال کر رکھے ہوئے چھوٹے موٹے تحفے دیتی۔

☆☆☆

ایک کروڑ گٹھلیوں کے ایک، ایک لاکھ کے سو تھیلے بنوا کر رکھوانے کا کام مکمل ہونے پر آج صفہ بخاری خوش تھی تو شبانہ بھی شاد تھی۔

اپریل کا مہینہ تھا، فضا میں آم کے کچے بور کی مہک رچی رہتی۔ کوئل کوکتی تھی، بہار، خزاں، سرما، گرما تیز رفتار دائرے میں موسموں کے رنگ بکھیرتا وقت بھاگا جا رہا تھا۔ صفہ کے بالوں میں جگہ، جگہ چاندی چمکنے لگی تھی۔ عمر کے پینتالیس سال گزر چکے تھے، البتہ اپنا خیال رکھتی خود کو سنوار سنبھال کر رکھتی تو یہ کوئی بوڑھی عمر نہ تھی۔ شبانہ اس سے چند ہی برس چھوٹی تھی۔ فربہی مائل جسم مگر چاق و چوبند، منٹوں میں کام نمٹا دیتی۔ بالوں اور ہاتھوں میں مہندی رچانے کا اسے شوق تھا۔ سرخ وسیاہ بالوں کا جوڑا گردن پر کسے کوئی نہ کوئی نعت کے بول گنگناتی یا خود کلامی کرتی رہتی۔ خود کو مصروف رکھتی سارا صحن روزانہ جھاڑ و لگاتا، دھوتا، صفائی کرنا اور اس نے خود پر لازم کر رکھا تھا، صفہ کے کہنے کے باوجود کوئی مددگار ملازم رکھنے کو تیار نہیں تھی۔ ہفتے میں ایک بار کمروں کی باری آجاتی، کونا، کونا چمکایا جاتا، مچھر، مکھی نظر آجائے تو ختم کر کے ہی دم لیتی۔ پھر اس نے بچوں کو ناظرہ قرآن پاک کا سلسلہ شروع کرلیا، آج کل عصر کے بعد حویلی کے باغیچے میں ننھے پھولوں کی تلاوت ہوئی رہتی۔ اتوار

کے دن یہ رونق دن کے پہلے حصے میں ہوتی۔

☆☆☆

ایک روز معلوم ہوا شبانہ کے شوہر نے دوسری شادی کرلی اور اسے طلاق نامہ بھجوا کے قطر میں ہی گھر بسالیا۔ شبانہ یہ سانحہ متوقع انداز میں صبر سے سہہ گئی۔ البتہ وہ کبھی، کبھی کہتی۔ ''بھلے شادی کرلیتا پر مجھے طلاق نہ دیتا، میں اس کے نام پر مر جاتی۔'' اس لیے اس نے طلاق نامہ، ملنے جلنے والوں سے چھپالیا تھا اور کوئی ذکر نہیں کیا...... یہ اس کی دوراندیشی کی انتہا تھی۔

صفہ بخاری کے پاس کبھی کبھار جامعہ سے آنے والے ٹیلی فون معدوم ہو چکے تھے البتہ مسجد صفہ کی ترقی کا کام کبھی نہیں رکا تھا۔ مسجد کی بیرونی دیواروں پر نماز کی ترغیب کی احادیث اور احکام، خوب صورت خطاطی میں تحریر کیے گئے تھے۔ صفہ تو ہر فصل پر آمدن کا آدھا حصہ مسجد کے لیے الگ کرلیتی تھی۔

پھاٹک پر کسی گاڑی کے رکنے اور پھر پھاٹک کھلنے، گاڑی اندر آنے کی آواز سنائی دی۔ پھاٹک پر چوکیدار بڑے بخاری صاحب کے زمانے کا تھا۔ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب اس کا برادر نسبتی ساتھ ہوتا تھا۔ شبانہ باغیچے میں بچ پر بیٹھی سپارہ پڑھنے والے بچوں کو چوتھا کلمہ یاد کرا رہی تھی۔ ترجمہ دہرواتے ہوئے بچے انگشت شہادت کھڑی کرکے بآواز بلند کہہ رہے تھے۔

''اسی کے لیے بادشاہی ہے اور اسی کے لیے حمد ہے۔''

''وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے...... اس کو ہرگز فنا نہیں...... وہ بڑے جلال اور عظمت والا ہے۔''

سامنے روش پر کوئی خاتون چلی آرہی تھی جس نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ شبانہ نے دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ گئی چند قدم چل کر آگے بڑھی غور سے دیکھنے پر پہچانا۔

''السلام علیکم جی...... باجی نخبہ ہیں آپ؟'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''وعلیکم السلام...... سبحان اللہ...... صفہ تری مہک سے فضائیں خوشبو دیتی ہیں...... تم...... شاید وہ...... ہوناں...... اماں بتولاں کی بیٹی......؟''

شبانہ پر بھی وقت کی آندھیاں اثر چھوڑ چکی تھیں۔ نخبہ خاور نے تو کئی سال پہلے دیکھا تھا جب شبانہ کی نئی، نئی شادی ہوئی تھی اب وہ بیوگی کی سی زندگی بتا رہی تھی مگر نا قابل پیمائش حیرت تو شبانہ کی آنکھوں میں اتری تھی۔ وہ پری پیکر، پری جمال، جدھر سے گزر جائے پھول کھل اٹھیں۔ تتلیاں رقص کرنے لگیں وہ کیوں اتنی عام سی ہوگئی تھی۔ اگرچہ چادر قیمتی اور نفیس کڑھائی والی تھی مگر چہرے سے کمزور، جسم سے ڈھیلی جیسے اپنے آپ کو بھول گئی ہو، شبانہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اسے حویلی کی طرف بڑھتا پا کر جلدی سے تیز قدموں آگے ہو کر چلنے لگی تا کہ صفہ کو خبردار کر سکے۔

''بخاری بی بی، آپ کی مہمان آئی ہیں۔'' وہ راہداری سے ہی بولنے لگی...... ''دیکھیے تو بخاری باجی...... کون آئی ہیں۔''

خود سے بولتے رہنا اس کی عادت تھی، صفہ غور نہیں کرتی تھی۔ وہ انہماک سے چینی کی پلیٹ میں رکھی اصلی گلاب کی پتیاں احادیث کی مجلد کتاب میں اوراق پلٹ، پلٹ کر رکھتی رہی، ہلکی سی دستک کے ساتھ شبانہ اور نخبہ آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئیں۔ صفہ کی پہلی بے خیالی نگاہ شبانہ پر تھی مگر اگلے ہی پل پہچان وارد ہوئی وہ بخاری جلد میز پر رکھتے ہوئے مسکرا اٹھی...... ''پانچ نہیں پھیلا کرتیا ک سے گلے ملنے والی نخبہ کہہ رہی تھی۔

''دیکھو صفہ...... میں تری محبت میں لوٹ آئی ہوں۔''

''السلام علیکم رحمتہ اللہ...... مرحبا!'' صفہ اتنا پُرجوش استقبال بھلا کس کا کرتی تھی۔ شبانہ دونوں سہیلیوں کی مدت بعد ہونے والی جذباتی ملاقات سے خوش ہو رہی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی چائے ناشتے کا انتظام کرنے چلی گئی۔

''مجھے پتا تھا کہ تم...... آؤ گی ایک دن......''

''تجھے تو بہت کچھ پتا ہے، یہ مجھے پتا ہے۔'' وہ چادر اتار کر دوپٹا لے رہی تھی۔ ''تمہارے گھر، چار

میں جس حلیے میں رہتی ہوں تمہارے ہاں ویسے جانا میری جہالت تھی...... ویسے...... ان چھ سالوں میں میں نے اپنی ساری عمر بتالی ہے...... جو نہ سیکھا تھا وہ سیکھ لیا ہے۔ میں آج جلدی جانے والی نہیں...... میرے پاس پورے تین گھنٹے ہیں۔'' پھر وہ خالص گھریلو رشتے داروں کی طرح صفہ کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں شوق سے...... تین گھنٹے کون سی لمبی مدت ہوتی ہے تم اور بھی وقت گزارو...... اپنا حال سناؤ، میاں کیسے ہیں؟ آج کل کہاں پوسٹنگ ہے؟'' وہ صفہ کا سوال نظرانداز کر کے بڑے انہماک سے اسے دیکھے گئی۔

''تیرا چہرہ ویسے ہی تر و تازہ ہے، آنکھوں میں نورانی چمک ہے...... بال زیادہ ہی سفید کر ڈالے ہیں، دیکھ تیرے ہاتھ بھی بھرے، بھرے ہیں......'' وہ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر تھپکنے لگی۔

''صفہ...... مجھے دیکھ کر نہ پوچھو گی...... کہاں گیا میرا حسن و سنگھار......؟'' پھر ہنس پڑی۔ ''حسن و سنگھار کی دوڑ بھی آخر ہار جانا ہوتی ہے ڈیئر...... جس میں جتنا دم ہے دوڑے...... پر دم تو سب ہی کا ٹوٹتا ہے...... کسی کا کچھ پہلے، کسی کا کچھ بعد میں...... خیر اتنی بوڑھی نہیں ہوگئی میں...... ہماری عمر والی کئی ایسی ہیں کہ دیکھوں تو سوچوں ان کا رشتہ کرا دوں......'' پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر مہاگنی کلر بالوں کی لٹ اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے مصنوعی ادا سے کہا۔

''تم بدلی بھی ہو نخبہ اور...... نہیں بھی بدلی ہو۔'' صفہ کے لب بے ساختہ مسکرا اٹھے۔

''ہاں صحیح کہہ رہی ہو، انسان کا ڈی این اے تو لاکھوں برس کی مٹی میں دب کر بھی نہیں بدلتا...... البتہ...... اور بہت کچھ بدل جاتا ہے۔''

شبانہ نے تواضع کا مناسب انتظام کرلیا...... جو پھل فریج میں رکھے تھے ان کی فروٹ چاٹ بنالی...... فالسے کا جوس نکالا، ٹرے لے کر آئی تو پوچھا۔

''بخاری باجی...... آپ کہیں تو بچے کو بھیج کر ابھی کی

لیے نہیں کہ...... پتا نہیں نخبہ باجی پرہیز کرتی ہوں...... وہ جی لڑکیاں اپنی ڈائٹ کا خیال رکھتی ہیں ناں......"

"لڑکیاں......!" نخبہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ "شبانہ...... تراکوئی حال نہیں...... عینک لگوالے اب......"

"منگالوں جی......" شبانہ ہنستی رہی۔

"نہ...... امرتی بیگم میں نہیں کھاتی، تیری مہربانی......"

"اچھاجی......!" شبانہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

فالسے کا جوس گھونٹ، گھونٹ پیتی نخبہ گزرے سالوں کی کہانی سنارہی تھی۔

"وہ تھا روزِ ازل سے چھیل چھبیلا...... جیسا تھا ویسا ہی رہا...... افسری کا لیبل ہو، پیسہ ہو، رنگ برنگی مچھلیاں خود آجاتی ہیں...... نتاشا نامی ماڈل تھی اس نے پکا کام کیا...... بس ان کے نکاح کا پتا چلا تو میں نے ڈیورس کیس کردیا جبکہ اس سے نکاح کرتے وقت اسے پتا تھا کہ ہمارا بچہ ہونے والا ہے۔ ہماری شادی کے تیرہ سال بعد پیدا ہونے والا بچہ...... اتنا مانگا ہوا بچہ...... اس کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا...... اس کی آنکھوں پر نتاشا کے عشق کی پٹی بندھی تھی...... اس نے بچہ مجھے لکھ کر حوالے کردیا...... بدلے میں حق مہر معاف کرالیا...... مجھے یہ سودا منظور تھا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کہاں ہے تمہارا بچہ اب؟"

"بیٹا ہے میرا...... اللہ اسے سلامت رکھے۔"

"تمہیں بہت مبارک ہو...... اللہ کرے، نیک صالح ہو، تمہارا سہارا بنے۔"

نخبہ کے منہ سے آہ سرد نکلی، چہرہ سنجیدہ تر ہوگیا۔ صفہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا۔

"ہاں...... صفہ...... جو اللہ چاہے۔"

"لائی نہیں ہو ساتھ......؟ کس کے پاس چھوڑا ہے؟"

"میری مما کے پاس ہے...... دو سال پہلے پاپا کی ڈیتھ ہوگئی...... میں ان کا آخری دیدار تک نہ کرسکی...... صفہ میں بہت لاڈلی بیٹی تھی اپنے پاپا کی...... وہ نہایت محبت کرنے والے، شفیق، ملائم مزاج

باپ تھے، مما ڈانٹ لیتی تھیں بلکہ آج تک ڈانٹ لیتی ہیں...... پاپا نے اپنی سوچ بچار سے میری امیر کبیر گھرانے میں شادی کی...... ایسی شاندار شادی کی تھی کہ سالوں دھوم رہی...... مگر وہ میرا نصیب تو نہیں لکھ سکتے تھے ناں۔"

صفہ نے فروٹ چاٹ کا باؤل کھسکایا...... وہ اپنے پیالے میں دو چمچے ڈالتے ہوئے بولی۔

"میں نے دنیا گھومی...... پانچ چھ سال باہر رہی...... میں نے کیا نہیں دیکھا، حسین زندگی، انسان پر راج کرتی زندگی...... انسان کو لیے، لیے پھرتی زندگی...... I saw the life dominating the humans ایک ایسی زندگی جس کی پہلی شرط جسمانی توانائی و حسن یعنی جوانی ہے۔ دیکھو ناں...... جب آسائشات کا انبار اپنی جانب کھینچتا ہو...... ریشمی دبیز بستر وہ بھی گرمی میں سرد لہروں میں ڈوبے ہوئے اور سردی میں حرارت بخشتے...... ڈریسنگ کارنر سنگار کے لوازمات سے سجے ہوئے بلکہ لدے ہوئے...... طرح، طرح کی خوشبوئیں، ایسی، ایسی لگژریز کہ اس میں تھکن، بڑھاپے، بیماری کا کوئی حصہ نہیں...... وہ تو ایسی زندگی ہے جو زندگی سے اڈر رہی ہے، یہ صرف ایک جھلک ہے...... بائز، فوڈز، آؤٹنگ کے حیران کن پوائنٹس، لش، لش بھاری گاڑیاں زندگی جوان ہے...... چمکار ن فریبین جوان ہے...... اس کو پکڑنے کی تیز دوڑ جاری ہے۔ اس دوڑ میں پوری کی پوری صنعتیں جھونکی گئی ہیں...... کاسمیٹکس، سرجریز...... سلمنگ سینٹرز، جمز، ڈریسز، ایک گھن چکر ہے...... اچھی رہیں تم کہ سمٹ سمٹا کر کونے میں بیٹھ رہیں، میرے پاس بہت کہانیاں ہیں، بہت کچھ کہنے کو ہے...... تمہیں یہ خبر بھی سنادوں کہ میں شاعری بھی کرتی رہی ہوں...... میں جو کہ انت کی دنیا دار، گناہ گار...... کتے کی طرح دنیا کے پیچھے بھاگنے والی...... مگر میرے اندر کہیں...... ایک جگنو کی چمک جتنی روشنی تھی...... وہ بھی ساتھ، ساتھ رہی...... وہ گاڈ گفٹڈ تھی......

آستانے پر آئی تھی...... اسی روشنی نے اشارہ دیا تھا...... یہیں، کہیں کوئی راہ نکلتی ہے۔"

شبانہ نے سموسے فرائی کرکے لا رکھے، صفہ نے آگے بڑھائے۔

"ڈیئر...... تم یہ تکلف نہ کرو...... میں یہاں بالکل relax ہوتی ہوں۔" کلاک کی طرف دیکھا۔ "ابھی ظہر میں دیر ہے۔"

موٹے سفید کھلے کرتے اور سفید پتلی چادر میں ملفوف صفہ پلنگ پر اس کے سامنے بیٹھی تھی...... وہ ہمیشہ سے سامع ہی رہی تھی اور آج تو نخبہ کے پاس کہنے کو بہت تھا۔

شبانہ اندر آکر جھانکی اور صفہ بی بی سے آہستہ سے پوچھا۔

"دوپہر کے کھانے کا انتظام کرلوں......؟"

(صفہ تو دوپہر کا کھانا کھاتی ہی نہیں تھی) نخبہ نے سن لیا۔ روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں شبانہ...... میں ابھی گھنٹے تک چلی جاؤں گی...... بچہ چھوڑ کر آئی ہوں، اب آتی رہوں گی...... فکر نہ کرو، یہ خدمت تم سے کرواؤں گی۔"

"سو بسم اللہ جی...... روز آؤ...... نکے کو لے کے آؤ......" شبانہ تو مسکراتی ہی رہتی تھی، جھلی نہ ہو تو......

"ہاں صفہ، میں ایسے ٹوٹی پھوٹی شاعری کرتی...... برمنگھم میں اردو، انگلش میگزین نکلتے تھے، تب بچہ بھی نہیں تھا...... شوہر کی بے اعتنائی عروج پر تھی...... مجھے لکھنے پڑھنے کا وقت ملا...... اردو کے ثقیل ترین الفاظ بولنے کی عادت ہوگئی...... ایسی شاعرہ بن گئی، بنالی گئی...... رائٹرز کی گیدرنگز ہوتیں طرح، طرح کے ناموں کے ساتھ...... فلاں کے ساتھ شام...... فلاں کی یاد میں مشاعرہ...... میں کون سی تیس مار خان لکھاری تھی مگر میری لکس میں گلیمر تھا...... محفلوں میں میری بہت پذیرائی ہوتی...... مرد کتنا ہی خود کو دانشور کہے گرتا گلیمر پر ہی ہے...... مرد کی سرشت بھنورائی اور عورت کی سرشت داد طلبی...... پھول بن کر مہکتی رہنے پر سرشت کے ہاتھوں مجبور...... ابھی اس موضوع پر بات نہیں کرتی......

ہے...... ہمارے معاشرے میں آزاد ماحول، مخلوط تعلیمی ادارے...... میڈیا، فلم، ٹی وی...... اور یا پھر ادب کے نام پر مخلوط محفلوں میں ہوتا ہے...... یہاں کسی سینئر، جونیئر، شادی شدہ، کنوارے، بڈھے، جوان کے عشق پر پابندی نہیں...... پارلر سے تیار شدہ خوب صورت کو بتا میں...... بڑی گنجائش ہے داد دینے والوں کے پاس...... داد سمیٹنے والوں کے پاس بھی محبتیں ہیں، لفظی رومان کے تو دریا بہہ رہے ہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"ہر انسان اپنی اصلاح کرسکتا ہے، تم اپنی اصلاح کرسکتی تھیں۔" صفہ لب کشا ہوئی۔

"اصلاح کرلینا اتنا آسان ہوتا تو......" وہ ذرا کی ذرا رکی پھر سانس لے کر شروع ہوئی۔ "بہرحال میں برمنگھم سے جب فرینکفرٹ گئی تو میرا لکھنے کا موڈ وہاں ختم ہوگیا...... وہاں میری خالہ زاد رہتی ہے وہ جاب کرتی تھی...... اس نے اپنی کمپنی میں مجھے جاب دلوادی اور میں اس میں مصروف ہوگئی...... وہیں میرا شوہر آخری بار مجھے ملنے آیا تھا...... ایسے لگتا تھا کہ ہمارے گلے شکوے ختم ہورہے ہیں...... یہ بیٹا تحفے میں دے گیا...... مگر جیسے ہی اسلام آباد پہنچا...... پھر پہلے جیسا ہوگیا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ...... یہ منہ سے تلخی ظالم نہیں چھوتا کرتی، میں نے جب نتاشا سے اس کے ریلیشن کا سنا اسے فون کرتی فون بند ملتا اس نے نمبر ہی تبدیل کرلیا...... میں نے گوگل کرکے نتاشا کی تصویر دیکھی...... وہ بے باک مگر دلکش تھی۔ میرا دل ٹوٹ گیا...... میں نتاشا کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی...... وہ مجھ سے دس سال چھوٹی تھی۔ سرو قد، اسمارٹ، فریش، اپ ٹو ڈیٹ...... تب شکست میرے اندر اتر گئی...... یہ وہ دبوچ لینے والا لمحہ ہوتا ہے جس کسی بھی حسینۂ عالم، مس ورلڈ، خوب صورتی کی دھوم کا دور رکھنے والی پر جب آتا ہے تو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ کاری جھٹکا ہوتا ہے...... زمین پر سال بہ سال تازہ گلاب کھل رہے ہیں، جو تازہ کھلتا ہے وہ مرجھاتا بھی ہے...... لیکن یہ کوئی جواب نہیں...... ہمارے خاوندوں کے پاس

جواز نہیں ہے کہ وہ اپنی ترجیحات اور انتخاب بدلتے رہیں...... آہ...... صفہ...... میں کتنا بولتی ہوں......؟''

صفہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

''زبان کا بھی تو حساب ہوگا ناں......؟''

ایک بار پھر اقرار میں سر کو جنبش دی۔

''میں ان تھک بولتی ہوں...... اس لیے کہ میرے اندر بہت بے قراری ہے، گرہیں کھولنے کا وقت کم ہے اور گرہیں بہت ہیں، میں جتنا بولی ہوں یہ صرف تمہید تھی یہ صرف دیباچہ تھا...... اب آتی رہوں گی...... بلکہ اب آچکی ہوں...... ہاں ڈیئر دو باتوں کا خیال رکھنا...... شبانہ کو کہہ دینا میرے آنے پر کسی تکلف، تردد میں نہ پڑے...... ویسے مجھے بھوک کم لگتی ہے اگر مجھے کچھ کھانا ہوگا، اگلی بار کچن دیکھ لوں گی تو خود بنالوں گی...... دوسری بات میری وجہ سے اپنے روٹین کے آرام، وظائف جو بھی تم کرتی ہو...... بالکل متاثر نہ کرنا...... مجھے فرشتگی بتادیا کرتا کہ اب تمہیں یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے، میں تمہاری روح پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔''

وہ اٹھ گئی تو صفہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی...... مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''شبانہ تکلف نہیں کرے گی...... مگر تم جو کچھ اور جیسا بھی چاہوگی وہ بنانے میں خوشی محسوس کرے گی...... اور یہ میں بناوٹ میں نہیں کہہ رہی...... اگلی بار اپنے بیٹے کو ضرور لانا۔''

''میرے بیٹے کا نام حسین ہے۔''

''حسین؟''

''نہیں حسین...... س کے ساتھ۔''

''اس کا مطلب؟''

''مجھے پڑھ کر اچھا لگا۔''

''اگر تم اجازت دو تو میں تھوڑی تشریح کے ساتھ یہ نام بدل دوں؟'' صفہ نے پوچھا۔

''ڈیئر! تم عالمہ ہو، مجھ سے بہتر نالج رکھتی ہو...... مجھ سے ایسے تکلف سے بات نہ کرو، تم بتاؤ۔''

''حسین مدینہ کے زرگر قبیلے کے سردار تھے،

تورات کے بڑے عالم بھی تھے۔ تورات میں آخری رسول کی نشانیاں پڑھی ہوئی تھیں۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینے میں آمد کا سنا تو بہت اشتیاق سے ملنے آئے۔ نبی پاکؐ سے گفتگو کے دوران یقین پختہ ہوگیا۔ صدقے کی کھجور دے کر نبوت کو آزمایا...... مہرِ نبوت کی تصدیق کی پھر وہیں کھڑے، کھڑے ایمان لے آئے۔ نبی پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا نام حسین سے عبداللہ بن سلام رکھا۔ عبداللہ بن سلام نے کہا میری قوم یہود دل سے آپ کو مانتی ہے مگر حسد، بغض اور انا انہیں اقرار کرنے نہیں دیتی، آپ یہود کے سرکردہ لوگوں کو بلائیں ان سے پوچھیں حسین کون ہے باقی آپ ان کے جواب سن لیجیے گا...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا، یہود آئے حسین کی تعریفوں کے پل باندھنے لگے کہ وہ ہمارا سردار ہے سردار کا بیٹا ہے سب سے بڑا عالم ہے تورات پر عبور حاصل ہے، سب سے دانا اور افضل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تمہارا سب سے بڑا عالم اور دانا اور افضل سردار مجھ پر ایمان لے آیا ہے۔ وہ بولے۔ ''ناممکن'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آواز دی۔ ''عبداللہ ابن سلام......'' وہ سامنے آئے مگر ازلی یہودی تھے بدزبانی کرنے لگے...... کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہود کا حسین، اسلام کا عبداللہ......''

''بہت عمدہ بات کی...... عبداللہ بن خاور...... خاور میرے پاپا کا نام تھا [illegible] ہے۔ میں عبداللہ کو لاؤں گی، تم دعا کر کے اس کا نام رکھنا...... ہم مل کے اس کو سیلیبریٹ کریں گے۔''

نخبہ چلی گئی تو پاس ٹھہری شبانہ نے پہلا سوال یہی کیا۔ ''حسین...... میرا مطلب ہے عبداللہ باجی کا بیٹا ہے؟ ہائے اللہ...... نخبہ باجی کا بیٹا بھی ہے۔''

''ہائے اللہ نہیں...... ماشاء اللہ......''

''ہاں جی...... وہی جی...... ماشاء اللہ...... پیارا ہوگا...... خود بھی اتنی پیاری ہیں مگر ایک بات کہوں؟''

صفہ نے کلام پاک بلند جگہ سے اتارتے ہوئے

اثبات میں سر ہلایا۔

''نخبہ باجی بجھ سی گئی ہیں۔ پہلے جیسی نہیں رہیں...... کیا بیمار ہیں؟''

''نہیں...... بیماری کا تو کوئی ذکر نہیں کیا...... بس تنہا ہوگئی ہے۔'' پھر صفہ نے قرآن مجید کھول لیا اور شبانہ کوئی دوسری بات نہ کرسکی۔

☆☆☆

قاری مولانا غلام رسول جو کافی بزرگ ہوچکے تھے اور جن کا مسجد صفہ سے شروع سے تعلق رہا تھا اور یہ وابستگی قائم تھی۔ اپنے پوتوں کے ہمراہ حویلی میں صفہ بخاری سے ملاقات کی اجازت طلب کرنے آئے تھے۔ ان کا حویلی میں آنا کسی اہم ترین بات کی نشاندہی کرتا تھا۔

منشی بابا نے دعا سلام کر کے انہیں ملاقاتی کمرے میں بٹھادیا۔ اندر اطلاع کی گئی۔ شبانہ شربت بنانے جارہی تھی کہ صفہ نے اسے روک لیا۔ اور اپنے ہمراہ چلنے کو کہا...... شبانہ نے چادر اوڑھ لی۔ صفہ نے عبایا پہنا...... صوفے پر بیٹھے ہوئے بزرگ قاری غلام رسول، مولانا عبدالرحیم باسط اور قاری صاحب کے تیرہ، چودہ سالہ دو پوتے صفہ بخاری کو آتا دیکھ کر احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے، جب سب بیٹھ چکے تو صفہ نے کہا۔

''آپ کی آمد مرحبا...... مگر میں فکرمند ہو رہی ہوں...... سب خیر تو ہے؟''

''الحمدللہ خیریت ہے...... ایک مشاورت کے لیے حاضر ہوئے ہیں بلکہ اپنی بزرگی کے پیشِ نظر میں اسے نصیحت کہوں گا......'' قاری صاحب نے فرش پر نظریں جمائے، جمائے کہا۔

''جی فرمائیں......''

''مسجد صفہ کے مصارف کا بڑا حصہ آپ ادا کرتی ہیں...... مخیّر حضرات کا چندہ بھی ہوتا ہے...... مگر یہ ایک بڑی مسجد ہے، جامع مسجد ہے...... اسے اوقاف کی تحویل میں دینے کے بعد بڑی مدد حاصل کرسکتی ہیں، دوسری صورت میں آپ اپنی جائداد سے ٹرسٹ

چالاکیاں

میاں، بیوی میں جھگڑا ہو رہا تھا۔

بیوی: میں پورا گھر سنبھالتی ہوں، کچن کو سنبھالتی ہوں، بچوں کو سنبھالتی ہوں تم کیا کرتے ہو۔

''شوہر: میں خود کو سنبھالتا ہوں تمہاری نشیلی آنکھیں دیکھ کر۔

''بیوی: آپ بھی ناں...... اچھا چلیں بتائیں آج کیا بناؤں آپ کی پسند کا۔''

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

بنادیں...... اور مسجد ٹرسٹ کے زیرِ نگرانی کردیں۔ ٹرسٹی ممبرز قانون، فقہ، علوم اسلامیہ کے ماہر یعنی جدا، جدا اشخاص منتخب کرسکتی ہیں۔''

''ٹرسٹ کی صورت میں آپ ثوابِ جاریہ کا کوئی اور نیک کام بھی اس میں شامل کرسکتی ہیں...... یہ آپ کی رضا پر منحصر ہے۔'' قاری صاحب کی بات کو بڑھاتے ہوئے عبدالرحیم باسط صاحب بولے۔

''مثلاً؟''

''خیراتی اسپتال...... اسکول، مدرسہ...... لنگر خانہ...... خواتین کی تربیت گاہ جو مناسب لگے۔''

''مسجد اوقاف میں رجسٹرڈ تو ہے لیکن میں اس کا خرچ برداشت...... کرسکتی ہوں۔ یہ مسجد میرے لیے اولاد کی طرح ہے۔ البتہ میرے بعد میرا وارث کوئی نہیں ہے اس لیے مجھے ٹرسٹ قائم کرنے کے متعلق سوچنا چاہیے...... میں...... کسی وکیل سے قانونی مشورہ کرنا چاہوں گی۔''

''ہاں یہ بہتر رہے گا...... آپ ضرور مشورہ کریں...... وکیل ادریس ہوا کرتا تھا بھلا سا شخص تھا...... سنا تھا عرب امارات چلا گیا...... واپس نہیں آیا؟ آپ کے مزارعین کا ہی بیٹا تھا۔''

شبانہ کا سر جھک گیا۔ اس کا شوہر وکیل ادریس

مسجد کی تعمیر کے زمانے میں قانونی معاملات میں پیش، پیش ہوتا تھا۔

"ہاں جی...... وہ واپس نہیں آیا...... بہر حال کسی اور وکیل سے رابطہ کرلیا جائے گا......" منشی چند وکلا کی بابت بتانے لگا۔ صفہ نے بات سمیٹی۔

"قانونی مشاورت کے بعد مسجد میں میٹنگ رکھ لی جائے گی۔"

"ایک اور بھی عرضداشت ہے......" مولوی...... عبدالرحیم باسط کھنکھارے...... صفہ سوالیہ دیکھنے لگی۔

"مسجد سے ملحقہ مکان ہے، اس کے مالک نے برائے فروخت کردیا ہے۔ یہ مسجد کی پشت پر ہے، دائیں طرف تو میرے بال بچے رہتے ہیں۔" قاری صاحب نے مزید وضاحت کی۔

"بی بی، آپ میری بیٹی کی جگہ ہو، میں تو یہ کہتا ہوں آپ اس مکان کو خرید لیں، وہ کوئی بارہ مرلے پر بنا ہوا ہے، تعمیر کو بھی دس گیارہ سال ہوئے ہیں، پرانا نہیں ہے۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسے مسجد میں شامل کیا جائے؟"

"مسجد میں تو اس حالت میں شامل نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ رہائشی طرز تعمیر ہے...... مسجد کو اس کی ضرورت بھی نہیں۔"

"پھر خریدنے کا مقصد......؟"

"تاکہ کوئی نامعلوم ایسا ویسا اسے نہ خرید لے جو کل کو باعث کوفت ہو......" مولوی عبدالرحیم باسط کی بات بھی درست تھی مگر مولانا قاری نے اسے کافی وجہ نہ گردانا۔

"میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں...... یہ حویلی جس میں آپ رہائش پزیر ہیں، ماشاء اللہ بہت زیادہ بڑی ہے، اس حویلی میں کئی خاندان رہ سکتے ہیں۔ اس پر سازشی لوگ بھی نظر رکھے ہوں گے، میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے۔ ایک اکیلی آپ ہی مالک ہیں، آپ کے ساتھ کچھ بھی کرکے اسے ہتھیایا جاسکتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا، بیٹی...... اس حویلی کی مالیت کروڑوں میں ہے، میرا مشورہ ہے بی بی اسے آپ خود فروخت کردیں...... میں جانتا ہوں آبائی گھر بہت عزیز ہوتا ہے، یادیں وابستہ ہوتی ہیں مگر انسان کیا اور اس کی یاد کیا...... صفہ بخاری بی بی سے بڑھ کر مال و اسباب اور محبت کی ناپائیداری اور فنا کو کون جانے گا...... آپ یہاں سے اگر مسجد کے ساتھ والے گھر میں رہائش کرلیں تو مسجد نظروں کے سامنے رہے گی، اپنے کنٹرول میں رہے گی...... بخدا مجھے یا ہمیں اس میں کوئی مفاد نہیں ہے...... میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں...... میرے مشورے پر سکون سے غور کریں بی بی۔"

"جی ضرور...... جزاک اللہ...... آپ میرے دینی بھائی ہیں، علمی اعتبار سے احترام کے مقام پر ہیں، آپ کی تجاویز مخلصانہ ہیں، آپ تشریف رکھیے...... منشی جی کو اپنی خدمت کا موقع دیجیے...... میں ان باتوں پر ضرور غور کروں گی۔"

دل میں دکھ کا پہاڑ گر جانے کے باوجود صفہ نے تحمل اور صبر سے جواب دیا۔ وہ دونوں اندر آگئیں اور منشی بابا تواضع کا اہتمام کرنے لگا۔ شبانہ اپنے ماموں منشی کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اندر آکر صفہ نے عبایا اتارا، غسل کیا اور نماز میں مصروف ہوگئی......

☆☆☆

اس بات کو کئی دن گزر چکے تھے۔ صفہ کے اندر اترا ہوا سناٹا ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ وہ عشا کی نماز کے بعد تسبیح لیے صحن میں ٹہل رہی تھی۔ کوارٹر والی سائڈ پر خاموشی اور مہتابی روشنی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا، تاروں بھرے آسمان کے نیچے آمد گرما کی تمازت اور نوید حیات تھی، سرما کے ختم ہونے پر انسان، جانور، پرندے ہی نہیں زمین پر رینگنے والے حشرات، پتنگے، چیونٹیاں، مکوڑے، شہد کی مکھیاں ہوں یا عام مکھیاں الغرض ہر جاندار موسم کی اس تبدیلی سے متاثر ہوتا ہے۔ صفہ محسوس کرسکتی تھی کہ یہ ادلتے بدلتے مناظر محض ظاہری ہیں، اصلی منظر وہ علم ہے جس کے بارے میں حضرت علیؓ نے فرمایا "مجھے کوئی ایسا نہیں ملتا جس کو اس علم کی ترسیل کرسکوں جو میرے پاس ہے۔" حضرت کی تو اس دور میں اس کا اہل نہ ملتا تھا، جب اویس کا دور تھا...... اب کہاں کوئی رہا ہوگا (ہاں مگر جو اللہ چاہے) وہ سوچتی گئی۔ "اللہ نے جغرافیہ کے اوراق پلٹ کر رکھے ہیں۔ ان میں تاریخ کے مہرے اٹھاتا رکھتا رہتا ہے جیسے اس صحن میں خود کی جگہ امی کو رکھ دوں...... ابا صاحب کو اُدھر دیوان بچھا کے بٹھا دوں، یہ آج سے بیس برس پیچھے کا منظر ہے۔ اس سے بھی بیس ورق اور پیچھے پلٹوں تو امی کی صورت ریشمی رنگین کپڑوں میں جھلکتے پراندے والی نویلی دلہن رکھ دوں، حویلی کو تازہ رنگ و روغن کردوں، جوان پھپو، دادی، جھولا جھولتی مہرو...... جوان ابا...... اس سے بھی بیس تیس ورق پیچھے پلٹوں تو دادا حضور کا دورہ، نوکر چاکر، چلم، حقہ...... یہ حویلی مٹادوں، یہاں آم، کھجور، بیریوں کے باغات لگ جائیں، فلم ریورس ہوتی چلی جائے...... یا فلم فارورڈ ہونے لگے...... تامحشر کی کتاب تیار ہے۔"

صفہ ٹہل رہی تھی اور صحن میں رکھی چارپائی پر شبانہ خاموش لیٹی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک اپنا دوپٹا تانا ہوا تھا کیونکہ مچھر تھے، وہ کچھ گنگناتی تھی، دھیرے، دھیرے اس کا پاؤں ہلتا تھا، صفہ اسے دیکھتی تو جیسے دکھ کی ہلکی سی لہر اٹھتی...... یہ ہنستی بولتی عورت اندر سے کتنی تنہا ہوگی۔ پھر ایک دم اسے ایک خیال آیا اور اس سے وابستہ حدیث نبوی یاد آئی کہ "بیوہ، مطلقہ کے نکاح میں تاخیر نہ کرو......" وہ اپنی غیر ذمے داری پر پریشان ہوئی۔ شبانہ اس سے چھوٹی تھی اور اس کی رعیت میں بھی۔ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ صرف اپنی خدمت کی خاطر اسے روکے رکھے...... وہ رک گئی۔ شبانہ کی پائتی کے پاس ٹھہری اور پوچھا۔

"شبانہ...... میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

شبانہ نے جلدی سے دوپٹا منہ سے ہٹایا۔ "جی، باجی ضرور......" وہ ٹانگیں سمیٹنے لگی۔

"تم لیٹی رہو...... بس میں تھوڑی دیر کو بیٹھتی ہوں۔"

"آرام سے آگے ہو کے بیٹھو باجی...... میں کون سا سو رہی ہوں۔" شبانہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ صفہ نے تھوڑی سی آگے جگہ لی اور براہ راست اپنی پریشانی بیان کردی۔

"میں تم پر زیادتی تو نہیں کر رہی شبانہ...... مجھے بہت پہلے تم سے یہ بات کرنی چاہیے تھی۔ تمہاری طلاق کو دو سال گزر چکے ہوں گے، تمہیں دوسرا نکاح کرنے کا پورا حق ہے...... یہ حق تمہیں اللہ دیتا ہے، کیا میں اس سلسلے میں کچھ کروں؟"

"بخاری باجی...... آپ یہ سوچ رہی تھیں؟" شبانہ ہنس پڑی۔ "آپ تو بس سب کے لیے سوچتی رہتی ہیں، میں ایک بانجھ عورت ہوں اور اب تو میری عمر بھی بانجھ ہوگئی۔ جتنی باقی ہے آپ کی خدمت کرکے گزر جائے گی۔"

"نہیں شبانہ...... تمہاری عمر میں کئی لوگوں کی پہلی شادی ہوتی ہے۔"

"آپ بھی تو......"

"تم میری بات چھوڑو...... یہ بھی نہ سوچو کہ میں اکیلی کیسے رہوں گی، میں کوئی بندوبست کرلوں گی، کوئی انسان کسی کے لیے ناگزیر نہیں ہوتا۔" شبانہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر یوں خاموشی کو توڑا۔

"بخاری باجی...... بالکل سیدھی اور سچی بات کر رہی ہوں...... یوں تو میں نکاح کرکے بھی آپ کی خدمت میں رہ سکتی ہوں یہ راہ نکل سکتی ہے مگر...... شادی نے مجھے خوش نہیں کیا...... اور اس کے روپ میں، میں نے مرد کی خود پسندی دیکھی ہے، اب تو میں خود کو اتنا پسند کرنے لگی ہوں کہ شاید مجھ سے کسی کی خود پسندی برداشت نہ ہو۔"

"پگلی نہ ہو تو...... خود کو تو سب ہی پسند کرتے ہیں اسے سیلف ریسپکٹ کہتے ہیں...... بہر حال یہ میرا فرض تھا، باقی تمہاری مرضی......"

"چھوڑیں باجی...... کچھ اور باتیں کریں۔"

"دیکھو شبانہ...... تجھ سے باتیں کرنے والے ساتھی کی خاطر ہی کہہ رہی ہوں۔" صفہ نے مدتوں بعد شوخ جملہ بولا تھا۔ شبانہ ہنستے، ہنستے دہری ہوگئی۔ ہنسی

رکی تو کہا۔

''معصوم باجی......! مرد میری جیسی سیدھی سادی جاہل عورت سے باتیں نہیں کرتے، آپ کنواری پاک بی بی آپ کو کیا پتا۔''

صفہ کیا جواب دیتی، وہ تسبیح گھماتے ہوئے ٹہلنے لگی، پانچ سو دانے پڑھ کر پھر ایک بار شبانہ کے پاس رکی۔

''شبانہ......''

''جی...... باجی......''

''کیا میں حویلی بیچ دوں؟ تم کیا کہتی ہو؟''

''میں جی آپ سے یہ بات کرنا چاہتی تھی مگر مناسب نہ لگا، آپ بیٹھیں۔''

صفہ بیٹھ رہی...... چار کنال کی وسیع و عریض دو منزلہ حویلی جس کا بیشتر حصہ بند تھا، نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا محل تھا، جس کے چاروں طرف صحن تھا جس میں اس وقت صرف تین نفوس تھے، منشی ماما کوارٹر کے سامنے چارپائی ڈالے سو رہا تھا، اس کے ساتھ پیڈسٹل فین چل رہا تھا، پھاٹک کے ساتھ چوکیدار کی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی تو کیا کہنا ایک کمرا برآمدہ اور باتھ روم تھا۔ وہ وہیں کہیں لیٹا حقہ گڑگڑا رہا ہوتا۔ باقی ہر سمت سکوت، سناٹا اور اندھیرے کا راج تھا، صفہ کو یوں لگا جواب تو اس کے سامنے اور اردگرد موجود ہے، شبانہ اس کے سوا کیا جواب دے سکتی تھی۔

''دیکھیں جی باجی...... کتنا بڑا گھر ہے، اس گھر میں تو پورا ایک اسکول سما جائے...... پہلے دنوں میں کھاتے پیتے لوگ بڑے، بڑے گھر بنواتے تھے ان کے بیٹے، پوتے سب مل جل کر رہتے تھے......اور پھر......'' وہ رکی، جھجک مانع ہوئی، صفہ کی آنکھوں کے سوال نے اسے آمادۂ گفتگو کیا۔

''اور پھر...... اس حویلی سے اللہ نہ کرے، آپ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے، اس کے حاصل کرنے کا لالچ کسی کو بھی گمراہ کر سکتا ہے، مولوی صاحب بھی یہی بات کر رہے تھے...... میں جہاں بھی جاتی ہوں ملنے ملانے...... سب یہی پوچھتے ہیں، حویلی کا مالک کون ہے؟ وارث کون ہے؟ ہمارا معاشرہ ایک عورت کو پورا مالک، وارث مانتا ہے جی، میں تو کہتی ہوں...... آپ اسے بیچ دیں۔''

''اس کے بعد......''

''کوئی چھوٹا گھر لے لیں جیسے مولوی صاحب کہہ رہے تھے، ویسے حویلی نہ بھی بیچیں تو مدرسہ، اسکول بنایا جا سکتا ہے...... مگر باجی آپ اللہ لوک ہیں، آپ اس فساد میں نہ پڑیں...... آج کا دور سیدھا دور نہیں ہے۔''

''اور حویلی کے پیسوں کا کیا کروں......؟''

''حج کر آئیں...... مجھ غریبن کو بھی کرا دیجیے......''

''محرم کہاں سے لاؤں؟ جھوٹے محرم بنا کر جانا مجھے منظور نہیں ہے۔''

''غور کرنے والی بات ہے باجی...... آپ جیسی اللہ کے نام پر جوانی، زندگی عمر گزار دینے والی اللہ کے گھر اپنے آپ نہیں جا سکتی...... مرد گناہ گار بھی ہو تو جا سکتا ہے...... سو بار جا سکتا ہے، سارے ارمان پورے کر سکتا ہے...... یہ...... یہ کیوں ہوا باجی؟'' اس کے دماغ میں احکامات رب العزت کی گہرائیاں اتریں۔

''بہت گہری سوچ ہے تمہاری......'' صفہ نے ایک آہ سرد بھری۔

''پھر تو عورت اپنی عمر جوانی زندگی محرم کے ہی نام لگا دے پلو تو کسی کا تھامنا ہے ناں...... میرے ناقص دماغ میں اس کا یہی جواب بنتا ہے۔''

صفہ کی نظریں تو شبانہ کے چہرے پر تھیں روح و قلب کہیں دور نکل گئے تھے۔

''حج کیا ہے؟ محرم کیا ہے؟ روکا کب ہے؟ روکنا کیا ہے؟'' وہ چاند کی طرف منہ اٹھا کر تکنے لگی......

ایک ہی چاند چمکتا ہے ترے سدا آباد حرم کے اوپر، ہماری مٹتی بگڑتی بنتی بکی دنیا کے اوپر، وہی چاند جسے ترے حبیب نے انگشتِ مبارک سے شق کیا تھا...... ایک حصہ اِدھر...... ایک حصہ اُدھر...... کئی پل اسی طرح الگ رہ کر پھر آ کر جڑ گئے۔

کھجور کے تنے اور چھڑیوں والے حجروں اور مسجد کو اسی چاند کی چاندنی چومتی تھی۔ غار ثور میں دو یاروں کے رخِ روشن پر اس کی شعاعیں دھندلی روشنی کرتی تھیں۔ کربلا کی شب غریباں گیارھویں کا یہی چاند تھا۔ کتنی چشم دید چاند جانتا ہوگا...... میری اماں اسی چاند کے نیچے چلتی پھرتی تھیں...... عید کی خبر اسی چاند سے پوچھتی تھیں، ابا صاحب مردانے میں عید کا ''چاند مبارک'' وصول کرتے تھے۔ نشانات، یادیں، زیارتیں، ظاہری، وابستگیاں معدوم بھی ہو جائیں تو چاند تو وہی ہے ناں...... کسی تغیر و تبدل کے بغیر، ویسا ہی ہر دور کی سانسوں کو سمیٹے ہوئے...... پھر گزشتہ کو موجودہ، غائب کو حاضر، نامعلوم کو معلوم کر دینے والا مختار کل چاہے تو کعبہ خود چل کر سامنے آ جائے...... وہ چاہے تو حاجی کے حج کو نامقبول حج اور غیر حاجی کو گھر بیٹھے حاجی کے منصب پر فائز کر دے...... لپک، چمک، دمک، بھڑک، چراغ بجھ گیا۔ صفہ نے فضا میں پھونک ماری...... کوئی بدلی چاند کے سامنے آ گئی اور گول چمکتا چاند فلک کی چادر سے غائب ہو گیا۔ وہ ایک دم ہنس پڑی۔

شبانہ نے اسے حیرت سے دیکھا...... چند پل دیکھتی رہی مگر جلد ہی اس کی حیرت سمٹ گئی۔ وہ اٹھنے لگی۔

شبانہ، صفہ کی تمام عادات جانتی تھی، بیٹھے، بیٹھے کھو جانا، بات کرتے، کرتے خاموش ہو جانا، بلا سبب رونا، لہٰذا وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

ابھی حویلی کے بارے میں کوئی فیصلہ سامنے نہیں آ رہا تھا اور دن قطار باندھے گزر رہے تھے۔ اب موسم گرما مکمل طور پر شروع ہو گیا تھا۔ باغیچے کی گھاس پر خربوزوں کا ڈھیر لگا تھا، شام تک شبانہ یہ ڈھیر بچوں میں بانٹ کر ختم کر دیتی، اس وقت وہ جھاڑو لیے صحن کے پتے اکٹھے کر رہی تھی، صبح کے سات بجے تھے، دائیں جانب کے بغلی صحن کے آخری سرے پر پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھلا...... نخبہ آ رہی تھی، گوری رنگت، گلابی لپ اسٹک مگر آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں...... درمیانہ قد، جسم بھاری نہ تھا مگر اسمارٹ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گہرے براؤن بالوں کی پونی، سر سے ڈھلکی ہوئی چادر، بائیں کندھے پر کپڑوں کا ہم رنگ ہینڈ بیگ اور دائیں ہاتھ کی انگلی تھامے تین سالہ بچہ...... بچے نے سفید شرٹ اور نیکر پہن رکھی تھی، دبلا پتلا بچہ چلتا تھا تو بار، بار ماں کو دیکھتا جیسے چاہتا ہو کہ ماں اسے اٹھا لے۔

شبانہ جھاڑو پھینک کر تیز قدموں سے استقبال کو بڑھی، بچے کو دیکھ کر تو کھل اٹھی۔

''بسم اللہ...... بسم اللہ...... ننھا شہزادہ آیا ہے۔''

بچے کو اٹھانے لگی تو نخبہ نے کہا۔

''ہاں...... شبانہ یہ تھک رہا ہے اسے اٹھا لو، میری تو سانس پھول جاتی ہے۔''

بچہ بھی ایسا مٹی کا مادھو تھا، آرام سے شبانہ کی بانہوں میں آ رہا۔

''ہیلو بے بی، ہیلو بے بی...... باجی! یہ اردو سمجھتا ہے یا انگریزی بولتا ہے؟''

''سمجھتا ہے...... اردو کیوں نہیں سمجھے گا۔''

شبانہ کی گود سے اتر کر بچہ خربوزوں کے ڈھیر کی طرف چلنے لگا۔ اب وہ ایک چھوٹا خربوزہ گیند بنا کر کھیل رہا تھا، شبانہ اس کے ساتھ کھیلنے، بھاگنے، ہنسنے میں مگن ہو گئی...... نخبہ اندر چلی گئی۔

صفہ لاؤنج کے صوفے پر لیٹی تھی۔ لاؤنج میں قالین نہیں تھا۔ البتہ فرش نہایت صاف ستھرا ہوتا...... شبانہ روزانہ ٹاکی (پوچا) لگاتی تھی۔ نخبہ چادر اور دوپٹا اتار کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ صفہ کے منع کرنے کے باوجود اسے یہی بھلا لگا۔

''فارغ ہو ناں......؟ نیند تو نہیں آ رہی؟''

دونوں کا جواب نفی میں پا کر وہ مطمئن ہو گئی۔

''چھوٹے کو نہیں لائیں......؟''

''لائی ہوں، شبانہ کے پاس ہے، دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہیں۔'' وہ اسی طرح لاابالی پن سے بول دیتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں نخبہ اپنے اصل موضوع پر آ گئی۔

(باقی آئندہ)



ع عورت خ خواب

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے... مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

اس کے وجود میں کوئی بالن آنچ دینے لگا۔ برف سی رنگت والی لڑکی کے چہرے پہ کھلتی سفیدی میں ہلدی بکھر گئی تھی۔ اس کے کان کے بالے جیسی محبت کہیں گر گئی تھی۔ اور اس کے پاس ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ بلکہ نہیں، وہ گری کہاں تھی۔ وہ تو اس کی بہن کے قدموں تلے بری طرح کچلی گئی تھی۔

زیادہ لوگ سوئے پڑے تھے۔ جو جاگ رہے تھے وہ یا تو اسے لفٹ کرانے کے موڈ میں نہیں تھے یا پھر ان کے گھر کوئی چھوٹا بچہ ہی نہیں تھا۔

ایک ایک دروازہ دھڑ دھڑاتے تیسری منزل کے آخری قدمچے پہ اس کی سانس رکنے لگی۔ وجہ اونچائی نہیں بلکہ پورے فلور پہ چکراتی آملیٹ کی مہک تھی۔

ایک چائے کا کپ رات بھر کے خالی پیٹ کو کتنا سہارا دے سکتا تھا۔ یقیناً اتنا ہی جتنا ایک سہ منزلہ عمارت کو اکیلا ستون۔

سفید پنکھ پھیلائے ناچتے مور جیسا اجلا دن، فلیٹوں کی تنگ راہداری میں کہیں کھو سا گیا تھا۔

ابھی اور مزید جانے کتنے دروازے کھٹکھٹانے تھے۔

کاش ٹی وی کے اشتہاروں میں دکھائے جانے والے لوگ اصلی میں بھی ہوتے اور اسے ناشتے ہی کا پوچھ لیتے۔

اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے سوچا۔

آملیٹ کی خوشبو قریب آرہی تھی اور اپنی بے دھیانی پہ اس کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

گھر گھر میں معصوم بچوں کی زندگیاں بچانے کی تگ و دو کرتے، کرتے دن بیت گیا تھا۔ اس نے عصر کے بعد گھر میں قدم رکھا تو حبس بھرے دن کے بعد ایک ٹھنڈی شام گلیوں میں آوارہ بچوں کی طرح کلدکڑے لگا رہی تھی۔

بند دروازے کے پیچھے چار قدم کے صحن کی خاموشی، بڑی جانی پہچانی سی تھی۔ اس نے دروازہ بند کر کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سامنے دکھائی دینے والا برآمدہ دھول میں اٹا ہوا خاموش اس کی راہ تکتا تھا۔ اندر کے کمروں میں بھی سناٹا اور تاریکی تھی۔

اسے کھلی ہوا میں ہی گھٹن سی ہونے لگی۔ یہ تاریکی، خاموشی اور تنہائی ہمیشہ سے اس گھر کا نصیب نہیں تھی۔ بلکہ یہاں تو...... یہاں تو اک بہت ہی خوش خیال منظر سجا تھا۔

روز بلاناغہ......

اس کی اچھل کود اور بے فکری کی ہنسی کے جھرنوں کا



بیک گراؤنڈ میوزک...... امی کے ڈائیلاگ، عمرانہ کی بڑ بڑ اور سب سے بڑھ کر ابا کی جاندار انٹری کے ساتھ... پورے سین میں گویا جان سی پڑ جاتی تھی۔

وہ اسیر تھی اور رہا نہیں ہونا چاہتی تھی۔

وہ ایک منظر اس کا خواب تھا اور تعبیر مانگتا تھا۔

کچھ بھی کر کے کہیں سے بھی...... اس نے خود کو اسی ٹائم پیریڈ میں قید کر لیا تھا۔ اور اب باہر نہیں آنا چاہتی تھی۔

سہ پہر کا ڈھلتا ہوا سے جب، ابا کی آمد عنقریب متوقع ہوتی، عمرانہ بڑ بڑ کرتی جھاڑو اٹھاتی اور صحن میں پھیرنا شروع کر دیتی۔ امی اذان کے فوراً بعد نماز ادا کر کے نماز کا دوپٹا کھولتے ہوئے ہی باورچی خانے میں چلی جاتیں۔

ذرا دیر میں دھول کے ہلکے مرغولے بیٹھ جاتے اور دودھ کی سوندھی خوشبو اس کی جگہ لے کے گھر میں یہاں سے وہاں تک چکر کھا جاتی۔

وہ جھٹ پٹ سے پائپ لگا، پودوں کو پانی ڈال اپنی پسند کے کام سے فراغت پاتی۔ اپنی سفید رنگت کو رگڑ کے تھوڑا اور سفید کر لیتی۔ عمرانہ اس کے پاگل پن پہ...... بڑبڑاتی...... اسے پتا نہیں یہ بڑبڑانے کی عادت لگی کہاں سے تھی، کیوں اور کب...... لیکن...... خیر چھوڑو...... اس کے اپنے پاس کون سا وقت تھا، عمرانہ پہ توجہ دینے کا۔

بس......

ادھر اس نے نک سک سے درست ہو کے صحن میں قدم رکھا نہیں کہ دروازہ بجا نہیں......

''ابا...... آگئے......''

روز ایک نعرۂ مستانہ بلند ہوتا۔ وہ لپک کے دروازہ کھولتی اور جھکے ہارے ابا سے لپٹ جاتی......

امی چائے کے برتن میں ابلتے دودھ میں پتی جھونک کے چمچہ چلاتیں اور وہ ٹھنڈا پانی کا گلاس لے کے ابا کے سر پہ پہنچ جاتی......

ابا کو اس کی پھرتیوں پہ بڑی ہنسی آتی تھی۔ اور عمرانہ بلاوجہ چڑ سی جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ابا سے صرف ان ہی لفافوں کے لالچ میں لاڈ کرتی ہے جو آفس سے واپسی پر اکثر ان کے ہاتھوں میں ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھ اکثر ہی کسی من پسند چیز سے بھرے ہوتے...... کبھی سموسے، جلیبیاں، کبھی چھولوں کی چاٹ، باقر خانیاں...... کبھی کچھ تو کبھی کچھ......

لیکن یہ بات تو اس کا دل جانتا تھا یا پھر ابا...... کہ اولاد کے ماں باپ کے لیے پیار میں بھلا کسی لالچ کا کیا سوال...... کھوٹ کا کیسا جھول......!

''کیا ہوا...... ایسے کیوں کھڑی ہو اب تک؟''

امی کمرے سے باہر آ کے اسے تعجب سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابھی تک وہیں کیوں کھڑی تھی...... اس طرح گم صم سی...... حالانکہ گم صم تو وہ بہت پہلے ہی ہو گئی تھی، جب...... جب...... ابا نے ان کی دنیا سے منہ موڑا تھا۔

وہ بنا جواب دیے گہری سانس بھر کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ زندگی ایک کتاب ہے جس کے صفحے اپنا، اپنا وقت پورا کر کے پلٹتے رہتے ہیں۔ چاہے ہم دھیان سے پڑھ پائیں یا نہیں...... دنیا کی ہر کتاب کو آگے پیچھے کر کے اپنی مرضی سے پڑھا جا سکتا ہے...... لیکن اسے نہیں۔

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب خواب نے انگڑائی لی...... وہ، ان بیتے ہوئے صفحات کو دوبارہ سے پڑھنا چاہتی تھی......

☆☆☆

''عمرانہ آئی تھی۔''

امی نے دسترخوان میں لپٹی روٹی کے ساتھ آج کی تازہ خبر بھی لپیٹ کے اس کے نزدیک دھر دی۔

وہ چند لمحے بے حس رہی پھر اچانک ہی بھڑک گئی۔

''کیوں، کیوں آئی تھی؟ آپ نے اندر کیوں آنے دیا۔ دھکے دے کے نکالا کیوں نہیں اسے۔ سناتیں رکھ، رکھ کے۔'' دفعتاً اسے احساس ہوا۔ امی جواب میں بالکل چپ سی ہیں۔ آج نہ ان کے اندر وہ غصہ تھا اور نہ وہ طنطنہ۔

''اس کے پاس سننے کا ٹائم ہی کہاں ہوتا ہے وہ تو، بس اپنی سنانے آئی ہے۔'' ان کی آواز میں شکست بول رہی تھی۔

''کیا ہوا......؟ آپ کہیں اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی کو گلے لگانے کا تو نہیں سوچ رہیں۔''

''اگر ایسا ہے بھی ناں...... تو میں پہلے ہی بتا دوں۔ وہ ہم سے کبھی نہیں بچھڑی تھی...... لیکن اس کی وجہ سے مجھ سے میری دو پیاری ہستیاں ضرور بچھڑ گئیں۔''

اس کا گلا رندھ گیا۔ امی کا ہارا ہوا انداز اس پہ سب ظاہر کر رہا تھا۔ یہ ہار صرف ان کی نہیں، اس کی اپنی ہار تھی۔ جس نے بہن کی رخصتی کے وقت دل میں عہد کیا تھا کہ اب کبھی اپنی بہن سے نہ ملے گی نہ بات کرے گی۔

''میں بتا رہی ہوں آپ کو امی...... آپ کے نصیب میں دو بیٹیوں کی اکٹھی خوشیاں نہیں ہیں۔ اگر آپ نے اس پر اس گھر کے دروازے کھولے پھر تو میری شکل کو ترس جائیں گی آپ......''

وہ اور بپھر گئی......

''اچھا ناں...... تم کیوں اس قدر غصے میں آ گئیں...... کھانا کھاؤ مٹی ڈالو اس پہ......''

''نہیں کھانا۔''

وہ جس انداز میں بول کر اٹھی تھی...... صرف ہاتھ مار کے ٹرے پھینک دینا ہی باقی رہ گیا تھا......

☆☆☆

یہ کوئی بہت دن کی دوری پہ کھڑی بات نہیں تھی جب وہ اپنے مستقبل سے بہت مطمئن نظر آتی تھی۔

عمران اور شان، دو بہنوں، رمیز اور معیز دو بھائیوں کے نام، رشتوں کے خانے میں ہونے والی بیویوں کے نام سے درج تھیں۔

کچی عمر کا دیکھا خواب تھا۔ بلکہ دکھوایا گیا خواب۔

وہ کیوں نہ اپنے دل کو اس گاؤں کے کوس گننے پہ لگاتی جو پیہر جائی اس کا اگلا پڑاؤ بننے والا تھا بلکہ شاید آخری بھی۔

برملا ڈھکے چھپے انداز میں امی کے سامنے اور کھلم کھلا عمرانہ کے سامنے اس نے اقرار کیا تھا کہ وہ خود کو...... رمیز کی ہونے والی کے روپ میں دیکھتی ہے۔ وہ اس روپ سے خوش بھی ہے اور واری صدقے بھی جاتی ہے۔ جس روز اس پہ روپ چڑھے، اس دن کا انتظار بھی کرتی ہے اور حاسدوں کی نظر سے بچنے کی دعا بھی......

پر اسے کسی حاسد کی نظر کیا لگتی، اسے تو خود اس کی اپنی ماں جائی کی نظر نے کھا لیا جو کسی اور سے جا لڑی تھی۔

اسے وہ گھر، گھر کر آتے بادلوں میں خود کا مست پتنگ کی طرح جھومنا، ڈولنا یاد تھا بلکہ یہ کیا اسے تو ان کپڑوں کا رنگ تک یاد تھا جو اس نے اس دن پہنے ہوئے تھے۔

چھت پر بوندا باندی کا تسلسل تھا اور اس کے لبوں پر کسی شوخ دھن کا...... تبھی اس کی بل کھاتی کمر پر بھیگے کاغذ میں لپٹا ایک پتھر آن لگا۔ اس نے گول، گول چکر کھاتے وہیں رک کے دیکھا۔ پتھر کو اٹھا کے رقعہ کھولا۔

اس میں درج تحریر بلاشبہ عمرانہ کے نام تھی کیونکہ اسی کو مخاطب کر کے لکھی گئی تھی۔

پر اس انجان تحریر کے کاتب نے اس کے حوالے کیوں کی؟ وہ چھوٹا سا پتھر ایٹم بم کی طرح پھٹ کے اس کے حواسوں کے پرخچے اڑانے کے لیے کافی تھی۔

پر اعصاب تو پکی چیز تھے ناں...... اس کے پیچھے اپنی دھجیاں بکھرنے کا منظر اور بھی بہت کچھ قطار میں کھڑا تھا۔

عزت......

نیک نامی......

بھرم......

اعتبار اور بھروسا یعنی...... کریڈیبلٹی......

وہ کاغذ ہاتھ میں دبوچے پتھر کے بت کے مانند ساکت تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ اس بم کے گولے کو پھینکنے والی توپ کی طرف رخ کر لیتی۔

ہلکی بوندا باندی نے تیز بوچھاڑ کا پیراہن کب بدلا اسے پتا ہی نہیں چلا۔

جب عمرانہ ہانپتی ہوئی چھت تک آئی، وہ بے حس و حرکت کھڑی برسات میں...... شرابور ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا ایسے کیوں کھڑی ہو؟''

اس نے ماتھے پہ لکیریں کھینچ کر اسے ٹوکا۔

جواب میں اس نے تر مٹھی کھول کے اس کے سامنے کر دی۔

اس کے پاس سوال تھا۔ عمرانہ کو جواب کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جمی ہوئی تھیں۔ ایک میں حیرانی اور دوسرے میں ڈھٹائی۔

"میں امی کو بتاتی ہوں۔"

وہ جھٹکے سے اٹھی۔

"بتادو......" اجازت ملتے ہی ڈھے گئی۔

اب حیرانی کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔

"کیا مطلب ہے اس سب بات کا؟"

"جو سمجھ میں آرہا ہے تمہاری، وہی مطلب ہے۔"

عمرانہ اب ریلیکس ہوگئی تھی۔ جیسے دنوں کے خوف کے بعد بلی کو تھیلے سے باہر آتا دیکھنے کے بعد اطمینان ہوا کہ چلو ایک نہ ایک دن تو یہ وقت آنا ہی تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ تھیلے کا منہ اسے خود نہیں کھولنا پڑا۔

"چھ مہینے شادی میں رہ گئے ہیں اور اب......؟"

اسے لگا وہ کسی کور ٹارنا یا سوال سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"چھ دن بھی رہ جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا مجھے۔"

"تمہیں نہیں پڑتا لیکن مجھے پڑتا ہے۔" اس نے جلبلا کر بہ مشکل خود کو چیخنے سے روکا۔

"امی، ابا سب کو فرق پڑتا ہے...... کیا تم ننھی بچی ہو جو سمجھ نہیں پا رہیں؟"

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کوئی جنتر منتر پھونک کر اسے پلائے اور اس کا دل بدل جائے۔

"زندگی میری ہے۔ اپنی مرضی اور پسند سے گزارنا میرا حق ہے......"

شبانہ اسے ایسے گھور رہی تھی جیسے کچا چبا جائے گی۔ اس کے دانت آپس میں رگڑ کھانے لگے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ ابھی کے ابھی گلا دبا کے اپنا مستقبل اور ماں باپ کی عزت کو محفوظ کرلے۔

"شاباش...... یہی سکھایا ہے اس دو نمبر کی عاشقی اور رقعے بازی نے تجھے......"

اس کے لہجے کی کاٹ برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو عمرانہ اس پہ جھپٹ پڑتی لیکن اس وقت ضبط کے جس عظیم مظاہرے کی ضرورت تھی، اس کا سبق وہ بہت پہلے ہی پڑھ چکی تھی یا شاید پڑھوا دیا گیا تھا۔ پتا نہیں کب سے یہ مکتب کھلا تھا۔ کتنی کلاسز اور کون، کون سے چیپٹر پڑھائے جا چکے تھے۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب تو نتیجہ نکلنے ہی والا تھا۔

اس نے نفرت آمیزی سے بھیگا، مسلا کاغذ کا ٹکڑا عمرانہ کے منہ پہ اچھال دیا۔ دل میں بڑی زور کی خواہش نکلی کہ کاش وہ اس ٹکڑے کو پتھر سمیت نیچے لے آئی ہوتی تو اس کا سر پھاڑ دیتی۔

عمرانہ نے بڑے اطمینان سے رقعہ کھولا۔ مٹی مٹی، بری لکھائی کو توجہ اور ارتکاز سے پڑھا پھر مسکرادی۔

یہیں سے الٹی گنتی کی شروعات ہوئی تھی۔

☆☆☆

بجائے اس کے کہ عمرانہ روتی، وہ رونے لگی۔ بجائے اس کے عمرانہ ڈرتی، وہ ڈرنے لگی۔ بجائے اس کے کہ عمرانہ بات چھپاتی، وہ خود چھپنے لگی۔ بجائے اس کے کہ عمرانہ گڑگڑاتی، وہ ترلوں پہ اتر آئی۔

"خدا کا واسطہ ہے عمرانہ باز آجاؤ۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے اپنا نہیں میرا تو سوچو...... تم تو شادی کرکے چلی جاؤ گی مگر میں......"

یہاں تک پہنچ کر بات ادھوری رہ جاتی۔

"میں امی اور ابا کو سب بتادوں گی۔" یہ دھمکی کتنی بے اثر تھی اس کا اندازہ کرنے کے بعد بھی لے دے کے یہی باقی رہ جاتی جس کا عمرانہ پہ چنداں اثر نہ ہوتا تھا۔

یہ جاننے کے باوجود کہ کوشش بیکار ہے وہ بارہ بار غلیل سے سانپ مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ نشانہ نہ بھی چوکتا تو بھلا کنکر نے سانپ کا کیا بگاڑ لینا تھا۔

☆☆☆

نصیب کے رستے بڑے اوکھے ہوتے ہیں۔ اچھے سے اچھا مشاق ڈرائیور بھی سمجھ نہیں پاتا کہ جس کنویں کو پھلانگ کر وہ اپنے تئیں بڑا خوش تھا اس کے آگے بھی ایک گھاٹی ہے۔ کبھی ایسا اسپیڈ بریکر آتا ہے کہ پوری گاڑی ہی پلٹ جاتی ہے۔ راستے نہیں رکتے بندہ الٹے پاؤں چلنے لگتا ہے۔

یہ الٹے پاؤں چلنا، الٹی گنتی جیسا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ صفر سے آگے گنتی شروع، جتنا بڑا ہندسہ اتنا ہی چھوٹا حجم۔

اس کا بھی دم گھٹنے لگا۔ وہ بھی الٹی گنتی پہ لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ آج عمرانہ کی آنکھوں کی بغاوت اس نے دیکھ بھی لی تھی اور لہجے کی ڈھٹائی سونگھ بھی لی تھی۔ انتظار تھا تو اس بات کا کہ یہ بُو ماں باپ تک کب پہنچتی ہے۔

ہر آنے والا دن اسے لیے خوف کا ایک قدمچہ اوپر چڑھ لیتا۔ وہ اتنی سی چڑھائی میں ہانپ جاتی۔ امی اور ابا کے لیے آنے والے وقت نے اس سے ساری چستی، شوخی چھین لی تھی۔ جس کے دل میں چور تھا، وہ دھڑلے سے سیڑھیاں چڑھ جاتی اور جس نے چور کا بھید پایا تھا وہ خود چور بنی چھپتی پھر رہی تھی۔ اسے اس قیامت کی تپش سے اپنا آپ سلگتا محسوس ہونے لگا تھا جو ابھی آئی نہیں تھی لیکن اسے آنا تو تھا اور ہر قیامت اپنے ہی ڈھب سے وقوع پزیر ہوتی۔ لیکن کیا ایسے......؟ اس طرح......؟ ایسی بے ڈھنگی......؟

☆☆☆

اندر کمرے سے اس کی متوقع ساس کے غرانے کی آوازیں باہر صحن تک آرہی تھیں۔

وہ گلاب کی ادھ کھلی کلی مٹھی میں دبوچے کانپ رہی تھی۔ مسلی ہوئی پتیوں کے درمیان ہی وہ سنہری چھلا دبکا پڑا تھا جو رمیز کے حوالے سے اس کے پاس اکلوتی نشانی کی صورت محفوظ تھا۔

"آرام اور بے آرام سے کیا...... بات کرنے کو کچھ باقی رہ گیا ہے...... بس بھئی، مجھے نہ کچھ کہنا ہے نہ سننا ہے۔ میں جو دیکھ آئی ہوں وہی کافی ہے۔ آپ ہمارا سامان واپس کریں۔ بات ختم......"

اس کے نم ہاتھ سے چھلا چھوٹ کے فرش پہ گر گیا۔

کمرے سے رمیز باہر نکلا۔ قدم بہ قدم مردہ چال سے اس کے نزدیک آیا۔ ایک نظر اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر سر جھکا لیا۔ یقیناً اس کے دل میں عمرانہ کی بہن کے حوالے سے بھی کچھ تحفظات نے جنم لے لیا تھا۔ وہ کیسے صفائی پیش کرتی...... کیا کہتی...... میں "اس" جیسی نہیں ہوں۔ میری ماں بھی ایسی نہیں تھی۔ اس کی تربیت بھی پر......"

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

لہو رنگ آنکھ سے نمک میں ڈوبا ایک قطرہ گر کر کچے فرش پہ عین اس جگہ نشان چھوڑ گیا جہاں اس کا مستقبل ابھی ابھی ہاتھ سے چھوٹا تھا۔

رمیز نے بنا کچھ کہے جھک کر اسے اٹھایا، جیب میں ڈالا اور گہری سانس بھر کے باہر چلا گیا۔ یہ دیکھے بنا کہ کسی کا وجود اس سے جڑے خواب کے ٹوٹنے سے کس طرح کٹ رہا ہے۔

تنفس بڑھنے لگا اور گھٹن بھی...... اس نے زور سے سانس لینی چاہی پر نا کام رہی۔ بہ مشکل قدموں کو گھسیٹ کر لاتے اور عمرانہ کے مشترکہ کمرے تک آئی۔

پیچھے تن فن کرتی جہاں آرا صحن پار کر رہی تھیں۔ آج کوئی انہیں رخصت کرنے دروازے تک نہیں آیا تھا۔

اندر کمرے میں عمرانہ اپنے لمبے خوب صورت ناخن گھس رہی تھی۔

اس کی زندگی بگاڑ کر وہ اپنے ناخنوں کو شیپ دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک کھل گئیں۔ تبھی امی کی گھبرائی ہوئی آواز نے اس کا دل چیر دیا......

"شبانہ...... شمی...... تمہارے ابا......"

جس سے قدم اٹھانا مشکل تھا وہ بدحواس ہو کر دوڑی۔

☆☆☆

ابا کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔

انہوں نے تو عمرانہ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ انہیں جہاں آرا کے لہجے کا تیقن مار گیا۔

آنگن، جس میں گلاب مہکا کرتے تھے۔ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بدل گیا۔ دن بھر مٹی سسکتی یہاں سے وہاں چک پھیریاں کھاتی رہتی۔ امی کی آنکھیں ویران اور ہونٹ پپڑی زدہ ہو گئے۔ اس نے اپنے دل کو پتھر کر لیا۔ ایک بار بھی رمیز کے لوٹ آنے کی آس اس کے دل میں نہ جاگی۔ یہ کون سی محبت کی منگنی تھی، شادی تھی۔ رسم کے بعد جو کچا پکا تعلق تھا شبانہ نے اسے دل ہی دل میں فولادی

قبل دے دی تھی۔ زبان کے رشتوں کی تابعداری تو نبھا
روتی یہاں تو خون کے رشتوں نے حدیں پار کرلی تھیں۔

خون خوار نظروں سے وہ عمرانہ کو گھورتی رہتی۔ جس کے دل میں تھوڑا بہت ملال تھا بھی تو گزرتے وقت نے اسے اللہ جانے ڈھک دیا یا مٹا ہی ڈالا تھا۔

اس نے بھی ضبط کی انتہا کردی۔

ایک دن جب، عمرانہ کو دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو امی کے پاس آکے بولی۔

"عمرانہ کی شادی کرکے اسے اس گھر سے چلتا کریں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور چاند چڑھائے۔"

کہنا تو اور بھی بہت کچھ چاہتی تھی......

"میرے خواب آنکھوں سے نوچ لیے۔ آپ کا سہاگ بھی اسی کی وجہ سے اجڑ گیا۔ سر سے عزت کی چادر گئی۔ اب جو چند ایک دھجیاں بچی ہیں، برہنہ ہونے سے پہلے ہی ان کا کوئی بندوبست کردیں۔"

☆☆☆

جس روز عمرانہ نے اس گھر سے اپنا نصیب سمیٹا، اس دن اس نے امی کو سختی سے باور کرادیا تھا کہ اب گھر میں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی جائے گی۔

وہ اپنے عہد پہ قائم تھی۔

امی نے بھی چپ سادھ لی۔ اسے ایک معمولی ہیلتھ ورکر کی جاب مل گئی۔ زندگی کی گاڑی چل سو چل...... دو سال گزر گئے۔

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے عمرانہ کی آمد نے وقت بے وقت اس کی زندگی میں دھچکے لگانا شروع کردیے تھے۔

وہ ہر بار چیختی چلاتی۔ امی کان لپیٹ لیتیں لیکن اس سے چھپاتی بھی نہیں تھیں۔ عمرانہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔ امی سے معافی بھی مانگ چکی تھی۔ انہوں نے معاف کیا تھا یا نہیں اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ابا اور اپنے خوابوں کی موت کا ذمے دار اسے سمجھتی تھی اور کسی صورت رعایت دینے کو تیار نہ تھی۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ کسی کو معاف نہ کرنے کا اعلان کرکے ہم نے اپنے تئیں بڑا تیر مار لیا۔ زندگی بھر کے لیے اسے اس کی ... جیسے ...
اصل میں ہم خود جلتے رہتے ہیں۔ ہمیں خود ہی قرار نہیں ملتا۔ اور ہم اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے انا کے چھینٹے بے کل دل پر مارتے رہتے ہیں۔

رشتے...... اور وہ بھی خون کے...... خراج مانگتے ہیں۔ معافی نہیں۔ انہیں قربانی چاہیے ہوتی ہے۔ خالی خولی اظہار نہیں۔

خود سے لڑتے لڑتے جب وہ ٹوٹ جانے کی حد تک نڈھال ہوچکی تھی۔ تب ایک دن عمرانہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے آپ سے کیا وہ وعدہ توڑ کر کہ جیتے جی کبھی اس سے بات نہیں کرے گی۔

☆☆☆

عمرانہ امی کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ امی ایسے ہاتھ ملتی تھیں جیسے ابا کی موت سے بھی بڑا کوئی نقصان کر بیٹھی ہوں۔

"میں نے کہا تھا ناں۔ تم اس گھر میں آئندہ قدم نہیں رکھوگی۔"

وہ آندھی طوفان کی طرح آئی۔ عمرانہ نے سر اٹھایا اور اس آندھی طوفان کی جگہ کسی سنگی بت نے لے لی۔

یہ...... یہ وہ عمرانہ تو نہیں تھی جسے اس نے اپنی پیدائش سے لے کے چند سال پہلے تک دیکھا تھا۔

یہ تو کوئی اور ہی عورت تھی۔

اس سے پہچانا نہیں گیا۔

گہرے گڑھوں میں دھنسی آنکھوں میں جھانکنے کے لیے اپنی پتلیاں سکیڑنی پڑ رہی تھیں۔ ہونٹوں کی پپڑیوں کی چبھن حلق خشک کررہی تھی اور رنگت کی سیاہی سے ہر طرف اندھیرا سا پھیل رہا تھا۔

اس کی بھری ہوئی آنکھیں، دل کو پانی کرسکتی تھیں۔

لمحے بھر کے لیے وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

من کی مراد پالینے والے بھلا ایسے ہوتے ہیں۔ ایسے تو وہ لوگ دکھتے ہیں جن سے زندگی نے من مانی کرنے کا جی بھر کے خراج وصولا ہو۔ جو سب پاکے بھی خمیازہ بھگت رہے ہوں۔

معاف کردے۔

اس نے اٹھ کے شبانہ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

"مجھے چین کی زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے تو معافی چاہیے تاکہ سکون سے مرسکوں۔"

تنفس کے شدید زیروبم سے اس کا سینہ اٹھنے بیٹھنے لگا۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ لبوں پہ کپکپی چڑھ گئی۔

امی بھی منہ پہ دوپٹا ڈالے پھپک رہی تھیں۔

وہ بے دم سی ہوکر مسہری پہ گرگئی۔

☆☆☆

کل تک جو کہتی تھی کہ میرے سامنے اس کا نام مت لیا کریں۔ آج وہی اس کا سایہ بن گئی۔

عمرانہ کے ٹیسٹ، رپورٹس، خوراک، دوائیں......

جامد ہوئی پڑی زندگی ایک دل دہلا دینے والی گڑگڑاہٹ کے ساتھ چل پڑی تھی۔

شبانہ کی بڑی خواہش تھی کہ عمرانہ کا پچھتاوا دیکھنے کی۔ اب جو دیکھنے کو ملا تو اس کے اندر اس منظر کی سکت باقی رہی نہ شکایت۔

عمرانہ کو لگتا تھا اس نے سب کے دل توڑ کر من چاہی زندگی حاصل کرلی۔ اب اس کا خراج دینا پڑے گا اور وہ دے رہی تھی۔ روز بروز اپنے ریت ہوتے جسم اور بجھتی ہوئی امید کے ساتھ جب وہ ننھی اقرا کو گلے لگا کر روتی تو دل چرنے لگتا تھا۔

اس کا ضبط تمام ہونے کو تھا۔ تسلیاں، دلاسے سب جھوٹ تھے۔ کھوکھلے درخت کے تنے میں لڑھکنے والے پتوں کی سرسراہٹ کی طرح۔ جس میں جھانک کے دیکھو تو پتا چلتا ہے کہ یہ پتے نہیں، کسی سانپ کی حرکت کی آہٹ ہے۔

ایسی تو اس کی نیند جب نہیں روٹھی تھی، جب میٹرک کے بعد ابا اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے گئے تھے۔ اتنی تکلیف اسے تب نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہورہی تھی۔ سچ ہی کہا ہے جس نے بھی کہا ہے کہ بے خبری بہت بڑی نعمت ہے۔

بڑی بے ضرر رہی تھی۔ ابا اچانک گئے تو ایک پہاڑ ٹوٹا تھا۔

لیکن اس کے ٹوٹنے سے پہلے کتنا اطمینان تھا کم از کم...... ابا کی طرف سے...... اور زندگی جامد سہی لیکن اس وقت تک اتنی کربناک نہیں تھی، جب تک یہ پتا نہ تھا کہ عمرانہ کو آخری درجے کا کینسر ہوگیا ہے۔

☆☆☆

زندگی پانی کا بلبلہ نہیں، وہ تو پھر کچھ لمحے ٹھہر جاتا ہوگا۔ زندگی تو پلک جھپکنے کا نام ہے۔ ابھی دن کا منظر جم نہیں پاتا کہ رات پڑاؤ ڈال لیتی ہے۔

عمرانہ کو جانا تھا وہ ہزار کوششوں کے بعد بھی نہ رک سکی لیکن اس تمام عرصے میں اس کے خیالات مکمل طور پہ پلٹ گئے۔

"اچھا ہی ہوگیا تھا ایک طرح سے، جو اس بیچاری نے من چاہے شخص کا ساتھ پالیا۔ پہلے معلوم ہوتا کہ وہ یوں بھری جوانی میں دامن چھڑالے گی تو خود ہی اس کی بات مان لیتے سب۔"

اس کی آنکھوں میں ایک سیلن سی آکر بیٹھ گئی تھی۔ جو کسی طور خشک نہ ہوتی تھی۔ وقت اور حالات کے سامری جادوگر نے اسے سرتاپیر بدل ڈالا تھا۔

جہاں اتنا کچھ بدلا وہیں ایک بہت بڑی تبدیلی اپنے بہنوئی کے حوالے سے بھی آچکی تھی۔ نہ صرف دل، دماغ میں بلکہ اس کے رویے میں بھی۔

صبح آفس جاتے ہوئے حارث اقرا کو امی کے حوالے کرجاتا۔ شام تک وہ لوٹتی تو اس کے بعد رات کے کھانے تک کا سارا وقت اقرا کے لیے وقف کر چھوڑا تھا۔

اب جبکہ حارث کے دن رات ان کے ساتھ گزر رہے تو اس نے جانا کہ وہ بندہ برا نہیں تھا۔ بس اس سے ایک غلطی ہوگئی کہ اس نے سیدھی راہ کے بجائے غلط راستے کو اپنایا اور پھر اسی پہ چل کے عمرانہ کو......

اس میں بھی وہ پوری طرح قصوروار نہ تھا۔

جہاں آرا کے عمرانہ اور حارث کو ساتھ، ساتھ دیکھ لینے کے بعد حالات بس میں رہے بھی کب تھے۔ شادی

بہانہ نہیں تھا کہ سالی اور بہنوئی والی بے تکلفی پیدا ہوتی۔ لیکن اس جھجک کے باوجود اس نے بحیثیت ایک مرد کے حارث کو جس طرح عمرانہ کے علاج کے لیے خوار ہوتا دیکھا تھا۔ جس طرح اس کی محبت میں گھلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اس کے جانے کے بعد اس کی اقرا کے لیے جو اس کا رویہ تھا وہ کہہ سکتی تھی کہ وہ بندہ غلط نہیں تھا۔ اس کی بہن کا انتخاب غلط نہیں تھا۔

☆☆☆

روز شام میں واپسی پر وہ امی کو اقرا کے پیچھے ہلکان ہوتے دیکھتی۔ ان کی عمر نہیں تھی کہ اب وہ کسی چھوٹے بچے کو ماں کی طرح پروان چڑھا سکیں۔ بھلے وہ بچہ ان کی اپنی مرحومہ بیٹی کا ہی کیوں نہ ہوتا۔

ایسے ہی ایک ہفتہ واری تعطیل کے دن امی بخار میں پھنک رہی تھیں جب حارث' اقرا کو گھر میں لے کر داخل ہوا۔ اس کی اپنی حالت بھی امی سے مختلف نہ تھی۔ دونوں کو سنبھالنے کے چکر میں وہ خود گھن چکر بن گئی تھی۔

وہ ایک دن گویا اس کی پوری زندگی کے تمام دنوں کا نچوڑ تھا۔ اور اس نے اس دن بہت کچھ سیکھا تھا۔

دو بیماروں کی ایک ساتھ تیمار داری جبکہ دونوں بچے ہی تھے۔ اقرا اپنی کم سنی کی وجہ سے اور امی اپنے بڑھاپے کی وجہ سے......

بیماری میں جیون ساتھی کی کمی جسم کے ساتھ ساتھ انسان کے دل کو بھی بیمار کر دیتی ہے۔ جیسے امی کے لیے ابا کی کمی جیسے حارث کے لیے عمرانہ کی کمی......

اس دن کا سورج چڑھنے سے لے کر اترنے تک وہ اتنا بدل گئی گویا ابھی ابھی جنی گئی ہو۔ یا آج ہی کوئی بُدھی بھائی دے گئی ہو۔

اسی لیے جو بات کسی نے اب تک سوچی نہ تھی یا سوچی تھی تو لبوں تک نہ آنے پائی تھی۔ وہ کس سہولت سے کہہ بیٹھی کہ خود بھی حیران رہ گئی۔

''امی!...... حارث سے کہیں کہ مجھے اپنا لے۔''

☆☆☆

وہی آنگن تھا وہی شام...... برف کی رنگت والی لڑکی کو گلاب چھو گیا تھا۔

اس نے کچن میں آ کر چولھے پہ دودھ چڑھایا۔

''ارے شمی...... میں بنا لیتی ناں۔ تم کیوں آ گئیں۔'' پیچھے، پیچھے ہی امی تھیں۔

''ناکارہ کر کے چھوڑو گی مجھے۔''

''امی...... میں کون سا روز، روز آتی ہوں۔ جب تک میں ہوں مجھے کر لینے دیا کریں کام۔ مجھے خوشی ملتی ہے۔''

امی چپ سی ہو گئیں۔

''تمہارے منہ سے لفظ خوشی سن کے بڑا ہی عجیب سا محسوس کرتی ہوں میں اب بھی......''

وہ غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ اسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ خواب، خواہش اور خوشی میں فرق کیا تھا لیکن اسے پتا تھا کہ اگر اس نے حارث سے اقرا کی وجہ سے شادی نہیں کی تھی تو پھر اس کی کوئی دوسری وجہ کیا ہو سکتی تھی۔

کائنات ایک زنبیلِ رموز ہے۔ آپ جتنا اسے جھاڑیں یہ پہلے سے زیادہ بھاری ہو گی اور پہلے سے کہیں زیادہ وزن دار، کھنک دار...... اور زندگی اس کی وہ سب سے آسان گتھی ہے جسے سلجھاتے انسان ہانپ جاتا ہے۔ دو لخت ہو جاتا ہے......

''رمیز سے شادی میری خواہش تھی۔ جس کی سنگت میں ایک آباد، کھلکھلاتے گھر کی مہک سے بھری نارنجی شام میرا خواب تھی۔ حارث سے شادی میری خواہش نہیں تھی۔ ایک مجبوری تھی۔ میں نے خواہش کو چھوڑ کے خواب پورا کر لیا تھا۔''

حارث آ چکا تھا۔ اقرا کھلکھلاتی ہوئی اس سے لپٹ گئی تھی۔ امی اس کی بات سن نہیں سکی تھیں۔ سن بھی لیتیں تو شاید سمجھ نہ پاتیں......

اس نے ایک گہری پُرسکون سانس لے کے ابلتے دودھ میں پتی ڈال دی......

فضا میں دودھ پتی کی مہک پھیل رہی تھی۔

▼▼



ماں نی میں کنوں آکھاں

عطیہ ہدایت اللہ

ابا کا انتقال ہوا تو میں دو سال کی اور آپی نازیہ پانچ سال کی تھیں۔ چھوٹا بھائی، ابا کے گزر جانے کے بعد پیدا ہوا۔ امی جان پر کل چھبیس سال کی عمر میں بیوگی کا اتنا بھاری پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ وہ تو ہکا بکا رہ گئیں۔ تین چھوٹے، چھوٹے بچے، ذمے داریوں کا اتنا زیادہ بوجھ، اب کریں تو کیا کریں۔ ایسے میں نانی، خالاؤں اور ماموں نے بڑھ کر سہارا دیا۔ ہم نانا جان کی حویلی میں آ گئے، سب ہی ہمیں یتیم سمجھ کر اچھا سلوک کرتے۔

ہمیں ہاتھ لگایا یا اونچی آواز میں بولا اور وہ زار و قطار رونا شروع کر دیتیں۔

''ان بد نصیبوں کا باپ زندہ ہوتا تو یوں نہ انہیں کسی کی باتیں سننی پڑتیں۔''

''ثریا بی نوزائیدہ بلی کے بچوں کی طرح اپنے بچوں کو منہ میں لٹکائے پھرتی ہو، ذرا کسی نے حرکت کی اور تو فوراً اس کی جان لینے پر تل جاتی ہے۔ انہیں اتنا لاڈ لا رکھے گی تو کل کو اچھے، برے کی تمیز کیسے کریں گے۔'' نانی اکثر جھنجلا جاتیں۔

''نازیہ تو ابا کی آنکھ کا تارا تھی بس منہ سے بات نکلی اور وہ الٰہ دین کے جن کی طرح وہ چیز فوراً حاضر کرتے...... کہتے تھے'' نازیہ کو میں ڈاکٹر بناؤں گا اور جس دن وہ ڈاکٹر بنے گی ڈھیروں ڈھیر مٹھائی تقسیم کروں گا۔'' امی کہتیں لیکن یہ خوشی دیکھنے سے پہلے ہی خون کی بڑی سی الٹی نے ابا کو تیس سال کی عمر میں ختم کر دیا۔

آپی کے لاڈ اٹھانے والا نہ رہا تو وہ زود رنج اور ضدی ہو گئیں۔ ذرا سی طبیعت کے غیر موافق بات ہوتی تو زمین پر لوٹیں لگاتیں، ہاتھ پیر چھوڑ دیتیں، ہونٹ نیلے پڑ جاتے، امی جان ڈر کے مارے آنکھیں میچ کر کانوں میں انگلیاں دے کر دیوانہ وار چیخنے لگتیں۔

''ہائے گئی...... میری نازیہ گئی......''

مجھے یاد ہے وہ کالج اور میں اسکول میں تھی۔ جب انہوں نے امی جان سے کسی کالج تقریب کے لیے نئے ریشمی سوٹ اور سینڈل کی فرمائش کر دی۔

''بیٹی نازیہ! ہمارا ہاتھ کچھ تنگ ہو رہا ہے۔ گنے کے ٹرک ابھی شوگر مل میں پھنسے ہوئے ہیں، تمہارے ماموں نے بھی ابھی رقم نہیں بھیجی...... ہاتھ میں پیسے آئیں تو فوراً سوٹ لے دیں گے۔'' یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ آپی دھواں دار روئیں، دانت بھینچ کر دورہ ڈال لیا۔ تھوڑا سنبھلیں تو اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔ وہاں کے نئے ریشمی پردے قینچی سے کاٹ دیے پھر امی اور نانی کے کمروں میں گھسیں اور ان کے پلنگوں پر بچھی

چادروں کو چارے کی طرح کاٹ ڈالا۔ ڈر کے مارے انہیں کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ نیا جوڑا شام سے پہلے، پہلے آ گیا اور خالہ نے کاٹ کر سی بھی لیا۔

بند مٹھی میں سے ریت کی طرح وقت پھسلتا رہا، تین بچوں کی انگلیاں پکڑے، زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلتے، چلتے امی کے کالے سیاہ بالوں میں تیزی کے ساتھ چاندی کے تار جھلملانے لگے۔ آپی کی نوخیز جوانی نے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دیں۔ وہ بالکل امی کی جوانی کی تصویر تھیں۔ سرو قد، گورا چٹا رنگ...... بڑی، بڑی شربتی آنکھیں، بالوں کی بھاری چٹیا گھٹنوں تک پہنچ گئی تھی۔ اوپر سے غرور حسن اور طنطنہ جو دیکھتا، بس دیکھتا رہ جاتا، امی اور نانی اماں، نہ جانے کتنی بار ان پر آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر پھونکتیں...... ذرا آپی کو چھینک آئی اور نانی چیخ پڑتیں۔

''ہزار بار منع کرتی ہوں، بالوں میں تیل لگا کر کس کر چٹیا بنا، پر تو، تو انہیں ایک آدھ بل دے کر نیلے پیلے ربنوں، کلپوں سے باندھ دیتی ہے ناں...... اس سے نظر لگ جاتی ہے۔'' پھر وہ فوراً ایک کونے کے سبز پتے، مرچیں ان پر سے وارنے لگتیں، ان کے سامنے میری اور بھیا کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ذرا سی حکم عدولی پر ہمیں روئی کی طرح دھنک دیتیں، قسمت کی ایسی دھنی کہ پڑھائی میں بھی از حد تیز اور اسکالرشپ ہولڈر رہیں، میٹرک کے بعد ہی چچا نے اپنے بیٹے کے لیے انہیں مانگنا چاہا۔

''مجھے نہیں رہنا اس بیک ورڈ گاؤں میں، خبردار جو کسی نے میرا رشتہ دیا ہو تو۔'' امی جان اپنے دیور کو انکار نہ کر سکیں، بس پڑھائی کا کہہ کر ٹال دیا۔

''شیریں، جب میں کالج بس کے انتظار میں صبح گلی کے نکڑ پر کھڑی ہوتی ہوں تو ایک اسمارٹ سا لڑکا سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے بظاہر اخبار پڑھتا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ اخبار کی اوٹ میں سے وہ مجھے ہی تاڑتا رہتا ہے، دیکھ یہ بات کسی سے نہ کہنا، مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔'' آپی نے پہلی بار مجھے بہن یا سہیلی سمجھ کر دل کی بات کر ڈالی۔

''آپی آپ بہت احتیاط کریں، آپ اسے بالکل نظر انداز کر دیں۔ ویسے آپی آپ کی بڑی، بڑی آنکھیں برقع کی پتلی نقاب سے جھلکتی رہتی ہیں، اس دن میں جو آپ کے ساتھ بازار گئی ناں تو کچھ لوفر سے لڑکے کھڑے تھے آپ کو غور سے دیکھ کر بولے۔ ''یار یہ رانی اور فردوس تمہاری کیا لگتی ہیں، انہی کی طرح قاتل آنکھیں ہیں تمہاری......'' آپ بڑی نقاب کے نیچے چھوٹی نقاب بھی گرا دیا کریں۔'' آپی نے اہمیت جو دی تھی سو میں بڑی بی بن کر انہیں مشورہ دینے لگی، چند ہی دنوں بعد بڑے سے آنگن میں چھڑکاؤ کرتے ہوئے وہ میرے قریب آ گئیں۔

''شیریں پتا ہے آج کیا ہوا؟ صبح میری کالج بس چھوٹ گئی۔ مجھے آتا دیکھ کر اس لڑکے نے اپنی بائیک دوڑائی اور بس کو ریورس میں اسٹاپ پر لے آیا۔ پھر میرے نزدیک آ کر مجھے بس میں چڑھنے کے لیے کہا۔''

''ک...... کیا بولا آپی؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کہنے لگا، دیر نہ کیا کریں، مجھے آج آپ کا بہت انتظار کرنا پڑا۔'' آپی کے چہرے پر عجیب سی روشنی لو دینے لگی تھی۔ اور میں پوری جان سے لرز گئی۔

''دیکھیں آپی کچھ غلط سلط نہ ہو جائے، ورنہ امی جان تو جیتے جی مر جائیں گی، ویسے تو وہ احتیاط برتتی ہیں، جب تک میں اسکول اور آپ کالج سے آ نہیں جاتیں، ان کا دم ہونٹوں پر رہتا ہے، خدا نہ کرے انہیں کوئی دکھ پہنچے۔''

☆☆☆

میں نویں جماعت کی طالبہ تھی اور یتیمی کے تھپیڑوں نے وقت سے پہلے بالغ کر دیا تھا ہم تینوں بہن، بھائیوں کو...... وہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ نہا دھو کر آپی نے خوب صورت سا سوٹ پہنا، کانوں کے پاس کسی ہوئی دو چٹیائیں سرخ ربنوں سے گوندھ کر باندھیں، بڑی، بڑی آنکھوں میں کاجل کی دھار کھینچی۔

''امی جان، میں شیریں کو لے کر فیروزہ کے گھر جا رہی ہوں، امتحان سر پر ہیں اور مجھے انگریزی کے اسباق سمجھنے ہیں، دوپہر تک آ جاؤں گی۔''

''اچھا سیدھے جانا، ادھر ادھر نہ دیکھنا، نقاب گرا کر نکلنا اور ہاں کسی کو نام یا پتا نہ بتانا۔'' دس ہدایات کے ساتھ امی نے جانے کی اجازت دی۔ گھر سے تھوڑی دور آپی نے تانگا رکوایا۔ کسی جگہ کے بارے میں بتایا اور ایک خاص جگہ پر ہم تانگے سے اتر گئے۔

''آپی فیروزہ باجی کا گھر یہاں تو نہیں...... ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''بازار سے ٹیسٹ پیپر لے کر چلیں گے۔'' آپی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اور اسی وقت پیچھے سے کار کا ہارن سنائی دیا، گاڑی ہمارے نزدیک رکی۔ آپی نے جھٹ پچھلا دروازہ کھول کر مجھے سیٹ پر دھکیلا اور خود فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھیں۔

''آپی یہ کسی کی گاڑی ہے اور ہم اس میں کیوں بیٹھ رہے ہیں؟''

''شیریں، یہ فاروق ہیں، تمہیں بتایا تو تھا ان کے بارے میں اور فاروق یہ میری چھوٹی بہن شیریں ہیں۔''

''کیسی ہو سسٹر، تم ڈرومت، ہم تھوڑا وقت ساتھ بیٹھیں کر گزاریں گے، میں تمہاری آپی سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتا ہوں، آج انہیں ہم پر ترس آ ہی گیا، ورنہ یہ تو ہمیں گھاس ہی نہیں ڈالتیں۔ چھوٹی بہنا، تم ہی ہماری سفارش کر دو ناں......'' فاروق بھائی کا لہجہ ان کی شخصیت کی طرح سحر انگیز تھا۔

مجھے بے حد ڈر لگ رہا تھا، جو کسی نے دیکھ کر امی جان کو رپورٹ دی تو کیا بنے گا ہمارا...... گاڑی شہر سے باہر ایک...... پک نک اسپاٹ پر جا رکی۔ درختوں کے جھنڈ تھے اور ان کے بیچوں بیچ ایک شور یدہ سر صاف و شفاف پانی کی ندی بہے جا رہی تھی، مجھے نہ جانے کیوں اتنی شرم آ رہی تھی، ان دونوں سے کافی فاصلے پر منہ موڑے بیٹھ کر میں پانی میں چھوٹی، چھوٹی کنکریاں چن، چن کر پھینک رہی تھی۔

فاروق بھائی نے بہت سا فروٹ، روسٹ چکن، چپلی کباب اور فرائی مچھلی باسکٹ سے نکال کر سبزے پر بچھی چادر پر سجائیں، ڈر کے مارے نوالے میرے حلق

ساتھ نکل رہی تھی۔ کھانے کے بعد
روہانسی ہو کر آپی سے گھر جانے کی استدعا کی۔
سر جوڑے نہ جانے کیا، کیا باتیں کر رہے
کے شگفتہ چہرے پر قوس قزح کے سارے رنگ
پڑے تھے اور وہ بار، بار منہ پھیر کر ہنستی
ں۔ سہ پہر ہونے لگی تب میں نے منت
جے میں آپی کو جانے کا کہا۔ گھر سے ذرا دور نسبتاً
پر فاروق بھائی نے ہمیں اتارا۔
تیریں تو نے اپنی زبان بند رکھنی ہے، ورنہ
دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی اور ہاں
نہیں بھی جینے نہیں دیں گی۔"
نے ایک دفعہ اس راستے کا انتخاب کر لیا تو
کر نہیں دیکھا۔ اب انہیں میری مدد اور
بھی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں جھوٹ بولنے
تیر بہدف گر آ گئے...... کہ میں سن کر حیران رہ
نے بی ایس سی کیا تو چچا جان ان کا رشتہ لینے
جود ہوئے۔ اس دفعہ تو آپی نے اتنا واویلا
دورے ڈال دیے کہ امی کو انہیں صاف
ا۔ نتیجے میں امی کے ساتھ سسرالیوں کا رشتہ
کے لیے ختم ہو گیا۔ آپی نے بی ایڈ
یا اور اُدھر فاروق بھائی کی اماں اور بہنیں ان
آ پہنچے۔
آپ کو آخر یہ رشتہ بتایا کس نے، میں تو
کے تمام لوگوں کو جانتی ہوں۔" امی نے
خاطر تواضع کے بعد پوچھا۔
اصل بات یہ ہے کہ تمہاری بیٹی اور......
بیٹے فاروق کی آپس میں عرصے سے جان
اب ہم اس لیے جلدی کر رہے ہیں کہ آپ
رشتے پہ رشتے آ رہے ہیں اور میرا بیٹا گھبرا
آپ لوگ کسی کو ہاں نہ کہہ دیں اور پھر
ں نہ بتاؤں کہ فاروق شادی شدہ ہے پر
ے اس کے بچے نہیں...... نہ ڈاکٹرز نے کوئی

بھٹک پڑ گئی ہے۔ اور اس نے وہ واویلا مچایا ہے کہ
الاماں...... اب ہم اس کی جلد سے جلد شادی کرا کر
بات کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔" امی جان کا تو آپی کے
افیئر کے بارے میں جیسے جان کر دم ہی نکل گیا۔ انہیں
سکتہ سا ہو گیا۔ تب نانی نے طریقے سے مہمانوں کو ٹال
دیا۔ امی منہ سر لپیٹ کر پڑ گئیں اور پھر اتنا روئیں کہ گھر
میں سب ہی سہم کر رہ گئے۔
"کتنی مصیبتوں سے، کتنے لاڈ اٹھا کر اس منحوس کو
پالا پوسا اور اس نے یہ صلہ دیا میری محنت کا......"
سارے گھر میں تناؤ کی کیفیت تھی، آپی الگ کمرے
میں بند روئے جا رہی تھیں۔ نانی جان نے کمک کے لیے
خالاؤں کو بلا بھیجا، بڑی مشکلوں سے امی کی ہڑتال اور
آنسو نکلنے بند ہوئے، آپی بھی کمرے سے باہر نکلیں۔
میں نے میٹرک کے بعد فرسٹ ایئر میں داخلہ
لے لیا تھا۔ امی نے ڈر کے مارے مجھے ہاسٹل میں ڈال
دیا کہ "کہیں بڑی کی طرح یہ اِدھر اُدھر منہ ماری نہ کر
بیٹھے۔" اور جہاں آپی کی وجہ سے زندگی کے ہر موڑ پر
میری حق تلفی ہوتی تھی، وہیں آپی کے ایک ٹھکرائے
ہوئے رشتے کے لیے بڑی آسانی سے میرا رشتہ دے دیا
گیا۔ اور اس طرح فرسٹ ایئر میں کل تین ماہ پڑھنے
کے بعد مجھے اگلے گھر سدھار دیا گیا۔ میرا اعلیٰ تعلیم
حاصل کرنے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ اُدھر فاروق بھائی
کے گھر والوں نے بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ لوگ
گاہے بگاہے آ کر پوچھتے رہتے۔ بات بڑے ماموں
تک پہنچ گئی، وہی تو تھے جنہوں نے آزمائش کی گھڑی
میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ انہیں جب فاروق بھائی کی پہلی
بیوی کے متعلق پتا چلا تو وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گئے،
انہوں نے نیم رضامند نانی جان کو بھی خوب ڈانٹا۔
"اگر آپ کی مرضی ہو تو بسم اللہ کر دیں لیکن میں،
میری ماں اور بہنیں بالکل فریق نہیں بنیں گے، آگے
آپ جانیں......" ماموں جان نے امی سے دو ٹوک
بات کی، فاروق بھائی نے سنا تو منتیں کرنے لگے،

ماموں جان کے پاؤں پڑنے لگے۔
"ماموں جان آپ اپنی بھانجی کے لیے جو بھی
ضمانت چاہیں، میں دینے کو تیار ہوں، میری شادی
ایف اے کے دوران کر دی گئی تھی، میری اپنی بیوی
سے کبھی انڈر اسٹینڈنگ نہیں رہی اور اللہ نے اولاد کی
نعمت سے بھی محروم رکھا۔ میں آپ کی بھانجی کو شہر میں
گھر لے کر دوں گا، جتنا زیور چاہیں بنا دوں گا، پر خدارا
میری درخواست نہ ٹھکرائیں۔" ماموں نے کچھ بڑے
بوڑھوں کو درمیان میں لا کر فاروق بھائی اور ان کے گھر
والوں کو منع کروا دیا۔
آپی بہت عرصہ اپ سیٹ رہیں پر ماموں جان
نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ڈرایا، دھمکا... اور اس
طرح یہ بات دب گئی۔ آپی نے ایک بڑے اسکول
میں ٹیچنگ شروع کر دی، انہی دنوں ایک پروفیسر کا
رشتہ آ گیا اور ماموں جان نے جھٹ پٹ ہاں کر دی۔
آپی سے عمر میں کافی بڑے تھے، شکل بھی بالکل معمولی
تھی لیکن جس امتحان سے آپی نے سارے خاندان کو
گزارا تھا اسے مدِنظر رکھ کر سب نے اس رشتے کو
غنیمت جانا، ویسے ذاکر بھائی شریف النفس انسان
تھے۔ فاروق بھائی نے دھمکی دی کہ یہ ڈولی اٹھنے نہ
دوں گا۔ ماموں جان نے چاروں طرف بندوق بردار
بٹھا دیے اور اس طرح سے آپی بخیریت اپنے گھر کو
سدھاریں۔ زندگی کا ساز بے آواز بجتا رہا اور اس اثنا
میں میرے تین بچے ہو گئے، آپی نے بھی جلد ہی چار
بچوں کی قطار لگا دی اور اب وہ ایک بہت بڑے تعلیمی
ادارے کی سربراہ تھیں۔ اس کے باوجود ذاکر بھائی
کے ساتھ ان کے تعلقات سرد مہری کا ہی شکار رہے،
انہوں نے ہمیشہ بے پروائی اور غیر ذمے داری کا
مظاہرہ کیا بلکہ آپی کو کماتا دیکھ کر اپنے حصے کی بھی ذمے
داریاں انہیں تفویض کر کے نسبتاً سکھ کی زندگی گزارنے
لگے۔ ذاکر بھائی اگرچہ بے ضرر اور خاموش سے انسان
تھے لیکن انہوں نے آپی کے جذبے اور ہمت کی
قدر نہیں کی۔ وہ اپنی پوری تنخواہ چھپا کر رکھتے، بچوں کی

آپی کی تنخواہ میں پورے ہوتے، گاؤں میں ان کی
والدہ، کنواری بہن اور تین بچوں کے ساتھ بیوہ بہن کی
ذمے داری بھی وہی نبھاتیں، آپی نے اپنا تمام کا تمام
زیور بیچ کر ایک پلاٹ خریدا...... ہاؤس بلڈنگ فنانس
سے قرضہ لے کر گھر بنایا۔ اسے سجایا، سنوارا۔ دو بیٹیوں
کی شادی کچھ قرض کچھ میکے کی مدد سے خود کروائی۔
آپی سمندر کی طرح خاموش تھیں لیکن اندر ہی
اندر اٹھنے والے مدوجزر انہیں بے چین کیے رکھتے، ان
کے دل میں میاں کی بے حسی اور ناقدری کے خلاف
گلے، شکوے، کدورتیں، نفرتیں پنپتی رہیں، ان ہی
دنوں آپی کی ٹرانسفر دور دراز کے پسماندہ سے شہر میں
ہو گئی۔ اب وہ صبح اذانوں سے پہلے اٹھتیں، سب کے
لیے ناشتا بنا کر ٹیبل پر رکھتیں، میاں کے کالج جانے کے
کپڑے، رومال، جوتے سامنے رکھ کر گھر سے نکلتیں،
جب مرد حضرات مسجدوں سے باہر آ رہے ہوتے تو وہ
پہلی بس میں سوار منزل کی طرف جا رہی ہوتیں، شام
کے جھٹپٹے میں اپنے ساتھ سبزی، گوشت اور فروٹ کے
بڑے، بڑے تھیلے اٹھائے گھر میں گھستیں، کسی طرف
سے ستائش، دلاسا، ہمدردی کے دو بول سنائی نہ دیتے،
اسی فرسٹریشن کے دوران ایک دن آفس میں بیٹھ کر اخبار
اٹھایا تو فاروق بھائی کی بیوی کی فوتگی کی خبر لگی تھی۔
قسمت کے کھیل دیکھیے کہ ہماری طرف سے آپی کے
رشتے سے انکار ہوا اور اُدھر ان کی بیوی نے یکے بعد
دیگرے پانچ بچوں کو جنم دے دیا۔ آپی نے نہ جانے
کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر فاروق بھائی کا نمبر معلوم کیا
اور افسوس کا ٹیلی فون کر دیا۔ وہی ایک لمحہ تھا بغاوت کا،
اس سسٹم سے، ناانصافی سے، جہاں عورت کے حقوق
غصب کیے جاتے ہیں اور اس کے فرائض اسے ہر دم
یاد کرائے جاتے ہیں، دوسری طرف سے فون سن کر
گلے شکوے، حالات کی ستم ظریفی، بے وفائی کے طعنے
اور قسمت کا رونا رویا گیا، آپی نے بھی جلے دل کے
پھپھولے پھوڑے اور یوں امیدوں، آرزوؤں کی سوکھی

ہی منتشر اور فرسٹریڈ تھے۔ سو ایک دوسرے کے زخموں پر پھاہا رکھنے لگے۔

ایک شادی میں ہم دونوں اکٹھے ہوئے، آپی نے شاکنگ پنک سوٹ پر ہلکا سا زیور پہنا تھا، ان کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی ایک الوہی سی چمک تھی۔

''واہ آپی، آج تو آپ غضب ڈھا رہی ہیں، مجھے آپ کی نوجوانی یاد آگئی۔ کیا ذاکر بھائی کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگے ہیں۔'' ان کے ماتھے پر ہلکے سے بل آگئے۔

''ہونہہ تمہارے ذاکر بھائی! اس نے تو کبھی پچیس، تیس سالوں میں ململ کا ایک دوپٹا بھی سر پر نہیں ڈالا، چھوڑو اسے کہ بینک بھرتے جائیں۔'' نفرت اور بیزاری ان کے لہجے سے عیاں تھی۔

''کہاں سے لیا یہ کپڑا، بہت نفیس کام ہوا ہے اس پر اور آپ کے ہاتھ میں یہ نازک سا نگینوں والا بریسلیٹ بھی غضب کا ہے۔''

''ادھر آؤ، میرے قریب بیٹھو۔'' انہوں نے میرے لیے جگہ بنائی۔

''شیریں، تمہیں فاروق یاد ہے ناں جو میرے لیے پاگل بنا تھا؟''

''ہاں آپی بالکل یاد ہے، اُف کتنی ٹینشن تھی ہمارے خاندان میں اور پتا ہے جس دن آپ کی برات تھی اس رات نانی اماں نے سورہ یٰسین اور سورہ نوح کے ختم شریف کروائے تھے پر آپ آج کیوں یاد کر رہی ہیں اسے؟''

''اس کی بیوی پچھلے دنوں فوت ہوگئی اخبار میں پڑھ کر میں نے پرسہ دینے کو فون کر دیا۔ بہت رنجیدہ تھا، رونے لگا تھا، اسے میرے پل، پل کی خبر تھی۔ ذاکر کا رویہ، میری ہمت اور خاموشی، تلخیوں، محرومیوں سب کے بارے میں جانتا تھا۔ ہم پھر سے ملنے لگے ہیں، میری ڈھارس بندھاتا ہے، یہ کپڑے، بریسلیٹ اور بہت کچھ اسی کی طرف سے ہے۔'' میں جو دم بخود صدمے کی

میں آگئی۔ آپی اور ذاکر بھائی کے درمیان رشتوں کا ایک نام نہاد بندھن تھا جو اب جھٹکے سے ٹوٹ جانے کو تھا۔

''آپی آپ اچھا نہیں کر رہیں، ذاکر بھائی جیسے بھی ہیں آپ کے شوہر ہیں اور آپ کے چار بچوں کے باپ ہیں۔ آپ کا ایک گھر ہے، معاشرے میں پہچان اور عزت ہے، ایک شریف خاندان کی بیٹی اور بہو ہیں۔ کتنے رشتوں میں بندھی ہوئی ہیں اور یہ سارے رشتے آپ سے ان کا مان رکھنے کے متقاضی ہیں، آپ جو بھی قدم اٹھائیں گی، وہ آپ کا تنہا فیصلہ ہوگا اور ساری ذمے داری آپ کی ہوگی۔ سارے لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے کہ یہ معاشرہ مرد کا ہے، مرد نے ہی اصول وضوابط بنائے ہیں اور وہی اسے لاگو کرتا ہے۔ اس سرکل سے نکلنے کی کوشش کی تو سارا الزام آپ ہی کو دیا جائے گا۔ فاروق بھائی کا گھر لٹا ہے، وہ ذہنی طور پر منتشر ہیں، انہیں ذہنی اور جسمانی سہارا چاہیے لیکن آپ انہیں سہارا دینے کے بدلے اپنا گھر بار، بچے، نیک نامی اور عزت کو تو داؤ پر مت لگائیں۔ لوٹ جائیں ان ہی سرحدوں کی طرف...... جہاں سے آپ اس اندھے راستوں پر نکلی ہیں۔''

''تو ٹھیک کہتی ہے شیریں...... لیکن مجھے بھی تو دیکھ...... میں ذاکر، اس کے گھر اور بچوں کے لیے کماتے، کماتے تھک گئی ہوں اور یہ...... ستائش یا حوصلہ افزائی کے دو بول بھی نہیں ہیں، وہ تو انسان ہی نہیں...... برف کی ایک ٹھنڈی، بے جان سل ہے۔ اس نے سارا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر ڈال رکھا ہے۔ میں تنگ آگئی ہوں، اس زندگی سے۔ اب میں کیوں نہ اسے سبق سکھاؤں، کیوں نہ اس کے منہ پر تھپڑ رسید کروں۔''

آپی کی باتوں میں وزن تھا پر زمانہ کہاں عورت کا ساتھ دیتا ہے۔ مجھے یہ سب پھر بھی اچھا نہ لگا۔ آنے والے وقت کا ادراک کر کے میں سہم سی گئی۔ نہ جانے ذاکر بھائی کو کیسے شک پڑ گیا۔ کچھ غلطی سے ہوگئے۔ صبح جب آپی رکشے میں جانے لگتیں تو وہ قرآن مجید اٹھا کر

سے گھر کی راہ لوگی۔'' چھٹی کے وقت ذاکر بھائی گھڑی اپنے سامنے رکھتے اور اسکول سے گھر تک کا فاصلہ وقت کی مناسبت سے ماپتے۔ پانچ منٹ کی دیر ہوتی تو وہ بپھر جاتے اور اتنا چیختے کہ الامان، الحفیظ...... چیختے، چیختے کانپنے لگتے اور پھر بے دم ہو کر لڑھک جاتے، بچے سہم کر رونے لگتے اور آپی حیران، پریشان سب کو سنبھالنے لگتیں ان کی ساس اور نندوں نے سنا تو انہوں نے بھی ڈیرے ڈال دیے اور اب سب مل کر آپی کو کوسنے دیتے۔ بددعائیں دیتے...... آپی اس ماحول سے مزید بدظن ہو کر تیزی کے ساتھ فاروق بھائی کی طرف بڑھنے لگیں۔

فاروق بھائی ان حالات... میں آپی کو مزید اکساتے، نہ جانے وہ آپی کو کون سی پٹی پڑھاتے رہے، انہوں نے مجھے بھی اپنے ارادوں کی بھنک پڑنے نہ دی۔

ایک دن صبح سویرے ذاکر بھائی دندناتے، منہ سے جھاگ اڑاتے ہمارے دروازے پر آگئے۔

''چھوٹی تجھے کچھ پتا ہے اپنی آپی کے بارے میں...... وہ یہ خط سرہانے چھوڑ کر گھر سے بھاگ گئی ہے۔'' گھر سے بھاگنے کے الفاظ مجھے ٹکڑے، ٹکڑے کر گئے۔

خط لرزتے ہاتھوں سے پکڑ کر پڑھا، وہی گلے شکوے بے حسی اور کنجوسی کے طعنے...... اور یہ بھی کہ تمہارے اطوار و انداز نے انہیں بچوں کی نظر سے بھی گرا دیا...... اور اب وہ ان کے ساتھ ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتیں۔ انہیں اب زمانے کی کوئی پروا نہیں وغیرہ، وغیرہ...... میرے دل کو کسی نے مٹھی میں جکڑ کر دھلے کپڑے کی طرح نچوڑ دیا۔ بے عزتی، شرمندگی اور...... بے بسی کے احساس نے مجھے ادھ موا کر دیا...... میرے میاں نے بھی ذاکر بھائی کے ساتھ مل کر مجھے، میرے خاندان اور بہن کو تہذیب سے گری ہوئی گالیاں دیں۔ اسی پر بس نہیں...... چھوٹے بھائی اور بوڑھی ماں کو جب گالیوں اور

ذاکر بھائی نے ٹیلی فون کر کے گالیاں دیں...... تو وہ دونوں گھبرا کر کوئٹہ سے جیسے بھاگے، بھاگے آئے، میری والدہ سارا وقت سجدے میں گر کر اللہ کے حضور آنسوؤں کے دریا بہا دیتیں، میرا فوج میں کرنل بھیا، بھوکا پیاسا، خجل خوار سارا دن آپی کی کھوج میں مارا، مارا پھرتا، ان دونوں کو دیکھ کر میرا کلیجا ٹکڑے، ٹکڑے ہونے لگتا۔

گھر میں آپی کی شادی شدہ بیٹیاں اور دونوں بیٹے تڑپ، تڑپ کر روئے۔ آہستہ، آہستہ سب لوگوں کو پتا چل گیا۔ اپنے پرائے لوگوں نے طعنے اور کچوکے دے، دے کر مجھے ادھ موا کر دیا۔ میرا شوہر جو خود بھی ایک حسینہ کی زلف گرہ گیر کا غلام تھا اور اس سے شادی کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ وہ شیر ہو کر بات، بات پر مجھے ہی تمسخر کا نشانہ بنانے لگا۔ تاکہ میں اس حد تک گلٹ میں مبتلا ہو جاؤں کہ وہ جو کرے میں اسے کچھ نہ کہہ سکوں...... میں ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ آپی جو مجھے بہت خوش قسمت اور بنگلوں و گاڑیوں کی مالک سمجھ کر احساسِ محرومی کا شکار ہوئیں انہیں اپنی حالتِ زار کا بتاؤں اور یہ بھی کہ میرے شب و روز دراصل کس طرح گزرتے ہیں، شراب و کباب، تھرکتی جوانیوں اور عیش پسند دوستوں کے سنگ میرے دل پر کتنے کچوکے لگاتے ہیں لیکن پیچھے اپنے خاندان اور بچوں کو دیکھ کر شریف عورت کو خاموشی اور سمجھوتے کی چادر اوڑھنی پڑتی ہے۔ کم از کم گھر تو ہوتا ہے، ورنہ باہر کی دنیا میں تو بھیڑیے عورت کو بھنبھوڑنے کے لیے ہر در، ہر گلی سونگھتے پھرتے ہیں۔ امی جان کے لیے یہ صدمہ جان لیوا ثابت ہوا اور ایک رات دل کے دورے نے انہیں سارے غموں سے چھٹکارا دلا دیا۔ ان کے جنازے میں شرکت کے لیے آپی آگئیں، وسیع آنگن میں بیٹھے لوگ آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے اور انہیں ملامت اور طنزیہ نظروں سے گھورنے لگے۔ کوئی ان کے قریب نہ پھٹکا، جنازہ اٹھنے کے بعد لوگ تھکے ہارے اِدھر اُدھر

...آپی کی جان لے لی۔ مجھے اپنے شوہر اور سسرالیوں میں دو کوڑی کا کر دیا...... چھوٹا بھائی کسی سے آنکھ ملاتے ڈرتا ہے، سب ہی آپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں، کاش مجھے پتا چل جاتا تو آپ کے پاؤں پکڑ کر اس ارادے سے باز رکھتی، آپ نے کیوں ایسا کیا؟" میں ان کے سامنے پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو شیریں...... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پر میں کرتی بھی کیا...... ذاکر کا رویہ، اس کا پاگل پن مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔ میں خود پاگل ہو جاتی اگر کچھ عرصہ مزید وہاں رہتی۔"

"آپی شکستہ دل اور منتشر الذہن تو آپ تھیں ہی، فاروق بھائی نے جلتی پر تیل ڈال کر آپ کو بھسم کر ڈالا...... میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ کوئی بھی قدم اٹھانے کی آپ خود ذمے دار ہوں گی، اب دیکھیں سارا زمانہ ایک طرف ہو کر تماشا دیکھ رہا ہے، اب آپ بالکل اکیلی ہیں...... پر آپ کے ساتھ ہم تینوں، ماں، بہن اور بھائی بے قصور ہو کر بھی موردِ الزام ٹھہرے اور تہمتوں کے سنگ و خشت سے ہمیں سنسار کیا جا رہا ہے۔ امی نے تو گھبرا کر مٹی اوڑھ لی۔ بھائی نے قسم کھائی کہ اس شہر میں زندگی بھر قدم نہیں رکھوں گا۔ اور میرا سینہ لوگوں نے طعنوں سے چھلنی کر دیا ہے۔"

"شیریں! میں اپنے کیے پر ہرگز نادم نہیں، میں ذاکر سے طلاق لے کر فاروق سے شادی رچاؤں گی تاکہ اس کے الزامات کو صحیح ثابت کر سکوں۔" چھوٹے بھائی نے آکر غصے میں مجھے مخاطب کیا۔

"شیریں اپنی بہن کو بتا دو کہ وہ ہماری زندگیوں سے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے نکل چکی ہے۔ اس نے ہماری عزتوں کو نیلام کیا، یہ ہماری ماں کی قاتل ہے، اسے کہو یہ چلی جائے اور پھر کبھی یہاں آنے کی جرأت نہ کرے۔"

آپی کا رنگ زرد پڑ گیا۔ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چادر میں لپیٹا اور بہکتے قدموں خاندان کے مجبور کرنے پر ہمارے گھر آکر آپی کی طلاق کی دستاویز تیار کیں۔ سنا ہے جہاں طلاق ہوتی ہے وہ جگہ لرزنے لگتی ہے۔

آپی نے عدت کے بعد فاروق بھائی سے شادی رچا لی اور وہ انہیں اپنے لمبے چوڑے خاندان میں لے گئے۔ جہاں ان کے تین بھائی اور تین بیٹے اپنی، اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے آئے تھے۔ ایک کنواری بیٹی، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں کتنے ہی لوگ ایک ساتھ رہتے۔ اٹھتے بیٹھتے سب کی طنزیہ اور تحقیر آمیز نظریں آپی کا پیچھا کرتیں، ان کی اپنی بیٹیوں پر سسرال والوں نے طنز و مزاح کے اتنے تیر چلائے کہ ان کے نازک سے دل چھلنی، چھلنی ہو گئے۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئیں۔

"کاش ہماری ماں، بھاگنے کے بجائے مر جاتی، شرمندگی کے دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔" ان کے دونوں بیٹوں نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ میں نے اپنے بھانجے اور بھانجیوں کا دکھ بانٹنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ مجھ سے بیزار اور نفرت انگیز رویہ رکھتے۔

"ہونہہ جیسی بڑی بہن، ایسی ہی یہ خود بھی ہوں گی، ہمیں ماں سے وابستہ ہر ایک رشتے سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"کہاں ہو آپی تم، تم نے مجھے زمانے کے روبرو کر کے خود منہ چھپا لیا۔"

دس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ سب نے آپی کا نام تک بھلا دیا۔ کوئی ان کا نام لیتے ہمارے لوگ خوف سے کانپنے لگتے۔ ابھی کل ہی مجھے آپی کی ایک سسرالی رشتے دار نے فون کیا۔

"آپ تو آپی کے ساتھ میرے گھر آ چکی ہیں، میرا وہی پرانا ایڈریس ہے۔"

"مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ میں آ نہیں سکتی کیا آپ شام کو میرے گھر آ سکتی ہیں۔ آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔"

...بیٹھتی ہوں تو پورے بدن میں بے چینی اور افسردگی کی آگ مجھے جھلسانے لگتی ہے۔

اپنا پرانی سسرالی رشتے دار کے گھر آپی نے منت سماجت کر کے مجھے بلایا تھا۔ خوب صورت مہنگا لباس، میچنگ جوتے و جیولری، شوخ گلابی رنگوں سے رنگے ان کے ناخن، گھنے لمبے بالوں میں رنگ برنگے ربن یا موتیوں والے کلپ سجائے، غرور و حسن سے اٹھلاتیں، آپی کی جگہ یہ کون سی عورت میرے سامنے کھڑی ہے۔ سفید چھدرے، بکھرے بال، مسلا ہوا بدرنگ جوڑا، پاؤں میں پلاسٹک کے عام سے چپل...... برسوں کی بیمار، لاغر جسم، ویران آنکھیں، یہ میری آپی تو نہ تھیں۔

"یہ تم نہیں ہو آپی...... بتا دو کہ یہ تم نہیں ہو۔" میں ان کے گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ آپی بھی روتے، روتے نڈھال سی کرسی پر ڈھے سی گئیں۔ گھر والوں نے دوڑ کر انہیں پانی پلایا۔ ہاتھوں، پیروں کی ہتھیلیاں ملیں، تب ان کی دھونکنی کی طرح چڑھتی اترتی سانس برابر ہوئی۔

"شیریں تو ٹھیک کہتی تھی، مجھے لوگوں نے اس فیصلے کی بنا پر دور پھینک دیا۔ دیکھو تمہاری آپی کتنی اکیلی رہ گئی ہے، وہ فاروق جس کے بھڑکانے سے میرے مجروح جذبات شوریدہ سر دریا جیسے ابل پڑے، آج وہ مجھے گھونسوں، لاتوں اور تھپڑوں سے پیٹتا ہے، کہتا ہے ارے تم تو ہو ہی آوارہ، آبرو باختہ اور بے اعتبار عورت...... جو عورت اپنے ماں، باپ، بہن بھائیوں کی نہ ہوئی وہ میرے ساتھ کیا وفا کرے گی۔ میرے ہاتھ پر ایک پیسہ نہیں رکھتا بلکہ جو میں کماتی ہوں وہ بھی چھین کر اپنے گھر اور بچوں پر لگا دیتا ہے۔ یہ دیکھو میرا جسم اس کی ظالم مار کے نشانات سے بھر گیا ہے۔ ذرا، ذرا سی بات پر دیوانوں کی طرح پیٹتا ہے۔"

میرے گلے مل کر آپی نے اپنے اذیت ناک روز و شب کی داستان سنا دی۔ ایک لمحے کو میرا دل پسیجا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے دل چاہا ان کا منہ تھپڑوں سے

آپ کو کیا فرق پڑتا تھا ذاکر بھائی کی بے رخی سے ہماری عزتوں، ہمارے سکون کی دھجیاں بکھیر دیں۔" لیکن ان کے بدن پر تو فاروق بھائی کی مار نے یہاں وہاں ہر جگہ اپنے نشان ثبت کر دیے تھے اب ایسے میں، میں کیا مارتی۔

"آپی آپ تو ذاکر بھائی کے لیے کما، کما کر تھک آ چکی تھیں۔ آپ تو بقایا زندگی آرام سے گزارنا چاہتی تھیں۔ کیوں پورے نہ ہوئے آپ کے خواب، کیوں الجھ گئیں تقدیر کی ساری ڈوریاں۔ تمام مرد، عورتوں کے لیے ایک جیسا سوچتے ہیں۔ درست ہے جو عورت گھر سے نکل کر زندگی کے ساتھی کا بوجھ ہلکا کرنا چاہے تو اسے فار گرانٹڈ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسے دُہری ذمے داری اٹھانی پڑتی ہے۔ پھر بھی اس کے نصیب نہیں بدلتے، ہم سب کی عزت، مان اور بھروسے کو توڑ کر گھر سے نکلنے والی نے کیا حاصل کیا۔ اپنی بیٹیوں، ماں، بہن بھائی، سسرال سب کی عزتوں کو پاؤں تلے روند کر سوائے ڈھیروں ڈھیر بدنامیوں اور جگ ہنسائی کے اور کیا منافع کمایا۔ ایک آقا کے چنگل سے نکل کر دوسرے آقا کے زیرِ سایہ آ گئیں۔

عورت کی تو شوہر کا گھر یا پھر گور تک کی زندگی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کا سوچنا بھی جرم ہے، کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیے کہ آج سے دس سال بعد اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

گھر کی طرف میرا واپسی کا سفر میرے لیے اذیت ناک بن گیا تھا۔ میرے لرزتے ہوئے قدم میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس گلی سے نکلتے ہوئے میں دیوار کا سہارا لے کر ایک پکے گھر کے تھڑے پر بیٹھ گئی۔ آنسو میرے چہرے سے بہہ کر ٹھوڑی کو بھگونے لگے۔ اب مجھے کسی سواری تک پہنچنے میں بڑا وقت لگے گا کہ میرے اپنے زخموں کے بھی منہ کھل چکے تھے۔

شیریں حیدر

قسط 23

تخلیق کائنات سے لے کراب تک . . . کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت ، نفرت ، رشک ، حسد ، رنج ، غصہ اور خوشی . . . اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کرلیتے ہیں ، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ . . . یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں ۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں ۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو ان کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے ۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر ، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے ۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں ۔

زندگی کے انہی پیچ وخم اور نشیب وفراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر ......



''خدا کے لیے کہہ دیں کبیر بھائی کہ یہ جھوٹ ہے۔'' میں نے ان سے لپٹ کر چیختے ہوئے کہا۔

''خود کو سنبھالو امرت...... '' کبیر بھائی نے مجھے اپنے ساتھ لگایا۔ ''تم تو بہت بہادر ہو، تم کمزور پڑ گئیں تو ان بزرگوں کو کون سنبھالے گا؟''

''میں ان سے مل بھی نہیں سکی کبیر بھائی، میں ان سے ان کی وہ بات بھی نہیں سن سکی جس کے لیے انہوں نے مجھے بلایا تھا۔'' میں ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''میں کس طرح صبر کرلوں؟''

''امرت ہمیں بہت بڑے، بڑے چیلنجز کا سامنا ہے اس وقت...... '' وہ بھی ہچکی لے کر رونے لگے۔ ''میں تو خود بھی کمزور پڑ گیا ہوں، اندر سے مر سا گیا ہوں، مجھے تو تمہارے دکھ نے ہی نیم مردہ کر دیا تھا۔'' امو جان اور پھپھو بھی ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ کامل ان دونوں کے پاس بیٹھا انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اسی لیے اتنے دنوں سے آپ کو بتا نہیں رہے تھے...... '' کامل نے کہا۔

''کیا مطلب ہے اس بات کا کبیر بھائی، کیا آپ لوگوں کو پہلے سے علم تھا؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''یوسف کے بارے میں علم ہو چکا تھا، چاچو تو رات...... بلکہ علی الصباح۔'' وہ پھر ہچکیوں سے رونے لگے۔

''کیا چاچو کو یوسف کے بارے میں علم تھا کبیر بھائی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرا اور کامل کا اندازہ تو یہی ہے کہ انہیں کسی نہ کسی طرح علم ہوگا، اگر نہیں تو شک تو ہوگا۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہ خبر جھوٹی ہو؟'' میں نے ایک کمزور سی امید کا سہارا لیا۔ ''یوسف خودکشی نہیں کر سکتا کبیر بھائی، اس کا ایمان تو بہت پختہ تھا۔''

''شک یہی ہے امرت کہ جیل میں ہی ان لوگوں کو کھانے میں کچھ ملا کر کھلا کر مروا دیا گیا ہے جنہوں نے انہیں اپنے غلط مقاصد کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا ہے...... ان نو عمر لڑکوں کے ذریعے بڑی مچھلیوں کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا تھا، ان کے منہ ہمیشہ کے لیے بند رکھنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ ان کے قتل کو خودکشی کا رنگ دے دیا جاتا۔ پہلی بار پکڑے جانے والے یہ سارے کچی عمروں کے نوجوان تھے، زیادہ دیر تشدد برداشت نہ کر پاتے اور پولیس کی تفتیش میں سب کچھ اگل دیتے اور انہیں تو یوں بھی معصومیت میں پھنسا لیا گیا تھا۔ یہی سوچ کر ان کے ان ناخداؤں نے انہیں ایسے انجام سے ہمکنار کر دیا۔''

''مگر جیل میں اس طرح کی واردات کرنا کہاں ممکن ہے، وہاں پر قیدیوں کی سیکورٹی نہیں ہوتی کیا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''بدقسمتی سے جیلوں کے اندر اس طرح کی وارداتوں کے لیے جیلوں کے عملے کو ہی شامل کیا جاتا ہے، کرپشن کسی نہ کسی طور دنیا میں ہر جگہ موجود ہے بیٹا۔'' کبیر بھائی نے کہا۔

''زیبا چچی اب کیسی ہیں، کیا ہمیں ان کے پاس جانا چاہیے؟'' میں نے ان سے کہا۔

''ان کی حالت اچھی نہیں ہے...... ڈاکٹروں نے مسکن دوائیں دے کر انہیں کل سے سلا رکھا ہے۔'' کامل نے بتایا۔

''میرا خیال ہے پھر ہمیں بھی اسپتال جانا چاہیے...... '' پھپھو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اسپتال جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ماما۔'' کامل نے کہا۔

''تو کیا ہم گھر جائیں...... جانے زیبا کے میکے والے کہاں ہوں گے، وہ سوچیں گے کہ ہماری طرف سے کوئی بھی اس خاندان کی دل جوئی کے لیے موجود نہیں ہے...... '' پھر وہی سوچ جو ہم سب کا خاصہ ہوتی ہے کہ کوئی کیا سوچے گا۔

''اس میں وقت ضائع ہوگا، بہتر ہے کہ آپ لوگ گاؤں کے لیے نکل جائیں، کبیر اور میں میت آنے کے بعد آ جائیں گے۔'' میت کا لفظ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''مہر بھی تو وہاں ہے ناں۔'' امو جان نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ممکن ہے کہ وہ گاؤں چلی گئی ہوں۔'' کبیر بھائی نے قیافہ لگایا۔

''گاؤں میں سارے انتظامات کون کروائے گا؟'' پھپھو نے سوال کیا۔

''سرمد کو کال کر کے بتا دیا تھا، وہ سارے انتظامات دیکھ لے گا۔'' کبیر بھائی نے بتایا۔ ''میثاق بھی پہنچ کر مدد کر دے گا۔''

''شامیر کو کسی نے اطلاع کی؟'' میں نے پوچھا۔ ''اب تو اسے چھٹی مل جانی چاہیے۔''

''ہم سب کو ان کے گھر تو جانا چاہیے...... '' امو جان نے کہا۔ ''مرگ والا گھر ہے، یوسف کی میت بھی تو سیدھے گھر ہی لے کر آؤ گے ناں تم لوگ۔'' ان کی بات سن کر میری چیخ نکل گئی۔

''وہاں گھر پر بھلا اس وقت کون ہوگا؟'' کبیر بھائی نے سوال کیا۔

''اور کوئی ہو نہ ہو ہم تو ہوں گے ناں...... جمال کے بچے اور زیبا کے میکے والے تو سب وہیں ہوں گے۔''

''جس طرح آپ کو مناسب لگتا ہے چلیں پھر نکلیں۔'' کبیر بھائی نے کہا تو ہم نے تیاری باندھی۔ ساجدہ کو کہا تھا کہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ ہی لے لے اور انہیں مقبول چاچا کے پاس چھوڑ دے، گاؤں بھی اسے میرے ساتھ جانا ہوتا کیونکہ میں دو، دو بچے نہیں سنبھال سکتی تھی۔

''یا اللہ...... میں کس طرح دیکھ پاؤں گی اپنے اس پیارے سے بھائی یوسف کو اس حال میں؟'' میرے اندر ایک ایسا احساس جرم اترنے لگا کہ میرا سارا وجود لرزنے لگا۔ اس نے مجھ سے سفارش کروا کر ہی تو چاچو سے اجازت لی تھی لیکن اس بات کو میرے اور اس کے علاوہ صرف چاچو جانتے تھے، اگر زیبا چچی کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ اس کے گرفتار ہوتے ہی میری جان کی دشمن ہو جاتیں۔ انہیں تو یہی لگتا تھا کہ ان کی سفارش سے چاچو نے اسے جانے دیا تھا اور وہ خود کو ہی اس کی قصوروار سمجھتی تھیں۔ چاچو انہیں کہتے بھی تھے کہ ایسا ہونا سب قسمت میں تھا اور وہ خود کو مورد الزام نہ ٹھہرائیں۔

''چاچو...... میرے پیارے چاچو۔'' میں چاچو کا نام لے کر رونے لگی، امو جان اور پھپھو کی آوازیں بھی میری آواز میں شامل تھیں۔ بچوں کو سنبھالتی ہوئی ساجدہ بھی بے آواز رو رہی تھی۔

''میں چادر لے کر آتی ہوں، اس کے بعد چلتے ہیں۔'' پھپھو اٹھیں۔

ساجدہ سے کہا کہ وہ اپنی تیاری کر لے، اتنی دیر میں، میں دونوں بچوں کو تیار کرلوں اور ایک بار ان کے پیٹ بھر لوں۔ ساتھ لے جانے کے لیے میں نے دونوں کے لیے فیڈر وغیرہ بھی رکھ لیے، ممکن ہے کہ انہیں فیڈ کروانے کا وقت نہ ملے اور خاص طور پر بچی کو، اول تو اس کے ہمارے ساتھ ہونے پر ہی کئی طرح کے اعتراضات اٹھتے لیکن ان کی پروا نہیں تھی مجھے۔ کم از کم امو جان تو یہ ذمے داری لے سکتی تھیں کہ انہوں نے خود اسے اپنے پاس رکھنے کا کہا تھا۔

☆☆☆

زیبا چچی کے میکے سے چند لوگوں کے علاوہ وزین، عارب اور حسنہ...... تینوں گھر پر تھے اور ان کے چہرے حزن اور ملال سے پیلے ہو رہے تھے۔ ان پر اس طرح کا مشکل وقت پہلے کب آیا تھا کہ ماں اور باپ میں سے کوئی بھی مشاورت کے لیے پاس نہ ہو۔ پردیس سے جوان بھائی کی میت آ رہی تھی، ماں خود بے ہوش تھی اور ہر غم سے بے نیاز اور باپ موت و حیات کی ایسی کشمکش میں کہ جس میں موت کا پلڑا واضح نظر آ رہی تھی۔ وہ اچانک کوما میں چلے گئے تھے اور ڈاکٹروں نے ان کی حالت سے مایوسی ظاہر کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ اب ان کا آپریشن بھی ممکن نہ رہا تھا...... دواؤں کی مدد سے اگر ان کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو شاید چند ماہ میں ان کے آپریشن کی کوئی امید ہو جاتی۔ لیکن اس آپریشن کی کامیابی کا انحصار بھی اسی بات پر تھا کہ ان کا دماغ کس حد تک اس شاک سے باہر آ سکتا تھا۔ ہوش میں آ بھی جاتے ہیں تو یوسف کا سن کر ان پر جانے کیا بیتے گی۔ اسے تو کوئی بھی نہیں جانتا۔

کامل نے یہ سب بتایا تھا اور اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ اگر چاچو کی حالت سنبھل گئی تو انہیں جہاں بھی لے جانا پڑا

لے کر جائے گا، خواہ اس کے لیے زیبا چچی اور ان کے بچے مانتے یا نہیں۔ میرے لیے یہ سوچنا کہ ڈاکٹرز، چاچو کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، ایسا صدمہ تھا جو ابو جان کی اچانک حادثاتی موت سے بڑھ کر تھا۔ ابو جان کی وفات سے چاچو نے میرے لیے باپ کے نعم البدل کا کردار ادا کیا تھا اور مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ میں یتیم ہو گئی تھی۔ اب چاچو کو کچھ ہو جاتا تو میرا کیا ہوتا! وہ میرے باپ کے بعد میرے لیے ایک ایسے سائبان کی طرح تھے جس کی چھپر چھاؤں زندگی کے ان دنوں میں بھی مجھ پر سایہ فگن رہی تھی جب میں خود کو کسی بیابان صحرا میں پاتی تھی۔ میری خاطر انہوں نے اپنے گھر والوں، اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی مخالفت مول لی، انہیں واضح کر دیا تھا کہ جو مجھے ناراض کرے گا وہ چاچو کی نفرت کا مستحق ہوگا، محبت کا نہیں۔ اسی وجہ سے زیبا چچی نے میرے خلاف اپنے دل میں وہ اکاؤنٹ کھولا تھا جس میں سارے سکے وہی جمع ہوئے تھے جو میرے خلاف استعمال ہو سکتے تھے۔

☆☆☆

ہم سب خاموش بیٹھے آنسوؤں کی تسبیحات رول رہے تھے۔ میرے دل سے نالے اور لوٹے اٹھ رہے تھے مگر میں خود پر قابو رکھے ہوئے تھی کیونکہ اس گھر کا ہر فرد خود کو کمپوز رکھے ہوئے تھا۔ حسنہ کی آنکھوں سے آنسو لڑی کے مانند رواں تھے مگر زین اور عارب دکھ کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ سب لوگ صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے تھے، گاؤں میں ایسی صورت میں کرسیوں پر صرف وہی لوگ بیٹھتے ہیں جو کسی مجبوری یا جوڑوں کی بیماری کی وجہ سے زمین پر بیٹھنے سے قاصر ہوں۔ شہروں میں دیہات کی روایات نہیں ہیں، میت والے گھر میں زمین پر بیٹھنا شاید میت کے احترام کی روایت ہوگی۔

میں اپنی ٹھوڑی اپنے گھٹنوں پر لگائے بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی۔ مجھے لگا کہ میں نے اسے اچانک زائد والے کمرے سے نکل کر اوپر جاتے ہوئے دیکھا تھا، ممکن ہے کہ میری نظر کا دھوکا ہو مگر نہیں...... تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس نیچے آئی اور اسی کمرے میں چھپاک کرکے گھس گئی۔ اس نے کسی ہلکے سے رنگ کی بغیر بازوؤں کی قمیص پہن رکھی تھی اور ساتھ انتہائی پھنسی ہوئی جینز، یہی اس کا عمومی لبادہ تھا۔ وہ کوشش کرکے خفیہ طریقے سے اس کمرے سے نکلی اور اوپر گئی تھی مگر میں اس گھر کے چپے، چپے سے واقف تھی اور ایسی کوئی حرکت میری نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے کوئی اور تو پہچانتا ہی نہ تھا، اس لیے بھی کسی کو شک نہ ہوا، اگر کسی نے دیکھا بھی ہوگا تو اسے زیبا چچی کے میکے سے کوئی لڑکی سمجھا ہوگا۔ ”بس یہی چاہتے تھے ناں زین تم؟“ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور زین کی طرف بے اختیار نظر اٹھا کر دیکھا، وہ اپنے بازوؤں کے حلقے میں اپنے دونوں چھوٹے بہن بھائی کو لے کر بیٹھا ہوا تھا......

قدرت نے اس خاندان کو کتنی کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا، چند ماہ کے وقفے سے دو بہن بھائی کی جواں مرگی...... باپ کو دل کا شدید دورہ پڑنا، ماں کے حواس کھو جانا۔ میں محویت سے اس کے اس چہرے کو دیکھ رہی تھی جو کبھی میرے شوہر کا چہرہ ہوتا تھا، جانے اسے میری نظر کی تپش محسوس ہوئی یا یونہی...... اس نے مجھے دیکھا، میں نے فوراً نظر جھکا لیا اور آنسوؤں کی تسبیح سمرنے لگی۔ میں نے دل میں اس دکھ کو محسوس کیا جو اس وقت اس گھر کے کسی بھی مکین کے دل میں تھا۔ میں نے تکلیف کے بدتر لمحات میں بھی کسی کے لیے بددعا نہ کی تھی۔ زین کے ہاتھوں جو، جو عذاب میں نے سہے تھے، اس کے باوجود میں نے کبھی یہ بھی نہ سوچا تھا کہ اس کے ساتھ بھی کچھ برا ہو۔ میں نے تو ہر تکلیف کے بعد یہی سوچا کہ یہ اللہ کی طرف سے میری آزمائش ہے اور وہ میرے لیے جو بھی کرے گا وہ میرے حق میں بہتر ہی ہوگا۔ نظر جھکانے کے باوجود بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے گھور رہا ہوگا۔

میں اس گھر میں اپنی طلاق کے بعد پہلی دفعہ آئی تھی۔ عام حالات میں تو میں یا میرے گھر سے کوئی اور بھی یہاں نہ آتا مگر ان حالات میں، میں نے سوچا کہ میرے ساتھ اس گھر میں جو بھی ہوا وہ اپنی جگہ اہم اور تلخ سہی مگر یہ میرے چاچو کا گھر ہے اور اس گھر میں میرے بھائیوں جیسے یوسف کی یوں جواں مرگی سے بڑھ کر اور کیا سانحہ ہوتا کہ میں یہاں آتی......

☆☆☆

سب سے پہلا مسئلہ تو یہ اٹھا تھا کہ یوسف کو اسلام آباد میں دفن کیا جائے یا گاؤں میں...... ان کے ہاں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کی کوئی صائب رائے ہوتی۔ زین چونکہ اس وقت اس گھر کا بڑا تھا اس لیے دونوں پھپھوؤں نے اسی کے ساتھ اس وقت بات چھیڑی تھی جب میت ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ زین اسلام آباد میں تدفین کے لیے مصر تھا مگر بڑوں نے سمجھایا کہ ان کا گھر جتنا بھی بڑا سہی مگر اس میں اتنے مہمانوں کی گنجائش نہیں۔ گاؤں سے خاندان کے لوگوں کے لیے یہاں آنا اتنا آسان نہ ہوتا اور پھر گاؤں میں سارا خاندان اور برادری ہے، آبا و اجداد کی قبریں بھی وہیں پر ہیں اور بحال چاچو کو ہوش ہوتا تو وہ بھی گاؤں جانے کا فیصلہ ہی کرتے۔

سمجھانے کی اتنی کوششوں کے باوجود ابھی تک زین کی طرف سے یہ اختلاف تھا کہ یوسف کی میت کو گاؤں نہ لے جایا جائے۔ چونکہ خاندان میں سے اکثریت کی رائے اس کی مخالفت میں تھی سو ہمارے خاندان کے سب بڑوں نے زیبا چچی کے میکے والوں کے ساتھ مشاورت کرکے فیصلہ کیا تھا کہ میت کے پہنچتے ہی چاچو کے گھر سے روانہ کروا کے اسے گاؤں لے جایا جائے گا لیکن پرواز میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے اب ڈیڈ باڈی رات کو اتنی دیر سے پہنچ رہی تھی کہ اسی وقت گاؤں نہیں جایا جا سکتا تھا، نہ ہی اتنی رات گئے یہاں بھی تکفین و تدفین ہو سکتی تھی۔ میت کے پہنچنے پر دلوں میں کیا، کیا کہرام مچا، ہمارے دل فریاد کناں تھے، خاموش لب سسکیاں روکنے کی کوشش میں تھے، ماحول پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح گاؤں کے لیے روانگی کے وقت گاڑیوں میں کس کے ساتھ کسے بیٹھنا تھا، سب کچھ میثاق اور کامل نے ہی پلان کیا تھا۔ کبیر بھائی کے ساتھ میرے علاوہ امو جان اور گل پھپھو جانے والی تھیں۔ کامل اور زین کو میت کے ساتھ ایمبولینس میں جانا تھا، حسنہ اور عارب کو مہر پھپھو اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں لے کر جاتیں اور ان کے اپنے گھر کی دو گاڑیاں ساتھ جا رہی تھیں جن میں جاتے ہوئے تو ملازمین جا رہے تھے مگر واپسی پر ان گاڑیوں میں گھر کے لوگوں کو بھی آنا تھا۔

گاؤں تک کا سفر آنکھوں میں کٹا، نیند بھی روٹھی ہوئی تھی اور سوجی ہوئی آنکھوں میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ریت سی بھری ہو۔

چاچو کے گھر کو لاک کر دیا گیا تھا اور گھر پر صرف گارڈ تھے...... مقبول چاچا نے گھر پر رکنے سے انکار کر دیا تھا، ساجدہ کے لیے بھی اپنے بچوں کو چھوڑنے کا مسئلہ تھا سو اس کے بچے بھی ساتھ ہی آئے تھے اور چھت پر ایک کمرے میں ان کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ساجدہ کو رات کو سونے تک میرے پاس ہی رہنا تھا اور سونے کے لیے چھت پر اپنے بچوں کے پاس چلی جاتی۔

نور پور میں...... دادا جان کی حویلی ایک بار پھر گریہ میں ڈوبی ہوئی تھی، ایسا منظر میں نے اس حویلی میں کئی بار دیکھا تھا...... دادی جان، دادا جان اور اپنے پیارے ابو جان کی وفات کے وقت...... لیکن اب کے جو دکھ تھا وہ بہت کڑا تھا۔ آنکھوں میں سمندر اترا ہوا تھا جو کہ مسلسل آسمان کی آنکھوں سے بھی بہہ رہا تھا، دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کامل کوشش نہ کرتا تو یوسف کی لاش بھی لاوارث قرار دے کر وہیں چند دن کے بعد دریا برد یا دفن کر دی جاتی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ چاچو کو انہوں نے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو مگر رابطہ نہ ہو سکا ہو یا پھر ممکن ہے کہ چاچو اس خبر کو جان کر ہی دکھ کی تاب نہ لا سکے ہوں...... جب تک چاچو ہوش میں نہ آتے اس کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ زیبا چچی وہیں اسپتال میں بے ہوشی کے عالم میں رکھی گئی تھیں، ہوش میں آتیں تو انہیں شدید دورے پڑنے لگتے۔

تمنا ابھی تک گاؤں میں ہی تھی کیونکہ مہر پھپھو اور میثاق بھی یہاں سے اسلام آباد گئے تھے۔ ہمارے پہنچنے تک تحریم اور پھوپھا ہاشم بھی لاہور سے آ گئے تھے۔ مہمان کافی تھے اور اب تمنا کو میثاق کے ساتھ قیام پذیر ہونا تھا اس لیے میں نے امو جان کے کمرے میں قیام کو ترجیح دی، وہ بچوں کو سنبھالنے میں امو جان کی مدد بھی مل جاتی۔ گل پھپھو کا قیام اپنے سسرالی گھر یعنی شہربانو پھپھو کے گھر میں تھا مگر دن بھر سے سب لوگ یہیں تھے۔

فجر کے وقت اسلام آباد سے روانہ ہو کر سارا قافلہ گاؤں پہنچا تھا، میت کی گاڑی نسبتاً آہستہ آ رہی تھی جس میں کامل زین کے ساتھ تھا۔ ہم باقی گاڑیوں والے جلد پہنچ گئے اور میت پہنچی تو گاؤں کے قریبی رشتے داروں کو اس کا آخری دیدار کروانے کے بعد ظہر کی نماز کے بعد تدفین کر دی گئی تھی۔ گاؤں میں لوگ یوں امڈے پڑ رہے تھے کہ اتنے لوگ شہر میں شاید کسی میلے میں بھی دیکھنے کو نہ ملتے۔ جتنے لوگوں کو گاؤں میں سنبھالا جا سکتا تھا، وہاں شہر میں اتنے لوگوں کو سنبھالنا پڑتا تو آسان نہ ہوتا، اسی لیے کبیر بھائی اور کامل کا اصرار تھا کہ یوسف کی تکفین و تدفین گاؤں میں ہی کی جائے۔

☆☆☆

"کیا مجھے اپنی بیوی زارا کو اپنے ساتھ گاؤں لے جانا چاہیے.....؟" چاچو کے گھر سے روانگی کے وقت جب ہم گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے تو زین نے مہر پھپھو سے سوال کیا تھا۔

"اسے پہلے پورے بازوؤں کی کوئی قمیص تو خرید کر دے دو تم، اس طرح تو گاؤں کے لوگ کہیں گے کہ شاید ہمارا خاندان اتنا فقیروں کا خاندان ہے کہ جمال کی بہو یعنی تمہاری بیوی کو پورا لباس بھی میسر نہیں......" مہر پھپھو نے اسے گھر کا۔

"ویسے جمال نے تو اسے اپنی بہو تسلیم بھی نہیں کیا تھا......" گل پھپھو نے کہا۔ "تب بھی نہیں جب تم نے اس پر ریوالور تان لیا تھا اور پھر اپنی خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ جمال کے اسپتال جاتے ہی تم اسے گھر پر لے آئے، اس کی زندگی میں ہی..... اتنا بڑا اختلافی فیصلہ کر لیا تم نے۔" پھپھو کے یوں کہنے پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں اسے نہ لے کر جاؤں؟" وہ ڈھٹائی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں...... اس کا یہی مطلب ہے اور اس کا بہت واضح مطلب یہ بھی ہے کہ یہ اس وقت تک اس گھر میں نہیں آ سکتی جب تک جمال اس کی اجازت نہ دے۔" مہر پھپھو نے اٹل لہجے میں کہا۔

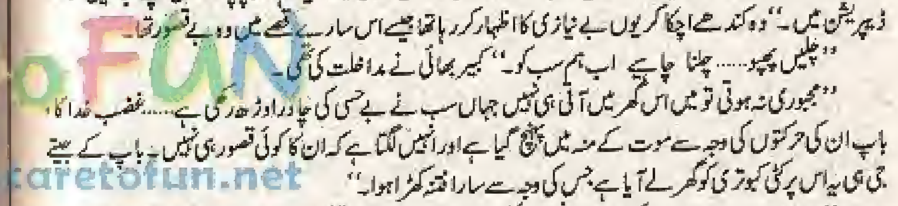
"اگر پاپا......" وہ رکا۔ "میرا مطلب ہے کہ گھر واپس نہ آ سکے تو؟"

"حیا نام کی کوئی چیز تمہیں نہیں نصیب ہوئی اور نہ ہی خوفِ خدا۔" وہ غصے سے بولیں۔

"یہ سب تو نیچرل ہے پھپھو...... ڈاکٹر ان کی حالت سے بہت مایوس ہیں۔"

"اللہ نہ کرے کہ میرے بھائی کو کچھ ہو، تم اور تمہاری ماں نے اسے اس حالت تک پہنچایا ہے۔" وہ سسکیں۔

"اللہ کے ہی سارے فیصلے ہوتے ہیں پھپھو، کون سا میں نے ایسا کوئی فیصلہ کیا ہے کہ پاپا کوما میں چلے جائیں اور مما ڈیپریشن میں۔" وہ کندھے اچکا کر یوں بے نیازی کا اظہار کر رہا تھا جیسے اس سارے قصے میں وہ بے قصور تھا۔



"چلیں پھپھو...... چلنا چاہیے اب ہم سب کو۔" کبیر بھائی نے مداخلت کی تھی۔

"مجبوری نہ ہوتی تو میں اس گھر میں آتی ہی نہیں جہاں سب نے بے حسی کی چادر اوڑھ رکھی ہے...... غضب خدا کا، باپ ان کی حرکتوں کی وجہ سے موت کے منہ میں پہنچ گیا ہے اور انہیں لگتا ہے کہ ان کا کوئی قصور ہی نہیں۔ باپ کے جیتے جی ہی یہ اس پرکٹی کبوتری کو گھر لے آیا ہے جس کی وجہ سے سارا فتنہ کھڑا ہوا۔"

"وہ میری بیوی ہے پھپھو، پاپا کو اسے آج نہیں تو کل اپنی بہو کے روپ میں تسلیم کرنا ہی تھا۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"تمہاری بیوی ہو گی مگر اس خاندان کی بہو کا درجہ اسے کوئی بھی نہیں دے گا۔"

"اس بات کی کوئی ایسی اہمیت بھی نہیں ہے میری یا اس کی نظر میں...... اگر وہ اس گھر میں رہ رہی ہے تو یہی حیثیت ہے اس کی کہ وہ اس گھر کی بہو ہے...... پاپا کے خاندان میں تو ویسے بھی اتنا تعصب ہے میرے اور امرت کے معاملے کو لے کر کہ میں خود بھی اس خاندان کے سامنے اور گاؤں میں بالخصوص نہیں لے کر جانا چاہتا اپنی بیوی کو۔ مما کے خاندان والے میرے جذبات کو سمجھتے ہیں اس لیے۔"

"وہ اس لیے تمہارے جذبات کو سمجھتے ہیں کہ تمہیں تمہاری ماں نے ساری عمر ہمارے خاندان کے خلاف بھڑکایا ہی تو ہے اور اپنے خاندان کی تعریفیں کر، کر کے تم لوگوں کو یہ جتلایا ہے کہ ہم تم سب کے مخالف ہیں۔"

"بہتر ہو گا کہ تم اپنے منہ سے امرت کا نام نہ لو...... اگر تم نے گاؤں آنا ہے اپنے بھائی کی میت کے ساتھ تو خاموشی سے وہاں صرف اس وقت تک رہنا جب تک تم رہنا چاہو۔" کبیر بھائی نے کہا۔ "رہی بات خاندان کی تو اگر تم لوگ رابطہ رکھنا چاہو گے تو تمہاری مرضی، ہمیں تمہارے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" کبیر بھائی نے بات مکمل کی اور پھپھو کو اپنے ساتھ پکڑ کر باہر لے گئے۔

☆☆☆

شامیر کو چھٹی نہ مل سکی تھی مگر اس کی کال آئی تو وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا، فون سب سے پہلے میں نے ہی اٹھایا تھا۔

"پتا ہے امرت، وہ میری وردی پر ہاتھ پھیر، پھیر کر دیکھتا تھا، جب میں پہلی بار ان کے گھر آیا تھا تو...... میں تو اس کی باتیں سن کر حیران رہ گیا جب اس نے مجھ سے کہا کہ شامیر بھائی آپ اتنے خوش قسمت ہیں کہ آپ ہر وقت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیتے ہیں۔ جیسی موت آپ کو نصیب ہو سکتی ہے اس کی خواہش میں تو لوگ مرتے ہیں۔ میں اس کی بات سن کر بہت ہنسا تھا، اس سے کہا کہ ابھی وہ بچہ ہے، وہ چاہے تو ایسی وردی وہ بھی پہن سکتا ہے...... اس پر کہنے لگا کہ میرے ایسے نصیب کہاں۔"

"وہ بہت جلدی، جلدی سب کچھ کرنا چاہتا تھا، شامیر۔" میں سسکی۔ "جب سے اس کا رجحان مذہب کی طرف ہوا تھا وہ بہت بدل گیا تھا، اس کے چہرے پر ایک الوہی سی روشنی نظر آتی تھی مجھے...... اس کے چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ اپنی سادگی اور معصومیت میں اتنی بڑی سازش کا شکار ہو گیا۔ اس تبدیلی کے بعد جتنا عرصہ بھی جیا اس کی روش ہی بدل گئی تھی، اچانک وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار لگنے لگا تھا، مجھ سے بھی یوں برتاؤ کرتا جیسے وہ مجھ سے بڑا ہو گیا ہو، اس کا وجود ایسا بے ضرر تھا، چاچو کے باقی بچوں کے برعکس شروع سے ہی وہ کسی بات کی ضد نہیں کرتا تھا...... اپنے گھر میں سب سے مختلف تھا وہ۔ صرف ایک بار ہی اس نے چاچو سے ضد کی کہ وہ تبلیغ کے لیے ساؤتھ افریقہ جانا چاہتا تھا، چاچو کے منع کرنے کے باوجود وہ رکا نہیں۔" مجھ سے اس کے بعد بولا ہی نہیں گیا۔

"اس کی موت اسے کھینچ رہی تھی امرت...... اس کی شہادت کی خواہش جو پوری ہونے جا رہی تھی، اسی لیے اس کی منزل اسے بلا رہی تھی۔"

"تم اس کی موت کو شہادت کہہ رہے ہو شامیر......؟"

"اپنی دانست میں تو وہ تبلیغ کے لیے ہی گیا تھا ناں میری بہنا، یہی اس کا مقصد تھا اور اسی کی خاطر وہ گیا تھا، اس کے ساتھ جو بھی ہوا، وہ کرنے والے اور تھے! اس کی سزا انہیں اس دنیا میں ضرور ملے گی انشاء اللہ۔ اس جیسے معصوموں کو اپنے گھناؤنے عزائم میں آلۂ کار بنانے والے جس کمائی سے اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں وہ حلال تو نہیں...... اور حرام رزق کے ثمرات انہیں اسی دنیا میں دیکھنا ہوں گے، حرام کا نوالہ اپنی اولاد کو کھلا کر آپ اپنی دنیا اور عاقبت دونوں بگاڑ لیتے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو جائے...... یوسف تو واپس نہیں آ جائے گا ناں شامیر بھائی۔"

"اس کے حق میں یہ دعا کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ اسے شہید کا درجہ عطا کرے، یہ اس کی خواہش تھی۔" شامیر نے کہا۔

"میں کوشش کر رہی ہوں مگر میرے دل کو قرار ہی نہیں آ رہا۔"

"وقت لگتا ہے سنبھلنے میں اور یہ تو بہت بڑا صدمہ ہے، اس پر چاچو کی طرف سے پریشانی۔" ان کے کہنے پر میں سسک اٹھی۔

"تم... ان کے لیے دعا کرو بھائی، انہیں کچھ نہ ہو، میں کیسے رہوں گی ان کے بغیر...... ابو جان کے بعد وہ میرا باپ جیسا سائبان ہیں۔"

"اللہ کرم کرے گا، تم اُن کے لیے بھی دعا کرو...... میں بھی کرتا ہوں۔" مجھ سے بات کر کے شامیر...... نے مختصر

کی بات زین سے کی اور اس کے بعد امو جان اور کبیر بھائی سے۔
تدفین کے اگلے دن ناشتے سے پہلے ہی زین ایک گاڑی لے کر واپس چلا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد حسن اور عارب بھی تیار کھڑے تھے۔ کسی نے انہیں روکا نہیں، انہیں روکنے کا کسی کے پاس کوئی جواز ہوتا نہ ہوتا مگر ان کے پاس لوٹ جانے کے لیے ان کے ماں اور باپ دونوں کی حالت کا جواز موجود تھا۔

☆☆☆

''کیا پروگرام ہے تمہارا، رہو گی کچھ دن یہاں گاؤں میں؟'' تمنا اور مہر پھپھو کی باقی فیملی اس روز واپس جا رہی تھی۔ ہم دونوں بہنوں کو تو اس ہنگامے میں واقعی مل بیٹھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا تھا۔
''میں آج شام کو ہی واپس چلی جاؤں گی، میں نے یہاں کس لیے رکنا ہے، وہاں چاچو کی حالت کے پیش نظر مجھے بہت پریشانی ہے۔ اللہ کرے کہ انہیں کچھ نہ ہو، تمنا تمہاری حالت ایسی ہے، تم ان کے لیے بہت دعا کرنا۔''
''ہم بھی کل قل کے بعد واپس چلے جائیں گے لاہور، یثاق کی چھٹی ختم ہو گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تمہیں علم ہے کہ کبیر بھائی تمہیں مستقل گاؤں واپس لانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟''
''تمنا مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں مگر وقت ہی نہیں ملا......'' اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تمہیں بتانا تھا کہ چاچو نے میرے لیے کس کس محاذ پر کیا، کیا جنگ لڑی ہے، میرے مفاد کے لیے انہوں نے اپنی اولاد کے مفادات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔'' میں رکی۔ ''اب جبکہ چاچو کی حالت ایسی ہے میں انہیں تنہا چھوڑ کر یہاں کیونکر آ سکتی ہوں؟''
''کچھ بتایا تھا مجھے امو جان نے......ان کی باتیں سن کر اور کچھ حالات کو دیکھ کر مگر اب اندازہ ہوا ہے کہ تمہارے لیے گھر لینے اور کاروبار میں سے تمہیں حصہ دینے میں کافی حد تک اس میں ان کی غرض بھی تو شامل ہے......''
''کیا! کس بات میں ان کی غرض شامل رہی ہے؟'' میں اس کے سفاکانہ الفاظ سے واقعی دکھی ہوئی تھی۔
''جیسے تمہیں اپارٹمنٹ لے کر دیا تھا اور اس میں ان کی اصل غرض یہ تھی کہ ان کی نواسی کو بھی تم اپنے پاس رکھو، پالو، اپنا دودھ پلاؤ۔''
''تم یوں سوچتی ہو چاچو کے بارے میں یا امو جان نے یہ سب کہا ہے تم سے؟'' میں حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔
''امو جان......انہوں نے تو مجھے کچھ نہیں کہا۔''
''تو پھر کس نے کہا تم سے کہ زائنہ کی بیٹی میرے پاس رہتی ہے؟'' میں نے اپنی حیرت کو سوال میں بدلا۔
''میں نے خواب دیکھا تھا۔'' اس نے کہا تو مجھے اس کے مذاق پر ہنسی بھی نہ آئی۔
''تم نہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ۔'' میں نے ناراضی سے کہا۔
''اچھا منہ نہ پھلاؤ...... مجھے شامیر...... نے بتایا تھا کہ اس نے تمہارے ہاں......'' اس نے پھر پوری تفصیل بتائی۔ ''وہ تب سے متجسس تھا کہ تمہارے پاس اتنا سامان کسی ایسی بچی کا کیسے ہو سکتا ہے جو اپنی ماں کے ساتھ رہنے کے لیے آئی ہو اور یہ کہ اگر ماں اس کے سامان میں سے کچھ لے کر جانا بھول گئی ہو گی تو کیا وہ اتنا ہو گا کہ اس سے تمہارے ایک کمرے کی الماری بھری ہوئی ہو گی۔''
''ہوں......'' میں نے گہری سانس لی۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ فوجی بڑے سادہ لوگ ہوتے ہیں مگر......''
''کیا تم اصل میں کہنا چاہتی ہو کہ فوجی بے وقوف ہوتے ہیں؟'' اس نے ہونٹ کا کونہ دبا کر ہنسی کو روکا۔
''ہرگز نہیں......میں اپنے بھائی کو بے وقوف قطعی نہیں سمجھتی، سوچا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن ہو گیا ہو گا۔''
''امو جان سے تین دن پہلے بات ہوئی تھی اور انہوں نے بتایا کہ وہ زائنہ کی بیٹی کو سنبھال رہی تھیں کیونکہ ارسل بھائی جاتے ہوئے اسے چھوڑ گئے تھے۔ اسے گاؤں بھی ساتھ لے کر آنا پڑا اور میں جواب تک اس معمے کا حل نہ پا رہی تھی۔ فوراً اس بات کی تہہ کو پہنچ گئی کہ جس بچی کا سامان تمہارے ہاں ہو گا وہ زائنہ کی بیٹی بچی ہی ہو گی جسے تم نے اپنا دودھ

بھی پلایا تھا شروع میں۔''
''اب بھی پلا رہی ہوں۔'' میں نے اس کی بات کے اختتام پر کہا۔
''کیا؟'' وہ چیخی۔ ''تم مذاق کر رہی ہو ناں؟''
''نہیں تو......''
''اسی لیے تمہاری یہ حالت ہو رہی ہے......صحت دیکھی ہے اپنی۔''
''مجھے اس کا کوئی مسئلہ نہیں......تم چاہو تو تمہارے بچے کو میں دودھ پلا دوں گی ان دونوں کے ساتھ۔'' اپنی بات کے اختتام پر مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے بہت بھونڈی بات کر دی تھی۔ میں نے سہم کر کہا۔ ''اللہ نہ کرے......اللہ تمہیں سلامت رکھے اور تم اپنے بچے کو خود دودھ پلاؤ۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔
''ارے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......مذاق میں سب چلتا ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔
''ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا پیاری......کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔''
''اچھا مجھے بتاؤ کہ کب تک رہے گی یہ ارسل کی بیٹی بچی تمہارے پاس؟'' اس نے موضوع تبدیل کیا۔
''بچی صرف ارسل بھائی کی بیٹی نہیں ہے بلکہ زائنہ کی بھی ہے......اسی وجہ سے چاچو اس کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور چاچو کا خیال تھا کہ وہ زیبا چچی کو کبھی نہ کبھی تو قائل کر ہی لیں گے......'' میں نے جواباً کہا۔ ''بس اسی وقت تک وہ چاہتے تھے کہ میں اسے اپنے پاس رکھوں۔''
''اللہ کرے، چاچو جلد ٹھیک ہو جائیں، ان کے گھر میں سب لوگ تو اتنے بے رحم اور بے حس ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس بچی کو اپنانے کو تیار نہیں ہو گا۔''
''نہیں اپنائیں گے تو اس بچی کا باپ تو ہے ہی، وہ بھی شادی کر لیں گے اور ان کے لیے بچی کو سنبھالنا آسان ہو جائے گا۔''
''اگر ان کی بیوی اس بچی کو رکھنے پر آمادہ نہ ہوئی تو؟''
''تو میں رکھ لوں گی اسے......''
''تم کیوں رکھو گی اسے......کیا تم نے ساری زندگی یونہی گزارنی ہے، تم نے شادی نہیں کرنی؟'' اس نے خفگی سے سوال کیا۔
''تو اور کیا کرنا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے ساتھ، شادی اب میرے ہاتھ کی لکیروں میں نہیں ہے۔ میری زندگی کا مقصد اب صرف حبیب کی پرورش ہے پیاری۔'' میں نے وثوق سے کہا۔
''یہ بھی تو ہو سکتا ہے ناں کہ تم......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رکی۔
''کیا؟'' میں نے اسے دیکھا۔ ''کیا ہو سکتا ہے؟''
''کچھ بھی نہیں......یونہی ایک خیال آ گیا تھا۔'' اس نے بات کو نامکمل چھوڑ دیا، میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کہتے، کہتے رکی تھی مگر میں کوئی قیافہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

یوسف کو دفن کرنے کے دو دن کے بعد اس کے قل کر دیے گئے تھے اور پھر سب اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ میں بھی ساجدہ اور دونوں بچوں سمیت واپس لوٹی تو اپنے ہی گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ واپس آتے ہوئے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا، میں نے اب ہمت کر کے خود ہی ہر دوسرے دن اسپتال جانا شروع کر دیا تھا، چاچو کو دور سے دیکھ کر آ جاتی تھی۔ زیبا چچی کو اسی دن گھر منتقل کر دیا گیا تھا جس دن زین واپس آیا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے دو نرسوں کی گھر پر بارہ، بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ انہیں اب بھی زیادہ تر وقت مسکن دواؤں کے زیر اثر رکھا جا رہا تھا، ہوش میں آتیں تو ان کا جسم جھٹکے کھانے لگتا۔ یہ سب مجھے امو جان نے بتایا تھا اور انہیں بھی ظاہر ہے کہ میری پھپھو سے علم ہوا ہو گا۔

چاچو کب تک کومامیں رہنے والے تھے اس کا کسی کو علم نہ تھا اس لیے ہر کوئی خواہ مخواہ وہاں آ کر رش لگانے کے بجائے فون پر ہی ان کی خیریت دریافت کرتا رہتا۔ میں ایسے اوقات میں وہاں جاتی تھی جب مجھے علم ہوتا تھا کہ کوئی اور ان کے گھر سے اس وقت وہاں پر نہیں ہوگا۔ عارب یا حسنہ ہوتے تو مجھے فرق نہیں پڑتا تھا، زیبا چچی خود بستر پر تھیں، بس ایک زین کی وہاں موجودگی سے کترا کر رہی تھی۔ ایک دوبار ایسا ہوا کہ مجھے زین نظر آیا تو میں اندر نہیں گئی، اس وقت تک باہر بیٹھ کر انتظار کرتی رہی جب تک کہ وہ مجھے جاتا ہوا نظر نہ آیا۔ ایک بار میرا اس سے اس وقت کاریڈور میں سامنا ہو گیا جب میں چاچو کو دیکھ کر نکل رہی تھی، میں امید نہیں کر رہی تھی کہ اس وقت وہ آ سکتا ہے مگر وہ نظر آیا۔ مجھے بھی اس نے دیکھا مگر ہم ایک دوسرے کے پاس سے لاتعلقی سے دو اجنبیوں کی طرح گزر گئے، حقیقت بھی تو یہی تھی، اب ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبیوں سے بڑھ کر دشمنوں کی طرح تھے۔ انسانوں کے اس سمندر میں انسان کس طرح قریب ترسے دور ترین ہو جاتا ہے......

چاچو کو یوں ہوش وحواس سے بیگانہ دیکھنا بذاتِ خود ایک تکلیف دہ تجربہ ہوتا تھا، ان کے چہرے پر کوئی تاثر ہوتا تھا نہ جسم میں کوئی حرکت۔ چونکہ ان کی حالت کافی نازک تھی اس لیے ڈاکٹروں نے باہر سے آنے والے ہر شخص پر پابندی لگا رکھی تھی کہ کوئی اندر نہیں جا سکتا تا کہ وہ انہیں کسی بیماری کے جراثیم منتقل نہ کر دے۔ میں جب بھی آتی تو ظاہر ہے دونوں بچوں کو ساجدہ کے پاس چھوڑ کر آتی تھی۔ ارسل بھائی واپس لوٹ کر آئے تو مجھے پیغام بھیجا کہ وہ واپس آ گئے ہیں اور اگر میرے لیے مشکل ہو تو وہ بچی کو واپس لے جائیں، ان کے والد گھر آ گئے تھے اور اب وہ آیا پر نظر رکھ سکتے تھے۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھنے کی ذمے داری اٹھائی تھی تو انہیں کہہ دیا کہ مجھے پہلے کی طرح اسے اپنے پاس رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، تاہم اگر وہ اپنی بیٹی کو کسی وقت ملنا چاہتے ہوں تو پیشگی بتا کر بے شک مل لیں۔ مجھے پیغام بھیجیں تو میں انہیں بتا سکوں گی کہ وہ کس وقت آ سکتے ہیں...... اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ جب وہ پوچھیں گے تو میں انہیں ایسا کوئی وقت بتاؤں گی کہ جب میں خود گھر پر نہ ہوں۔

اردگرد سے جو باتیں کانوں میں پڑ رہی تھیں اور اس روز تمنا کی نامکمل بات بھی جو میں سمجھ چکی تھی اس کے بعد میرا ان سے فاصلہ رکھنا ازحد ضروری ہو گیا تھا۔ ہاں تنہائی میں میں سوچے بنا نہ رہ سکی تھی۔

☆☆☆

امو جان نے کال کی اور بتایا کہ ارسل بھائی نے ان سے بات کی تھی میرے بارے میں، ان سے کہا تھا کہ انہیں کوئی جلدی نہیں ہے...... یہ چاچو کی بھی خواہش تھی اور یہ کہ ایسا نہ صرف میرے اور ان کے لیے بلکہ بچی کے لیے بھی اچھا ہو جائے گا۔ امو جان کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گئی۔

''کب کی تھی یہ بات انہوں نے آپ سے؟'' میں نے سوال داغا۔

''جب میں تمہارے ہاں گئی۔'' امو جان نے نرمی سے کہا۔ ''مجھے تو اس میں کچھ برا نہیں لگا بیٹا...... گل کی بھی یہی رائے تھی کہ ارسل اچھا لڑکا ہے، عورت کے لیے ایسا چھپر مل جانا بڑی نعمت ہوتی ہے۔ زندگی تم نے یونہی تو نہیں گزارنی، تمہارا اپنا ہے اور اس کی بیٹی، دونوں بچوں کو ایک مکمل گھر مل جائے گا۔ دونوں کے مفادات ایک دوسرے سے ہوں گے تو تمہیں جوڑ کر رکھیں گے۔ تم آرام سے سوچو، جتنا چاہو وقت لو اور کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں نہ کرنا...... چاہو تو جن معاملات کے بارے میں تمہارے دل میں شکوک ہوں ان کی بابت ارسل سے بات بھی کر کے دیکھ لو۔ پہلے تم اسے زائنہ کے شوہر کی حیثیت سے جانتی تھیں، اگر تم اس کے اس سوال کا مثبت جواب دینا چاہتی ہو تو اسے اس نظر سے دیکھو...... چاہو تو اپنے لیے کسی طرح کی سیکورٹی مانگ لو...... گھر جائداد یا......'' امو جان بولے جا رہی تھیں کیونکہ اس طرف میں شاک کی حالت میں تھی اور کچھ نہ بول رہی تھی۔ ''تم کچھ بول نہیں رہیں؟'' بالآخر انہیں خیال آ ہی گیا۔

''میرے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے امو جان!'' میں نے ہولے سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد بھی ان کے نمبر سے کال آتی رہی مگر میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی گستاخی کی کہ جان بوجھ کر اپنی ماں کی کال نہیں اٹھائی۔

☆☆☆

ایک عجیب سا محاذ کھل گیا تھا...... میں جوں جوں سوچ رہی تھی، توں توں مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سب پلان بڑے عرصے سے تیار کر لیا گیا تھا اور چاچو غالباً اسی لیے چاہ رہے تھے کہ زائنہ کی بیٹی کو میں اپنے پاس رکھوں کہ اسے جواز بنا کر وہ مجھے ارسل سے شادی پر مجبور کر سکیں۔ اگرچہ چاہ بھی نہیں رہی تھی کہ اس بارے میں سوچوں مگر ان سوچوں سے پیچھا بھی نہیں چھڑا پا رہی تھی۔ ساری دنیا میرے بارے میں سوچ رہی تھی تو میں کیونکر نہ سوچتی۔ ہونہہ! ماں بن جانے والی ایک لمحے میں لڑکی سے عورت بن جاتی ہے اور مرد تو ہمیشہ لڑکا ہی رہے گا۔

چلتے پھرتے یہ سب باتیں میرے سر پر اتنی سوار ہو گئیں کہ سر میں ہر وقت ہلکا ہلکا درد رہنے لگا، طبیعت چڑچڑی رہنے لگی اور اس سارے چڑچڑے پن کا پہلا اثر بچی پر ہوا۔ میں نے اسے دودھ پلانا چھوڑا اور پھر گود میں لینا بھی چھوڑ دیا، اس کے سارے کاموں کی مکمل ذمے داری میں نے ساجدہ کو دے دی۔ وہ میری گود کی طلب میں میری طرف ہمکتی، توجہ نہ پا کر رونے لگتی تو میں ساجدہ سے کہتی کہ اسے باہر لے جائے یا اپنے کوارٹر میں۔

''امرت باجی! بڑے صاحب کی بیماری نے آپ کو بھی چڑچڑا کر دیا ہے اور آپ کے لیے ان حالات میں اپنے بچے کی ذمے داری ہی کافی ہے، ارسل صاحب کو بتائیں کہ وہ اپنی بیٹی کو واپس لے جائیں تا کہ آپ کے سر سے کم از کم ایک ذمے داری تو کم ہو۔'' ساجدہ نے چائے کا کپ میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

''بچی کہاں ہے؟'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''میرے بچوں کے پاس ہے کوارٹر میں۔''

''اسے لے آؤ یہاں......'' وہ جا کر اسے لے آئی۔ میں نے چائے ختم کر کے اسے پکڑا۔ حبیب کمرے میں سو رہا تھا، میں نے بچی کو گود میں لے لیا، وہ میرے ساتھ چپک ہی تو گئی، میری آنکھوں سے نمکین چشمہ جاری ہو گیا۔ اس معصوم کو کیا علم کہ میں کس فیز سے گزر رہی تھی اور میرے دماغ کی منفی سوچیں مجھے اس کو نظر انداز کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ میں کس سے بات کرتی، کس سے مشورہ کرتی؟ سارہ سے بات کی تھی تو اس نے امو جان کی باتوں کی تائید کی تھی، اس کے خیال میں بھی میرے لیے اس سے بہتر کوئی اور آپشن نہ تھا۔

''اگر زین ذرا سا بھی اچھا ہوتا تو میں تمہیں کہتی کہ ارسل سے شادی کر کے دیکھ لو، نہ نبھی تو اسے بھی چھوڑ دینا، حلالہ بھی ہو جاتا اور تم زین کے پاس پلٹ جاتیں...... مگر ان حالات میں ارسل سے زیادہ مناسب کوئی اور شخص نظر نہیں آتا۔'' یہی ایک بات تو میں سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس کی زندگی کی یہی کہانی تھی مگر ہر شخص کے مسئلے کا مختلف حل ہوتا ہے، اس لیے اس دن کے بعد سے اس سے بھی بات نہیں کی تھی۔

سب ہم خیال بن گئے تھے تو میرا دل چاہا کہ کوئی تو ہو جو میرے دماغ سے سوچے، کون ہو سکتا تھا ایسا جو مجھے جانتا ہو اور بہتر مشورہ دے سکے۔ کم از کم مجھے اس قنوطیت سے نکالے کہ جس کی وجہ سے مجھے سب اپنے دشمن لگ رہے تھے۔ شامیر اور تمنا میرے لیے دو ایسے ہی دوست اور مشیر تھے، سارہ نے تو حق دوستی ادا کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ امو جان کی سوچ بہت اچھی تھی۔ تمنا کا بھی یہی خیال تھا کہ مجھے تمام عمر اسی طرح تو نہیں گزارنا تھی اور ارسل دیکھا بھالا اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ شامیر کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ کب آ سکتا ہے، اسے ابھی چھٹی نہیں مل سکتی تھی، میرے اندر غبار بڑھنے لگا تھا۔

''مم...... مم۔'' بچی کے منہ سے نکلنے والی آوازوں نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں چند دنوں سے حبیب کی ایسی آوازوں سے اس پر صدقے واری جاتی تھی مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ اب بچی بھی ایسی ہی پیاری آوازیں نکال رہی ہوگی۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس کی جوابی مسکراہٹ نے مجھے اندر سے سرشار کر دیا۔ وہ میرا خون تو نہیں تھی مگر اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا تھا اس کا ناتا جسمانی طور پر مجھ سے بھی تھا اور اس نے میرے دودھ پر ابتدا سے پرورش پائی تھی

تو اس کے ساتھ کشش محسوس ہونا قدرتی امر تھا۔

☆☆☆

"میں پنکی کو لینے آیا ہوں۔" وہ بغیر اطلاع کے آ گئے تھے۔

"اچھا..... وہ کیوں؟" میں نے کھوئے ہوئے انداز سے پوچھا۔

"آپ پر بہت بوجھ ہے اس کا، ساجدہ سے اس کی خیریت پوچھنے کے لیے کال کی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ آپ اپنے چاچو کی وجہ سے پریشان ہیں اور اکثر بیمار رہتی ہیں..... دو بچوں کی دیکھ بھال بہت بڑی ذمے داری ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ پر سے پنکی کا بوجھ تو ہٹا دوں۔"

"وہ ایسی کوئی بات نہیں..... "دل میں سوچا کہ اچھا ہوا کہ مجھے نہیں کہنا پڑا مگر اوپر سے مروتاً منہ سے ایسا جملہ نکل گیا۔

"چھوٹے صاحب چائے لیں گے آپ؟" ساجدہ نکل ہوئی۔

"اگر بن رہی ہے تو پی لوں گا..... "انہوں نے حسب عادت مسکرا کر کہا۔ "امرت پی رہی ہوں گی یقیناً۔"

"نہیں ساجدہ..... میں چائے نہیں لوں گی۔" میں نے فوراً کہا۔ میں چاہ رہی تھی کہ اگر انہیں جانا ہے تو پنکی کو لے کر فوراً چلے جائیں..... اس سے قبل کہ میرے دماغ میں کوئی اور ابال اٹھے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں ناں امرت؟"

"جی، میں بالکل ٹھیک ہوں، ذرا تھک گئی ہوں۔" میں نے نظر اخبار پر جما دی۔

"آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں..." وہ تو جان ہی نہ چھوڑ رہے تھے، میں ان کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھی۔

"میں پنکی کا سامان تیار کر دیتی ہوں۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ اس بات کا اشارہ بھی تھا کہ مجھے ان کا یہاں آنا مناسب نہیں لگا تھا اور میں ان کے پاس یوں تنہا نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ کافی دیر کے بعد میں نے ساجدہ کو کمرے سے ہی آواز دی۔ اس نے پنکی کا سامان لے جا کر لاؤنج میں رکھا اور اس کے بعد سوئی ہوئی پنکی کو اٹھا کر باہر لے کر چلی تو میں اس کے ہمراہ ہولی۔

"میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں امرت۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" میں نے ساجدہ کی گود میں اٹھائی ہوئی پنکی کو پیار کر کے اللہ حافظ کہا اور ساجدہ نے پنکی انہیں تھما دی۔ "ساجدہ یہ سامان ارسل صاحب کے ساتھ جا کر اُن کی گاڑی میں رکھ دو۔"

"جی۔" ساجدہ نے سامان اٹھایا، ارسل نے گاڑی کی چابی اسے دے دی، وہ سامان لے کر باہر گئی۔

"لگتا ہے آپ کو میری درخواست بری لگی ہے امرت؟" ایسا کایاں بھی شاید ہی کوئی ہو گا۔

"کون سی درخواست؟" میں نے بے وقوفی میں بھولپن کی اداکاری کرنا چاہی۔ جانتے ہوئے بھی کہ میری اداکاری کے جوہر کتنے برے ہیں۔

"آپ جانتی ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اسی طرح جس طرح میں جانتا ہوں کہ آپ کی طبیعت کے خراب ہونے کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ میری طرف سے آپ کی امو جان کو پیش کی گئی درخواست ہے۔"

"آپ جائیں ابھی پلیز..... "مزید بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی میں۔

"میں اتنا برا انسان نہیں ہوں امرت..... نہ ہی اس درخواست میں میری کوئی غرض شامل ہے، میں آپ کو دل سے۔"

"ارسل بھائی!" میں نے لفظ بھائی پر زور دیا۔ "آپ جائیں پلیز۔" کہہ کر میں رکی نہیں بلکہ اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ باہر سے ان کے قدموں کی آواز بھی آئی اور بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی بھی، تب بھی میں باہر نہیں نکلی بلکہ حبیب کے ساتھ لیٹ گئی۔

فون پر روشنی سی جگمگائی، میں نے اسے اٹھا کر دیکھا، شامیر کا پیغام تھا..... "ابھی تو چھٹی پر آنے کے کوئی آثار نہیں، کم از کم ایک ماہ تک، سب خیریت تو ہے ناں؟"

"ہاں سب خیریت ہے..... "میں نے جواب لکھا۔ اسے اور کیا لکھتی، میری بات انتہائی اہم سہی مگر میں فون پر اس سے یہ بات نہیں کر سکتی تھی۔

"چاچو کیسے ہیں؟" سوال آیا۔

"ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔" اسے جواب بھیج کر میرا دل بھر آیا اور آنسو بہہ نکلے۔ جانے یہ آنسو کس بات کے لیے تھے مگر میں نے انہیں بہہ جانے دیا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔

☆☆☆

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اسی ہفتے کے اندر، اندر میرا بچہ دنیا میں آ جائے گا۔" تمنا نے خوشی سے چہکتے ہوئے بتایا۔ "تو میں نے سوچا کہ خالہ جان سے پوچھوں کہ وہ کب تشریف لا رہی ہیں؟"

"آ جاؤں گی جب میرا بھانجا آ جائے گا اور کال کر کے کہے گا کہ خالہ جان آ جائیں۔"

"کتنی کٹھور ہو تم..... تمہیں پتا ہے کہ سب لوگ موجود ہیں، امو جان بھی آ جائیں گی مگر میرا دل چاہتا ہے کہ اس مشکل مرحلے پر تم میرے ساتھ ہو تیں، اسی طرح جیسے میں تمہارے ساتھ تھی۔"

"کوشش کروں گی پیاری..... وعدہ نہیں کرتی، چاچو کی پریشانی بھی ہے اور اپنی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔"

"کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"بس چاچو کی طرف سے ہی سوچ، سوچ کر پریشانی کی وجہ سے سر میں ہلکا، ہلکا درد رہتا ہے۔"

"تم کیوں اس بات کی اتنی ٹینشن لیتی ہو امرت؟" اس نے کہا۔ "تمہارے پریشان ہونے سے کیا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، امرت دنیا سے چلے جانے والوں اور زندگیوں سے کچھ لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی تو زندگی چلتی رہتی ہے....."

"جانتی ہوں تمنا مگر اب ہمت نہیں ہے کچھ کھونے کی، میں نے بہت کچھ کھو کر بھی زندگی کو گزارنا سیکھ لیا تھا مگر اب نہیں ہے اتنا حوصلہ!" میں سسکی۔

"اچھا پریشان ہونا چھوڑو، بتاؤ کب آنے کا پلان ہے، میں یثاق سے کہتی ہوں کہ تمہاری ٹکٹ کروا دے، بائی ائیر آ جاؤ یا پھر گاڑی لے کر آ جائے وہ تمہیں لینے۔" اس نے پیش کش کی۔

"تم خیر کی خبر سناؤ..... میں فوراً پہنچ جاؤں گی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"چلو، جو نہی میں اسپتال کے لیے روانہ ہوں گی، یثاق سے کہوں گی کہ تمہیں اطلاع کر دے۔"

"بالکل ٹھیک رہے گا یہ۔"

☆☆☆

"امرت آپ سے ملنا چاہتا ہوں..... "ارسل کا پیغام آیا تھا۔ "پلیز مجھے کچھ وقت دیں۔"

"میں چاچو کی وجہ سے پریشان بھی ہوں اور مصروف بھی۔" ان کا پیغام ملنے کے لگ بھگ چھ گھنٹے کے بعد میں نے جواب دیا۔

"ایک دن میں سے دس منٹ نکالنا کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں۔"

"ارسل بھائی، آپ کو جو کچھ کہنا ہے وہ فون پر بتا دیں، اگر اس میں کوئی ایسی بات ہوئی جس کا جواب میں نہ دے سکی تو....." میں نے پھر خاصی دیر سے جواب دیا تھا۔

"فون پر ایسی بات نہیں ہو سکتی، کچھ اہم معاملات ہیں جو آپ سے ملاقات پر ہی کہے جا سکتے ہیں، یقین مانیں کہ میں اپنی درخواست کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا اور نہ مجھے آپ کی طرف سے جواب کی جلدی ہے۔"

"میں کوشش کرتی ہوں کہ وقت نکال سکوں..... مجھے لاہور جانا ہے، واپس آ کر بتاؤں گی۔" میں نے فوراً جواب بھیجا تھا۔

''جلد ملنا ضروری ہے امرت۔'' جواب آیا۔ ''کہیں باہر کافی پر ملتے ہیں، آپ کے لاہور جانے سے پہلے، پہلی فرصت میں۔''

''باہر نہیں......''

''گھر پر بات نہ ہو سکے گی، ساجدہ کی وجہ سے، بات بہت اہم ہے، آپ کے چاچو کے حوالے سے۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے جواب بھیجا۔ بات چاچو کے حوالے سے تھی تو میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے اسی وقت ایک کافی ہاؤس کا بتایا اور میں نے ساجدہ سے ضروری سودے کی خریداری کا بہانہ کیا اور حبیب کو سلا کر اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر نکل گئی۔

☆☆☆

''مجھ سے زیادہ آپ کے چاچو ایسا چاہتے تھے امرت، میں کوئی لالچی یا خود غرض انسان نہیں ہوں، اوپر سے میری ذات کے حوالے سے اس گھر میں جو کیچڑ آپ پر اچھالی گئی تھی اس کا مجھے بہت دکھ تھا اور میں اس وقت بھی آپ کی خاموش التجاؤں اور بددعاؤں کو سن سکتا تھا......''

''میں نے کسی کو بددعا نہیں دی ارسل بھائی۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''جس نے جو کچھ بھی سوچا یا کیا وہ سب ان کا ظرف تھا، میں کیا بددعا دیتی ان کو......''

''ظلم کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور بعد از اں بھی...... انہوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، مجھے قاتل تک کہہ دیا ساری دنیا کے سامنے اور بھرے ہوئے گھر میں میری بے عزتی کی، مجھے اپنی بیوی کا جنازہ تک نہیں پڑھنے دیا۔'' وہ انکشافات کر رہے تھے۔ ''اب ان سے کوئی پوچھے جا کر کہ کیا یوسف کو بھی میں نے قتل کیا ہے اور انکل اور آنٹی کو اس حالت تک بھی میں نے پہنچایا ہے؟''

''آپ نے چاچو کے بارے میں کچھ کہنا تھا ارسل بھائی؟'' میں نے فون اٹھا کر اس پر وقت دیکھا۔

''یہ چاچو کے وکیل نے مجھے بھیجا ہے......'' انہوں نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا۔

''کیا ہے اس میں؟'' میں نے لفافے کو دیکھا، تھاما نہیں۔

''کھول کر پڑھیں۔'' میں نے ان کے کہنے پر لفافہ کھولا اور اس میں رکھے کاغذوں کی تہ کو کھولا، اندر بڑے سائز کے دو کاغذات تھے جو کہ آپس میں نتھی تھے۔ ان کی تہ کو کھولا، کسی لا فرم کے لیٹر ہیڈ پر ٹائپ کیے ہوئے کاغذات تھے...... سر اٹھا کر ارسل کو دیکھا۔ ''پڑھیں پلیز۔''

''میں بعد میں تسلی سے پڑھ لوں گی۔'' باریک چھپائی والے ان کاغذات کو پڑھنے میں وقت لگتا۔

''کوئی بات نہیں آپ بے شک تسلی سے پڑھ لیں۔ یہ بہت اہم دستاویزات ہیں یہ اصل کاغذات ہیں اس لیے ان کو سنبھال کر رکھنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کاغذات کو اسی طرح تہ کر کے واپس لفافے میں ڈالا اور انہوں نے ویٹر کو بل لانے کو کہا۔ میں اٹھ کر انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

''خوشی ہوئی تمہیں ارسل کے ساتھ خوش دیکھ کر...... تم پہلے بتا دیتیں تو میں تب بھی کوئی اعتراض نہ کرتا۔'' گھر پہنچ کر بیگ سے فون نکالا تو اس پر کسی گمنام نمبر سے پیغام آیا تھا مگر کوئی بے وقوف سے بے وقوف شخص بھی جان جاتا کہ کس کا پیغام تھا۔ جانے اس نے کس وقت ہمیں اس کافی ہاؤس میں دیکھا تھا۔

☆☆☆

''میں جمال احمد ولد نور احمد، شناختی کارڈ نمبر...... اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ پیغام ارسل کامران کے لیے اپنے وکیل سے لکھوا کر اسے ایک دستاویز کی حیثیت سے رجسٹر کروا رہا ہوں۔ میری وفات کی صورت میں یہ دستاویز

میری وصیت کا حصہ ہوگی تاہم میرے وکیل کے لیے لازم ہے کہ وصیت کے رجسٹر ہونے کے بعد، اس حصے کی ایک کاپی علیحدہ سے ارسل کامران کو بھجوائے جو کہ میری مرحومہ بیٹی زائنہ جمال کے شوہر کی حیثیت سے میرا داماد اور میری نواسی 'پرنیاں' کا باپ ہے۔

ا۔ میں اپنی جائداد میں سے اپنی بیٹی زائنہ کا قانونی اور شرعی حصہ اپنی نواسی پرنیاں کے نام کرتا ہوں۔ یہ حصہ اس کے بالغ ہونے کے بعد اسے ملے گا لیکن اس کی ملکیت تب تک میرے داماد، ارسل کامران کے نام ہوگی۔ اس تمام رقم کو وہ اپنے کاروبار میں لگا سکتا ہے اور پرنیاں کے حصے کی مد میں ہونے والے منافع اس کے نام پر کھولے گئے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ پرنیاں کا اکاؤنٹ کھولنے اور اس کے اکاؤنٹ میں اس کی رقم جمع کرانے کی ذمے داری ارسل کامران پر ہوگی۔ اس رقم کو اپنے کاروبار میں وہ نفع اور نقصان کی بنیاد پر رکھے گا نہ کہ اس پر سود کی کوئی شرح مقرر ہوگی۔

ب۔ میری خواہش ہے کہ...... میری بھتیجی اور سابقہ بہو امرت کمال، اپنے بیٹے حبیب اللہ اور میری نواسی پرنیاں کے بہترین مفاد کے لیے ارسل کامران سے عقدِ ثانی کر لے۔ جس طرح کے حالات ہیں، اس میں، میں ارسل کامران کو اس کے لیے بہترین انتخاب پاتا ہوں۔ اگر وہ میری خواہش کے احترام میں ایسا کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو وہ ابھی سے میری جائداد میں سے میری نواسی کے حصے کی کل مالک ہوگی۔ اس رقم کو یا اس پر آنے والے منافع کو فوری طور پر بھی وہ جب چاہے اور جیسے چاہے استعمال کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ اس کی صوابدید پر ہوگا کہ وہ اس رقم کو ارسل کامران کے ساتھ کاروبار میں لگانا چاہے گی یا اس کا کوئی اور مصرف اس کے پاس ہے۔

پ۔ اگر وہ بخوشی ارسل کامران سے نکاح کرنے پر آمادہ ہو تو وہ اپنے لیے نکاح کی جو چاہے شرائط ارسل کامران سے منوا سکتی ہے۔ اس سے اس کی جائداد میں سے کچھ بھی بطور حق مہر اپنے لیے لکھوا سکتی ہے حتیٰ کہ میری نواسی کا کل حصہ بھی اپنے نام لکھوا سکتی ہے۔

ت۔ اگر کسی وجہ سے ان دونوں کے بیچ رشتہ نہ نبھایا جا سکے تو بھی ارسل کامران حق مہر کے طور پر دی گئی کسی چیز کو واپس لینے کا مجاز نہ ہوگا، خواہ وہ کوئی نقد رقم ہو، جائداد یا زیورات، اس کے لیے شق کو پہلے سے طے کر لیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ امرت اس نکاح کا فیصلہ بہ رضا و رغبت کرے اور اس کے تحفظ کے لیے شرائط ایسی رکھی جائیں کہ اسے چھوڑنا آسان نہ ہو۔ پہلے جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے وہ آج تک میرے ضمیر پر بوجھ ہے، میں اس کا مداوا کرنا چاہتا ہوں، جس طرح بھی ممکن ہو۔

ٹ۔ اگر کسی ذاتی وجہ سے...... یا ارسل سے بہتر انتخاب کی صورت میں امرت کسی اور سے عقدِ ثانی کا ارادہ کرے تو میں اس سے درخواست کروں گا کہ وہ پرنیاں کو کسی قسم کے جذباتی دھچکے سے بچانے میں ارسل کی ہمیشہ مددگار رہے۔ یعنی اگر ارسل کسی اور سے نکاح ثانی کرتا ہے اور اس کی نئی بیوی کا رویہ پرنیاں کے ساتھ مناسب نہ ہو تو امرت، پرنیاں کے لیے ہمیشہ اپنا دل بڑا رکھے اور اس سے رابطے میں رہے۔ اسے جذباتی سہارا دے اور اس کی زندگی کے اہم فیصلوں میں کسی ماں کی طرح اس کی رہنمائی کرے۔

د۔ بلوغت کی عمر تک پہنچنے کے بعد پرنیاں اپنے لیے جو راستہ چننا چاہے، بسلسلہ تعلیم یا اپنی زندگی کے ساتھی کے انتخاب کے لیے تو اس کے لیے ارسل کامران اور امرت اس کے مشیر اور مددگار ہوں۔ چاہے ان کا آپس میں اس کے علاوہ اور کوئی تعلق نہ ہو کہ ایک پرنیاں کا حقیقی باپ اور دوسری اس کی رضاعی ماں ہے۔

ر۔ اگر کوئی اس خط اور اس کے مندرجات کو چیلنج کرے یا اس کی صحت سے انکار کرے تو میرے وکیل کے پاس اس کی دستخط اور انگوٹھے کے نشان کے ساتھ، رجسٹرڈ اور تصدیق شدہ کاپی موجود ہے۔ بہتر ہے کہ میرے بعد معاملات کو احسن طریقے سے سلجھایا جائے اور جن معاملات میں میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے ان پر بصد غور فیصلہ کیا جائے۔ میرے خاندان کے کسی فرد کی طرف سے دباؤ یا دھمکی کی صورت میں قانونی جنگ کا راستہ اختیار کیا جائے اور خواہ مخواہ کی

تو تکرار اور جھگڑے سے گریز کیا جائے۔"

میں نے گہری سانس لی...... حلق مجھے اپنے اندر اور بھی تنگ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کاغذات کو تہ کر کے واپس اسی لفافے میں ڈالا اور اپنے بیگ میں رکھ دیا۔ کسی وقت یہ کاغذات ارسل کو لوٹانا ہوں گے۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھی تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، زندگی میرے ساتھ کیا کر رہی تھی اور کیا کرنے جا رہی تھی۔ چاچو کے ہر عمل میں کیا واقعی اپنی نواسی کا مستقبل محفوظ کرنے کی نیت نہیں نظر آ رہی مجھے؟ ایسا ہی ہے، تمنا سچ کہہ رہی تھی اور امو جان کا بھی تو یہی خیال تھا...... میں سسک پڑی۔

اپنی شادی سے پہلے سے لے کر آج تک کی چاچو کی ساری شفقت، محبت، برتاؤ اور اچھائیوں پر خاک اڑنے لگی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ ان کے ہر عمل میں خود غرضی شامل تھی۔ میں نے تو انہیں ہمیشہ اپنے باپ جیسا ہی سمجھا تھا اور انہوں نے بھی بدلے میں مجھے ایسا ہی مان دیا تھا۔ اپنے بیوی اور بچوں پر میری رائے کو فوقیت دیتے تھے لیکن اب ایسی بدگمانی نے دماغ کا گھیراؤ کر لیا تھا کہ مجھے ان کے ہر عمل سے غرض کی بُو آنے لگی۔ انہوں نے اپنے بگڑے ہوئے بیٹے سے بیاہ کر میری زندگی کو بھی برباد کیا اور اس کے بعد اپنی بیٹی کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے اپنی نواسی کے لیے مجھے ماں بنانے کی کاوش کی اور اب یہ سب کچھ جو انہوں نے لکھا ہے...... اس پر بھی عمل کروں۔ گویا میں کوئی کٹھ پتلی ہوں جو اُن کے اشاروں پر ناچتی رہوں! دل سے درد اٹھا۔

میں نے ابو جان کی وفات کے بعد انہیں اپنا باپ سمجھ لیا اور انہوں نے حتی الامکان میرے ساتھ باپ جیسا ہی برتاؤ کیا تھا...... اپنی بیٹی کو مارنا کیا انہوں نے پلان کیا تھا جو میں ایسا سوچ رہی تھی؟ دماغ نے کہا۔ 'کیا انہیں کچھ ہو گیا تو تمہیں سکون حاصل ہو گا؟' اللہ نہ کرے کہ انہیں کچھ بھی ہو...... وہ ٹھیک ہو جائیں گے تو میں ان سے خود بات کروں گی کہ میں بھی ایک گوشت پوست کی بنی ہوئی انسان ہوں، جس کے پاس دل بھی ہے اور دماغ بھی۔ میرے پاس بھی کچھ خواہشات کی گٹھڑیاں اور ارمانوں کے انبار ہیں، میری زندگی کے ساتھ کافی کھلواڑ ہو گیا، اب مجھے اپنی زندگی اپنے انداز سے جینے دیں۔

"ارسل بھائی، میں صبح لاہور کے لیے روانہ ہو رہی ہوں، آپ کسی وقت میری غیر موجودگی میں آ کر ساجدہ سے اپنے کاغذات لے جائیں۔" میں نے انہیں پیغام بھیجا۔

"آپ نے پڑھ لیا؟" بے تابی سے سوال آیا تھا۔ میں نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور فون آف کر کے سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ نیند کسے آتی، سوچوں اور خیالات کا سیلِ رواں تھا جو دماغ کو سکون ہی نہیں لینے دے رہا تھا۔

☆☆☆

کوچ ابھی نصف راستے میں ہی تھی کہ میثاق کا پیغام آیا۔ "خالہ جان کب پہنچ رہی ہیں؟"

"کیا؟" میں خوشی سے چیخنے ہی والی تھی، اسے کیسے علم ہوا کہ میں راستے میں تھی۔ میں نے تو انہیں سرپرائز دینے کا سوچا تھا۔

"بھئی...... تمنا اسپتال جانے والی ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں۔ ساتھ ہی پوچھ لوں ہوا میں اُڑ کر آنا ہے یا میں آپ کے لیے خود شاہی سواری لے کر حاضر ہو جاؤں؟" اس نے فوراً پیغام بھیجا۔ اس سے پہلے اس نے کال کی مگر میں نے اس کی کال اٹینڈ نہیں کی، مبادا کہ اسے علم ہو جائے کہ میں سفر میں تھی۔ "کال کیوں نہیں اٹھا رہیں آپ محترمہ؟"

"میں کہیں باہر ہوں...... تھوڑی دیر میں بتاتی ہوں۔" میں نے اسے پیغام بھیجا۔ کوچ نصف راستے میں رکی تو میں نے نسبتاً ایک خاموش کونے کا انتخاب کیا اور اسے کال کی۔

"تمنا سے بات کرواؤ میثاق۔"

"وہ جا چکی ہے لیبر روم میں، اسی لیے تو کال کر رہا تھا کہ اسے آپ سے بات کرنا تھی۔"

"اوہو! چلو اللہ خیر کرے۔"

"تو پھر کیا پلان ہے؟"

"دیکھو...... بتاتی ہوں تھوڑی دیر میں۔" میں نے فوراً فون بند کر دیا کیونکہ کوئی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی اور ممکن ہے کہ اسے اندازہ ہو جاتا کہ میں کہاں ہوں... میں نے تحریم کو فون کر کے اسے اعتماد میں لیا اور اس سے کہا کہ اگر وہ ڈرائیور کے ساتھ آ کر مجھے کوچ کے اسٹیشن سے لے لے۔ چھوٹے بچے کے ہمراہ میں ٹیکسی میں تنہا جانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی اور پھر مجھے چونکہ اسپتال کی سمت کا اندازہ بھی نہ تھا تو ٹیکسی والا چاہے مجھے کسی بھی طرف لے جاتا، مجھے اندازہ نہ ہوتا۔

"مگر میری ایک شرط ہے......" تحریم خوشی سے چہک اٹھی تھی۔

"فرمایئے میڈم...... آپ شرطیں منوانے کی پوزیشن میں ہیں۔" میں نے بشاشت سے کہا۔ اپنے بھانجے کی آمد کی اطلاع نے مجھے پچھلی رات کی ساری سوچیں اور تلخیاں بھی بھلا دی تھیں۔

"آپ کو ہمارے پاس قیام کرنا ہو گا ملکہ عالیہ۔"

"بھئی یہ تو بڑی کڑی شرط ہے تحریم، تمہیں علم ہے کہ تمنا مجھے نہیں رکنے دے گی تمہارے ہاں۔"

"مگر وہ ایک دو دن تو اسپتال میں ہو گی ناں۔" وہ ٹھنکی۔

"سنو پیاری، جب تمہاری شادی کے لیے آؤں گی ناں تو سارے کا سارا وقت تمہارے پاس رکوں گی۔" میں نے اسے وعدے کی ڈور تھمائی۔

"میری شادی کے تو آثار ہی مدھم ہیں...... مما نے بڑی تگ و دو شروع کر رکھی ہے کامل بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھنے کی اور آج کل ان کی کافی تختی آئی ہوئی ہے۔ جگہ جگہ سے بھانت بھانت کے لوگ انہیں بھی دیکھنے آتے ہیں اور وہ اس پریڈ سے کافی تنگ ہیں اور مسلسل ٹال مٹول کر رہے ہیں......" اس نے بتایا۔

"مگر تمہاری شادی کی تاریخ تو مقرر ہو چکی تھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں مگر مما کے دل میں نیا سودا سمایا ہے اور انہوں نے میری سسرال میں بتا دیا ہے کہ شادی کچھ عرصے کے لیے التوا میں ڈال دی جائے......"

"اوہو، یہ تو بہت برا ہوا تمہاری ہنو کے ساتھ۔" میں ہنسی۔

"اچھا ہے امرت، سوچتی ہوں کہ اتنا دور چلی جاؤں گی مما اور پاپا سے...... خاندان بھر سے۔ جتنا عرصہ ماں باپ کے ساتھ گزر جائے وہی اچھا ہے۔"

"دل سے چاہے آئیں کل رہی ہوں۔" میری ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی۔

"میری بات کو گھماؤ مت...... بس میں تمہیں کوچ کے اسٹیشن سے لے لوں گی مگر تمہیں میرے پاس رہنا ہو گا، کم از کم دو دن اور دو راتیں۔" اس نے اٹل لہجے میں کہا۔

"اتنا وقت تھوڑا ہی رکنا ہے مجھے...... میں ایک رات کا وعدہ کرتی ہوں صرف۔" فون بند کر کے میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا، حبیب سو گیا تھا۔ دل کو خوشی ملی تو نیند بھی آنکھوں میں اترنے لگی۔

کامل کو کیسی لڑکی چاہیے تھی...... کون ہو گی جس کا وہ نصیب بنے گا! سوتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

ماں بھی تھی اور اس قبل پھپھو بھی تھی، ممانی کے عہدے پر بھی فائز ہوئی تھی مگر خالہ بننا ایک ایسا تجربہ تھا کہ دل کے اندر سے خوشی ہمک، ہمک کر باہر آ رہی تھی۔ امو جان اور کبیر بھائی بھی فاطمہ اور بچوں سمیت آ چکے تھے اور سب اسپتال میں جمع تھے۔ میری آمد سے قبل ہی ننھے میاں تشریف لا چکے تھے، مبارک باد کی آوازیں اور مٹھائی کی مہک سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جونہی میں وہاں داخل ہوئی تو تمنا سمیت سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے، کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی جلدی پہنچ گئی تھی۔

''تمہیں کیسے علم ہوا کہ میں......'' تمنا نے یہ جان کر سوال کیا کہ میں اس وقت نصف راستے میں تھی جب یثاق نے کال کی تھی۔

''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ناں پیاری۔'' میں نے اس سے لپٹ کر کہا تھا۔

''کیا خود گاڑی چلا کر آئی ہو؟'' تمنا نے سوال کیا۔

''نہیں کوچ پر آئی ہوں۔''

''وہاں سے کیا ٹیکسی پر آئی ہوتمہا؟'' امو جان نے حیرت سے پوچھا۔

''جی نہیں امنے کی ایک اور خالہ اور اس کے ماموں لے کر آئے ہیں اسے۔'' تحریم نے کامل کے ساتھ انٹری دی۔ وہ دونوں باہر ہی کھڑے تھے اور چاہ رہے تھے کہ پہلے میں تنہا اندر جاؤں اور سب کا ردعمل دیکھوں۔

''اچھا تو یہ تھا تمہارا ضروری کام؟'' یثاق نے کامل سے ملتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھا کہ پھپھو کے ساتھ حسب معمول کسی رشتہ پریڈ میں جا رہے ہو گے۔''

''ڈرائیور چھٹی پر ہے اس لیے تحریم کے ساتھ ڈرائیور کے فرائض سرانجام دینا آج کل میرے فرائض میں شامل ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''جب تم نے کال کر کے مٹھائی لانے کا کہا تو اسی وقت اس نے بتایا تھا امرت کے آنے اور اس کی آمد کو خفیہ رکھنے کا، اس لیے انکار کی گستاخی ہو گئی۔''

''اچھا ہی ہوا یار کہ تم نہیں آئے ورنہ اتنی مٹھائی کا کیا کرتے...... ممانی جان بھی ڈھیروں مٹھائی لے کر آئی ہیں۔''

''دیکھ لو، نہ آ کر میں نے تمہارا کتنا نقصان ہونے سے بچا لیا۔'' ان دونوں کی نوک جھوک جاری تھی۔ میں سب سے مل کر مبارک باد دے کر تمنا کے منے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔

''یہ مجھے اتنا پیارا کیوں لگ رہا ہے پھپھو؟'' میں نے مہر پھپھو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''کیونکہ تم اس کی ماسی ہو، 'ماں سی' ہوتی ہے ماسی یعنی خالہ۔'' انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''اور پھر تم تو خود اتنی معتبر ماں ہو جس کے دودھ پر دو، دو بچے بیک وقت پلے ہیں۔'' انہوں نے بہت آہستہ آواز میں کہا۔

''چلتے ہیں ہم پھر ماسی جی۔'' کامل نے اجازت چاہی۔

''چلو امرت، چلیں۔'' تحریم نے مجھ سے کہا، ساتھ ہی وہ سب کو ملنے لگی۔

''کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟'' فاطمہ نے سوال کیا۔

''امرت اس بار ہمارے پاس رکے گی۔'' تحریم نے کہا۔ ''اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔'' اس نے مان سے کہا۔

''کیوں امرت؟''

''وہ کیوں؟'' تمنا نے سوال کیا۔

''کیونکہ میں نے اس کا راز رکھا تھا اور اسے بس اڈے سے لے کر یہاں تک آئی ہوں، بھانجے سے ملوانے۔'' اس نے تنک کر کہا۔

''مجھے مما کو بھی لے کر آنا ہے، چلیں؟'' کامل نے تحریم سے پوچھا۔

''میں بعد میں آ جاؤں گی جب پھپھو کو واپس جانا ہو گا۔'' میں نے تحریم سے کہا۔ ''ابھی تم لوگ جاؤ۔'' وہ اس پر مطمئن ہو گئی۔

چند گھنٹوں کے بعد میں حبیب سمیت، حسب وعدہ پھپھو کے ساتھ ان کے گھر کی طرف گامزن تھی۔

☆☆☆

''امرت تم ہی اس پاگل لڑکے کو سمجھاؤ، شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے اور یہ کہیں من کو لگاتا ہی نہیں......'' راستے میں کامل نے گاڑی ایک آئس کریم پارلر کے پاس روکی تھی۔ پھپھو نے کہا کہ گاڑی میں بیٹھ کر ہی آئس کریم کھا لیتے ہیں، کامل نکل کر آرڈر دینے گیا تھا۔

''مم...... میں کیسے سمجھاؤں پھپھو؟'' میں ہکلائی۔

''امرت تم جانتی ہو کہ وہ تمہاری بات ضرور مانے گا۔'' پھپھو کے لہجے میں کچھ عجیب سا تھا۔

''میں کسی بات کو کسی سے منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں پھپھو، یہ کامل کا ذاتی مسئلہ ہے، میں اس میں مداخلت نہیں کر سکتی۔''

''کامل کے مسئلے سے تم خود کو اتنی آسانی سے منقطع کیسے کر سکتی ہو، میں نے ماں ہونے کی حیثیت سے جتنے جتن اور منتیں ترلے کرنا تھے، کر لیے۔ وہ کسی بات پر مطمئن ہوتا ہے نہ کوئی لڑکی اس کے من کو بھاتی ہے، تم سے بہتر کون جانتا ہے امرت کہ اس نے میرے ساتھ ایسا رویہ کیوں روا رکھا ہے۔''

''پھپھو، آپ انہیں سمجھائیں کہ جو چیز انسان کے نصیب میں نہیں ہوتی، اسے کوئی زبردستی اپنا نصیب نہیں بنا سکتا۔ جو وقت گزر گیا وہ تو یوں بھی لوٹ کر آنے والا نہیں ہے...... میں نے بھی تو اپنی زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا اور اب بھی کیے ہوئے ہوں۔''

''بس یہی بات تم اسے سمجھا سکتی ہو، مجھے معلوم ہے کہ تمہاری کہی ہوئی بات کو وہ رد نہیں کرے گا، میں اس پر پریشر ڈال رہی ہوں کہ اس کی اور تحریم کی شادی ساتھ، ساتھ کرنی ہے اور اسے بھی اپنے لیے سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ وہ کہتا ہے کہ میں تحریم کی شادی کو موخر نہ کروں مگر میں جانتی ہوں کہ اگر تحریم کی شادی کر دوں گی تو وہ بالکل قابو نہیں آئے گا۔'' پھپھو نے کہا۔ ''ایک بار اس سے بات کرو بیٹا۔''

''میں کوشش کروں گی پھپھو، اگرچہ مجھے ان کی ذاتی سوچ کو بدلنے یا ان کی زندگی میں مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔'' میں نے ان سے کہا مگر مجھے یقین تھا کہ میں کامل سے وہ سب نہیں کہہ پاؤں گی۔ وقت نے ہمارے درمیان

☆☆☆

''کیا سوچا ہے تم نے امرت اب اپنے بارے میں؟'' تحریم رات کو میرے ساتھ جاگ رہی تھی، ہم اسی کے کمرے میں تھے اور حبیب بڑی مشکل سے سویا تھا، شاید نئی جگہ ہونے کی وجہ سے......

''کس بارے میں؟'' میں نے بے خیالی میں کہا۔

''تمہارے اپنے بارے میں۔''

''میرے اپنے بارے میں کس نقطہ نظر سے؟'' میں نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

''تمہیں کیا اسی طرح زندگی گزارنی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں تو...... کس نے کہا تم سے ایسا؟''

''تو اور کیا کرو گی تم؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''دوسری شادی؟''

''ایسا کچھ تو ابھی میرے ایجنڈے میں نہیں ہے، ابھی تو سوچتی ہوں کہ حبیب ذرا بڑا ہو، اسکول جانے لگے تو میں کوئی کام شروع کروں، کوئی کاروبار۔''

''کیا کاروبار کرو گی تم؟''

''ابھی کچھ واضح نہیں ہے ذہن میں میری جان، کئی آپشنز پر سوچتی رہتی ہوں۔''

''تمہیں کاروبار کا کوئی تجربہ ہے؟''

''اونہوں...... لیکن اس کام میں جس دن سنجیدگی سے کود وں گی تو پھر کچھ کر ہی لوں گی، جیسے سمندر میں گر جانے والا جان بچانے کو ہاتھ پاؤں مارتا ہے، باہر کھڑے ہو کر جائزہ لیتے رہنے سے تو خوف ہی ختم نہیں ہوتا۔''

''سوجھ بوجھ نہ ہو تو خسارے کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے پیاری۔''

''میں کسی چھوٹے کام سے آغاز کرنے کا سوچتی ہوں، بڑے کاموں میں رسک بڑے ہوتے ہیں مگر میں آہستہ آہستہ اور تھوڑی انوسٹمنٹ سے کام شروع کروں گی، دو تین آپشن ذہن میں ہیں۔'' میں نے اپنے منصوبوں کے بارے میں اسے آگاہ کیا، وہ غور سے سنتی رہی۔ کاروباری گھرانے سے تعلق تھا اور خود بھی بزنس پڑھ رکھا تھا تو اسے میرے ارادوں کا سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ مجھے اس نے کسی کاروبار کو شروع کرنے سے پہلے، چند طریقوں سے فزیبلٹی تیار کرنے کا طریقہ بتایا۔

''یہ تو ہوا تمہارا اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا آپشن...... اب بتاؤ کہ شادی کا کیا سین ہے، سنا ہے کہ کوئی انٹرسٹڈ ہے تم میں؟'' اس کے کہنے پر میرا دل زور سے دھڑکا تھا۔

''کس سے سن لی تم نے ایسی فضول بات؟'' میں نے مسکرا کر اسے ٹالا۔

''ایک بات پوچھوں امرت......؟'' اس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''ہوں......'' میں نے ہولے سے کہا۔

''تم اتنی پیاری کیوں ہو؟'' اس نے ہنس کر کہا۔ میں نے گہری سانس لی، دل ہی دل میں، میں ڈر ہی گئی تھی کہ جانے وہ کیا پوچھ بیٹھے۔

''سب فیئر اینڈ لولی کا کمال ہے۔'' میں نے جواباً ہنس کر کہا۔

''اب بتاؤ کہ......'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔ ''تمہیں لگتا ہے کہ میں نے تم سے واقعی تمہاری خوب صورتی کا راز پوچھا تھا؟''

''نہیں......'' میں بھی سنجیدہ ہوگئی۔ ''جانتی ہوں کہ کچھ اور پوچھنا تھا مگر تم کچھ سوچ کر بات کو بدل گئیں۔''

''اچھا چلو اب ذرا ایچ میں بتاؤ کہ تم اتنی عقلمند کیسے ہو؟''

''تمہاری صحبت میں رہ، رہ کر۔'' میں ہنسی۔

''میری یا......؟'' وہ بھی ہنسی۔ ''تم سمجھ رہی ہوگی کہ میں نے تم سے یہی پوچھنا تھا۔''

''میں جانتی ہوں کہ تمہارے دماغ کی سوئی کہیں اور اٹکی ہوئی ہے مگر تم پوچھتے ہوئے جھجک رہی ہو، بے فکر ہو کر پوچھو پیاری، میں کسی بھی طرح کی بات کو مائنڈ نہیں کروں گی...... ہاں البتہ لازمی نہیں کہ میرے پاس تمہارے سوال کا جواب ہو کوئی۔'' مجھے کچھ، کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ اصل ہی کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔

''تم کامل بھائی کو بھلا چکی ہو امرت...... تمہیں اپنی پہلی محبت یاد نہیں آتی کیا؟'' اس کے اس سوال پر میں سناٹے میں رہ گئی۔ میری طرف سے خاموشی کا طویل وقفہ آیا، میں کیا کہتی؟ ''ٹھیک ہے تم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا، لازمی نہیں کہ تمہارے پاس میرے سوال کا جواب بھی ہو۔''

''ہوں......'' میرے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی۔ ''میں نے جس دن زین کے لیے رشتے کے لیے ہاں کی تھی، اس دن میں نے اپنے دل سے ہر پرانی یاد کو مٹا ڈالا تھا۔''

''تمہیں لگتا ہے کہ تمہاری بات پر اتنی ہی آسانی سے یقین کیا جاسکتا ہے کیا اتنا ہی آسان ہوتا ہے پہلی محبت کو بھلا دینا؟'' اس نے مجھے گھورا۔

''یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ؟'' میں نے سوال کر کے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

''اگر ایسا ہوتا تو کامل بھائی کیوں اب تک......'' وہ رکی۔ ''میرا مطلب ہے کہ وہ اپنی شادی کے لیے سوچتے تک نہیں ہیں۔''

''دیکھو تحریم، کامل کے ساتھ کیا مسئلہ ہے، یہ میں نہیں جانتی مگر میں یہ جانتی ہوں کہ کامل میری ایک دوست کے ساتھ امریکا میں شادی کے لیے سیریس تھا اور جانے کس وجہ سے وہ رشتہ قائم نہ ہو سکا۔''

''کیا...... ایسا کس نے کہا تم سے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا تم شفاف کی بات کر رہی ہو؟''

''جو بھی ہے تحریم، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کامل کو شادی تو کرنی ہی ہے ناں، کسی سے بھی کرے، اس کا معیار ہو سکتا ہے اتنا بلند ہو کہ اس پر کوئی لڑکی پوری ہی نہ اترتی ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کل کی لڑکیوں کے مطالبات ایسے ہو گئے ہوں کہ کامل......''

''آپ لوگ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟'' بشاش لہجے میں کہتا ہوا وہ دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوا تھا۔ میں نیم دراز تھی، سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ''سونے میں مخل ہوا، کام کرتے ہوئے تھک گیا تھا، نیند آرہی تھی تو سوچا کہ کافی بنا کر پی لوں، ادھر سے گزرتے ہوئے روشنی دیکھی تو اندر آگیا کہ آپ سے پوچھ لوں، کافی پئیں گی؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا تھا، میں گڑبڑا گئی۔

''نہیں، نہیں میں تو بس سونے لگی تھی۔'' میں نے فوراً عذر تراشا۔

''آپ کو تو کافی پی کر اچھی نیند آتی ہے......'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''اب نہیں...... یوں بھی مجھے ویسے ہی نیند آرہی تھی۔'' یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جاسکتا ہے۔

''تحریم مجھے کافی بنا دو گی ایک کپ...... ذرا اسٹرانگ سی ہو۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''میں یہاں بیٹھ کر انتظار کر لیتا ہوں۔''

''کامل بھائی، مجھے نیند آرہی ہے پلیز۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''کیسی سست بہن ہو میری، کل کو چلی جاؤ گی تو میں کیا یاد کروں گا......'' اس نے اسے جذباتی طور پر بلیک میل کیا۔

''آپ تحریم کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں، میں آپ کو کافی بنا دیتی ہوں۔'' میں نے اس صورت حال سے بچنے کو کہا کہ رات کے اس پہر میں اس کے ساتھ رہوں۔

''زندہ باد میری جان۔'' تحریم نے نعرہ لگایا۔ ''اوہ سوری، یہ جاگ ہی نہ جائے، پہلے ہی بڑی مشکل سے سویا ہے۔'' اس نے حبیب کو سوتے میں چھوا۔

''اوہو کیا ہوا اسے؟ یہ تو بہت اچھا بچہ ہے، کسی کو تنگ ہی نہیں کرتا۔'' کامل کے لہجے میں تشویش تھی۔

''بس وہ سفر کی تھکاوٹ اور نئی جگہ پر ایسا ہو جاتا ہے بچوں کے ساتھ۔'' میں اٹھی۔

''آپ کو خواہ مخواہ بے سکون کیا تحریم نے، آپ آرام کریں میں خود بنالیتا ہوں کافی۔'' وہ اٹھا۔

''آپ بیٹھیں، کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''اتنے فارمل کیوں ہو رہے ہیں امرت کے ساتھ کامل بھائی!'' وہ ہنسی۔ ''پہلے تو آپ کو اسی کے ہاتھ کی کافی اچھی لگتی تھی۔''

''امرت اب بھی اتنی ہی اچھی کافی بناتی ہے مگر مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ میں اسے بے سکون کروں۔'' وہ کہہ کر چلا گیا، میں رک گئی کہ کیا کروں، واپس لیٹ جاؤں یا......

''جاؤ یار بنا دو کافی، بیچارے اتنے مان سے مجھے کہنے آئے تھے مگر مجھے بہت سستی ہو رہی ہے۔'' اس نے لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

''میں کافی بنا دیتی ہوں۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا۔

''تھینک یو، میں بنالیتا ہوں، آپ بیٹھیں۔'' تحریم کے سامنے تو وہ آپ جناب کر ہی رہا تھا مگر اب اس کے اس طرز تخاطب پر مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر کر اپنی مسکراہٹ چھپائی، وقت کیسے کیسوں کو پچھاڑ دیتا ہے۔

''اب آپ شادی کرلیں۔'' میں نے کافی کا مگ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کس سے؟'' اس نے مسکرا کر سوال کیا۔

''جہاں پھپھو چاہیں...... یا جہاں آپ کی مرضی ہو۔''

''جہاں میری مرضی ہو، یہی کہا ہے ناں آپ نے؟'' میرے کانوں کی لویں بھی تپ گئیں، مجھے جو احساس ہوا تھا، خدا کرے وہ غلط ہی ہو۔

''پھپھو چاہتی ہیں کہ......'' میں نے ہکلا کر کہا۔

''مما نے لانچ کیا ہے آپ کو، وہ سمجھتی ہوں گی کہ میں آپ کی بات کو رد نہیں کروں گا۔'' اس نے اعتماد سے کہا، وہی اعتماد جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ ''میں مما کی بات کو بھی رد نہیں کروں گا اور کرلوں گا شادی جس دن مجھے کوئی آپ جیسی لڑکی مل گئی۔''

''شفاف اتنی پیاری لڑکی تو ہے......'' میں سٹپٹا گئی تھی۔ ''اس سے بات کیوں نہیں بنی آپ کی؟''

''بس کچھ ذاتی وجوہات تھیں امرت۔''

''میں آپ کی ذاتی وجوہات کے بارے میں نہیں پوچھوں گی مگر اب آپ پھپھو کی بات مان لیں، تحریم کی شادی بھی آپ کی وجہ سے التوا میں پڑ گئی ہے۔'' میں نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

''مما سے کہا بھی ہے کہ تحریم کی شادی کو میری شادی سے مربوط نہ کریں، میں اتنی جلدی کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں۔''

''آپ کی عمر نکلی جا رہی ہے۔'' میں بے وقوفوں کی طرح وہ سارے الفاظ کہے جا رہی تھی جو پھپھو نے میرے منہ میں ڈالے تھے۔

''ہاہاہا......'' وہ ہنسا، پرانا کامل! ''اچھا لگا تمہارا یوں کہنا امرت......'' میں بلش کر گئی، اس نے آپ سے تم تک کا

سفر بتتے ہوئے بے دھیانی میں طے کرلیا تھا یا دانستہ۔ ''میری عمر کے بارے میں تمہاری تشویش اچھی لگی مجھے...... ویسے تین چار سال پہلے میں شادی شدہ ہو گیا ہوتا جو قسمت ساتھ دیتی امرت۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''دکھ تو یہ ہے امرت کہ قسمت نے جو بازی کھیلی تھی اس میں میرے اور تمہارے حصے میں ہار ہی ہار لکھی تھی، یہ ہار میرے لیے عمر بھر کا ساتھی رہے گی کیا امرت، کیا میں عمر بھر تہی دست رہوں گا؟''

''جو کچھ ہو چکا نہ میں اس کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتی ہوں اور آپ سے بھی کہوں گی کہ اس موضوع پر اس کے بعد میں کسی کے منہ سے کچھ نہ سنوں، میں اپنی شادی کی ناکامی کو اپنی پوری زندگی پر محیط نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنی زندگی سے خوش ہوں اور اس پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ آپ میری ذاتی زندگی میں مداخلت نہ کیا کریں، نہ ہی اس کے بعد میں آپ سے کوئی سوال آپ کی زندگی کے حوالے سے کروں گی، آج کے لیے معذرت مگر میں نے یہ سب کچھ آپ سے پھپھو کے کہنے پر کہا ہے۔'' میں نے اپنی آنکھوں میں اترنے والے پانی کا دباؤ محسوس کیا اور سوچ کر بند باندھا کہ اس کے سامنے نہیں......

''جانتا ہوں، اس کی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے میرے ہاتھ کے قریب اپنا ہاتھ میز پر روک لیا تھا، میں نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے دور کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی...... مجھے اس کے سامنے آنسو نہیں بہانا تھے۔

☆☆☆

میرے فون پر ساجدہ کی کتنی ہی مسڈ کالز تھیں...... میں تشویش کا شکار ہو گئی، اللہ خیر کرے، اس کے کسی بچے کا کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔ رات دیر سے سونے کے باعث آنکھ ہی نہ کھلی تھی، حبیب کے رونے کی آواز سے جاگی تو ساڑھے نو بجے کا وقت تھا، میں ہڑبڑا کر اٹھی اور اسے گود میں لے کر چپ کرایا۔ فون اٹھایا تو اتنی کالیں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''خیریت ہے ناں ساجدہ؟'' سلام دعا کے بعد میں نے اگلا سوال کیا۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے باجی۔''

''کیا ہوا ہے، جلد بتاؤ۔'' ایک لمحے میں سیکڑوں خیال آ گئے تھے۔

''بتاتی ہوں باجی...... آپ بتائیں حبیب بابا کیسے ہیں؟'' اس نے حسب عادت تمہید سوچنا شروع کر دی تھی۔

''چاچو خیریت سے ہیں ناں ساجدہ؟''

''اللہ کا کرم ہے جی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، وہ جی کل زین صاحب آئے تھے۔''

''کیا؟ کیوں؟ کس وقت؟'' میں پریشان ہو گئی، ذہن میں خیال آیا کہ کہیں اس نے ساجدہ پر پھر دست درازی نہ کی ہو۔ ''تم اکیلی تھیں کیا گھر پر؟''

''جی باجی، میں تو اکیلی تھی مگر وہ اکیلے نہیں تھے۔''

''کیا ان کے ساتھ ان کی نئی بیوی تھی؟'' میں نے فوراً سوال کیا، اسے کیوں ساتھ لے کر آئے گا وہ؟ شاید اس دن اپنی بیوی کی، اسٹور میں ہونے والی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے۔

''نہیں جی، ان کے ساتھ پولیس کے لوگ تھے اور کوئی وکیل صاحب بھی۔'' اس نے جواباً کہا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ ان کی بیوی امرت اس گھر میں رہتی ہے اور وہ اسے منانے کے لیے آئے ہیں۔''

''پولیس اور وکیل؟'' مجھے اس کے یوں رک رک کے بتانے کے انداز پر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ ''ساجدہ یوں پہیلیاں مت بجھواؤ مجھ سے، جلدی بتاؤ پوری بات۔''

''بتاتی ہوں جی۔'' اس کے بعد اس نے جو کچھ بتایا وہ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکالنے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

''آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟'' اس نے جو محسوس کیا تھا وہ سب کے سامنے کہہ دیا۔

''نہیں..... نہیں تو، میں ٹھیک ہوں؟'' میں نے گڑبڑا کر کہا۔

''میری کہی ہوئی کوئی بات بری لگی ہو تو.....''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں اور بھی گڑبڑا گئی کہ جانے باقی لوگ کیا سوچیں کہ اس نے مجھ سے ایسی کون سی بات کی ہے جو مجھے بری لگ سکتی ہے۔

''مما چلیں.....'' تحریم چائے جلدی سے حلق میں انڈیل کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ کہاں جارہی ہیں پھپو؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''بیٹا میں نے خالی معدے کے ساتھ کچھ ٹسٹ کروانا تھے، تحریم کو یونیورسٹی میں کچھ کام ہے، اسے وہاں چھوڑ کر اسپتال جاؤں گی اور جلد لوٹ آؤں گی۔''

''مگر مجھے بھی تو اسپتال جانا تھا پھپو اور وہیں سے تمنا کے ہاں چلی جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''کامل گھر پر ہی ہے بیٹا، تم جب تیار ہو جاؤ اور حبیب بھی تیار ہو تو اسے بتا دینا یہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔'' مجھے لگا کہ پھپو نے ایسا پلان خود ہی ترتیب دیا تھا تاکہ ہمیں بات کرنے کا موقع مل سکے۔

''اگر آپ چند منٹ ٹھہر جائیں تو میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔''

''مجھے دیر ہو جائے گی امرت..... پلیز۔'' تحریم نے التجائیہ لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گئی۔

''ٹھیک ہے..... میں تیار ہو جاتی ہوں۔'' ہاشم پھپا اور کامل کو میز پر ہی بیٹھا چھوڑ کر میں اٹھ گئی۔

☆☆☆

''ایسا تو نہیں ہو سکتا امرت کہ مجھے تم پریشان لگ رہی ہو اور تم اسے جھٹلا دو کہ ایسا نہیں ہے۔'' اس نے گھر سے نکلتے ہی سوال کیا۔ ''میرا کچھ کہنا برا لگ گیا ہے امرت؟''

''میں پریشان ہوں، درست ہے مگر نہ آپ اس پریشانی کا باعث ہیں اور نہ ہی آپ کے پاس اس پریشانی کا علاج ہے۔'' میں نے ضبط کے کئی مراحل سے گزرتے ہوئے کہا۔

''بسا اوقات کسی سے کچھ کہہ لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے امرت..... اس بات کا فیصلہ تو تم نہیں کر سکتیں کہ میرے پاس تمہارے مسئلے کا حل ہے یا نہیں۔'' وہ مصر تھا۔

''میں ٹھیک ہوں.....'' جانتی تھی کہ اس سے مسئلہ کہوں گی تو آنسو ضبط نہ کر پاؤں گی۔

''جانتا ہوں کہ تم ٹھیک ہو..... مگر.....''

''آپ پلیز دھیان سے گاڑی چلائیں.....''

''ٹھیک ہے امرت، جو آپ کو مناسب لگتا ہے، میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا، میں جو اس قابل ہوتا کہ آپ کے کسی مسئلے کو حل کر سکتا ہوتا تو آج حالات ہی مختلف ہوتے۔'' اس نے دوبارہ فارمل ہوتے ہوئے یاسیت سے کہا..... کم از کم ایک کزن کی حیثیت سے ہی آپ مجھ سے بات کر سکتی ہیں۔''

''میرا مسئلہ بہت ذاتی نوعیت کا ہے کامل..... میں آپ سے شیئر کر بھی لوں تو کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ایسی کون سی بات ہے امرت کہ جس کی وجہ سے تمہاری پلیٹ میں ناشتا جوں کا توں پڑا تھا اور تم ڈائننگ روم کے پردوں کی چنٹیں گن رہی تھیں۔'' وہ اتنے غور سے مجھے دیکھتا رہا تھا کیا، میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بنا سوچا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ ''مجھ سے شیئر کرو امرت کہ تمہیں کیا بات پریشان کر رہی ہے۔''

''ساجدہ کا فون آیا تھا، اس نے بتایا کہ.....'' میں نے مختصراً اسے بتایا۔

''بہت جلدی میں لگتا ہے زین ہر معاملے میں۔'' اس نے بڑبڑا کر کہا۔ ''تم فکر نہ کرو، کچھ نہ کچھ حل نکل آئے گا اس کا بھی۔'' اس کا فارمل انداز پھر تبدیل ہو گیا تھا۔ ''تم نے بتایا کہ چاچو نے وہ اپارٹمنٹ تمہارے نام سے لیا تھا، اس گھر کے کاغذات کہاں ہیں؟''

''وہ اسی لاکر میں ہیں جس میں چاچو نے باقی فائلیں اور اہم دستاویزات رکھی تھیں۔ وہ لاکر بھی میرے ہی نام پر ہے اور اس کی چابیاں میرے پاس ہیں۔''

''کیا تم نے کبھی اس لاکر کو کھولا ہے؟ اس اپارٹمنٹ کے کاغذات خود دیکھے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہوں.....'' اس نے گہری سانس لی۔ ''زین کا یوں تمہارے گھر پر پولیس اور وکیل کو لے کر آنا تو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس کے پاس کوئی وصیت یا مکان کی ملکیت کے کاغذات ہو سکتے ہیں.....'' وہ رکا۔ ''ہر بینک کے لاکر کی دو چابیاں ہوتی ہیں، اس لاکر کی دوسری چابی کہاں ہے؟''

''وہ..... وہ تو مجھے علم نہیں، چاچو کے پاس ہی ہو..... گی ناں۔'' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں فوراً واپس لوٹ جانا چاہیے..... کبیر بھائی کو ساتھ لے جاؤ، انہیں سارے حالات کی بابت مختصراً بتا دو۔''

اس نے مشورہ دیا۔

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ واپس لوٹ جاؤں.....'' میں نے اسپتال کی پارکنگ میں گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ ''سوچ رہی ہوں کہ آج رات امو جان کے پاس رک جاؤں، انہیں کچھ حالات کا بتا دوں اور کل سویرے واپسی کے لیے نکل جاؤں۔''

''مناسب رہے گا۔'' اس نے کہا تھا۔

☆☆☆

''میں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں اب امو جان۔'' میں سسکی۔ ''مجھے نہ مکان کی پروا ہے نہ کسی اور مال و اسباب کی مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ چاچو کی زندگی میں ہی زین نے اپنے مکر و کھیل شروع کر دیے۔ جانے اس کے بعد میرے لیے کیا، کیا مشکلات کھڑی کرے گا۔''

''اب بھی وقت ہے، کچھ سوچ لو اپنے لیے بہتر بیٹا، ایک نوجوان مطلقہ کے لیے یوں تن تنہا ساری عمر گزارنا آسان ہے اور نہ جائز۔'' انہوں نے رسان سے کہا۔ ''ہمارا مذہب بھی بیوہ یا مطلقہ کی دوسری شادی پر زور دیتا ہے۔''

''میرے پاس بیٹا ہے امو جان، میں اس کی ماں ہوں اور اپنی زندگی میں کسی ایسے شخص کو شامل نہیں کر سکتی جو حبیب کا خونی رشتہ نہیں ہو۔''

''تم بے وقوفی بند کرو اور اپنے لیے کچھ مناسب سوچو، اب بھی وقت ہے، تم سے ارسل کے بارے میں بات کی تھی۔ اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے تو مجھے بتاؤ، میں بھی تو سنوں کہ کیا مسئلہ ہے جو تمہیں کوئی فیصلہ نہیں کرنے دیتا؟ اس کی بیٹی پل جائے گی اور تمہارا بیٹا اور یوں بھی وہ اچھا انسان ہے، دیکھا بھالا ہے، کہیں اور رشتہ ڈھونڈنے نکلیں گے تو انجان لوگوں میں سو طرح کے مسئلے اور پھر لحاظ مروت کا پردہ ہوتا ہے۔''

''بس امو جان، میرا دل ہی نہیں مانتا ورنہ ارسل بھائی میں کوئی عیب نہیں ہے۔'' ان کے غصے کے جواب میں، میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''مر جاؤں گی میں تمہاری ہی فکر کو لے کر۔'' ان کا غصہ ٹھنڈا ہونے کے بجائے اور بھی اوپر چلا گیا تھا۔

''کیوں اتنی فکر کرتی ہیں میری آپ؟'' میں کون سا آپ کی سگی بیٹی ہوں، یہ میں نے دل میں سوچا اور اپنی اس گھٹیا سوچ پر خود..... کو مذمت بھی کی۔

''میں نے تمہیں ہمیشہ تمنا سے بڑھ کر چاہا ہے امرت، مجھے لگتا ہے کہ تمہیں جنم بھی میں نے ہی دیا ہے۔'' ان کے الفاظ تھے کہ کوئی گرم سیال، جو مجھ پر گر رہا تھا۔ کیا وہ میرے دماغ میں آنے والی سوچوں کو بھی پڑھ سکتی تھیں؟

''میں کل واپس چلی جاؤں گی امو جان۔'' میں نے انہیں بتایا۔ ''کبیر بھائی کو بتایا تھا میں نے کہ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے جلد جانا پڑ رہا ہے مجھے۔''

''ہاں بتایا تھا کبیر نے مجھے...... مجھے تو پہلے ہی سے امید تھی کہ جمال کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو یہ لوگ تمہیں کچا چبا جائیں گے...... لیکن مجھے یہ امید نہ تھی کہ جمال کے جیتے جی یہ اپنا رنگ ڈھنگ دکھانا شروع کر دیں گے۔''

''آپ بس میرے لیے دعا کیا کریں امو جان۔'' میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ہمارے حق میں کی گئی آپ کی کوئی دعا رائگاں نہیں جائے گی۔''

''دعا ہی تو کر سکتی ہوں میں بیٹا اور کیا کر سکتی ہوں۔'' کئی ستارے ان کی پلکوں کے بند کو توڑ کر گرے تھے۔

☆☆☆

''امرت آج واپس جا رہی ہے مہر۔'' امو جان نے ناشتے کی میز پر پھپھو کو بتایا۔

''آپ ناشتا کر لیں بھابی۔'' انہوں نے امو جان کی بات کو جیسے ان سنا کر دیا تھا۔

''ہاں......'' امو جان نے ناشتا شروع کیا۔ ''کہاں ہیں؟''

''امرت تم نے اپنا سامان پیک کر لیا ہے؟'' مہر پھپھو نے سوال کیا۔

''جی پھپھو۔'' میں نے کہا۔ ''تمنا آج واپس آ جائے گی ناں اسپتال سے؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے دو تین دن اور رکھیں گے...... چھوٹو کو یرقان ہے اور اسے چند دن اسپتال میں رکھنا پڑے گا۔''

''اوہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں رک جاتی پھپھو مگر وہاں کوئی ضروری کام پڑ گیا ہے، تمنا کو میں بعد میں سمجھا لوں گی، آپ پلیز اس سے معذرت کر لیں میری طرف سے۔'' میں نے رک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ اس پر کچھ عجیب سا تاثر تھا۔ 'شاید پھپھو کو میرا یوں جانا برا لگا ہے؟' میں نے سوچا۔ ''پتا نہیں کبیر بھائی میرا ٹکٹ لے کر آئے ہیں کہ نہیں۔''

''نہیں کبیر تیار ہو رہا ہے...... تم کوچ پر نہیں جاؤ گی۔''

''ارے نہیں پھپھو، کوچ پر جانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے مجھے۔''

''ہم سب بھی تمہارے ساتھ ہی جانے والے ہیں امرت۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے ہونقوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھا، اس پر جو کچھ عبارت تھا، وہ میں نہیں پڑھنا چاہتی تھی۔

''کیا بات ہے مہر؟'' امو جان اپنا ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں...... ''جمال تو ٹھیک ہے ناں؟''

''نہیں بھابی، جمال ٹھیک نہیں ہے...... ہم سب اسے رخصت کرنے کے لیے جا رہے ہیں، امرت کے ساتھ۔''

''نہیں پھپھو، ایسا نہیں ہو سکتا...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے تو ابھی ان سے بہت سی باتیں کرنا تھیں، مجھے تو انہوں نے کال کر کے واپس آنے کو کہا تھا...... وہ مجھ سے بات کیے بغیر کیسے جا سکتے ہیں!'' میں ان کی گرفت سے نکل رہی تھی اور چیخ رہی تھی، میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنا سر دیوار سے دے ماروں۔

''وہ یوں ہی چلا گیا امرت، کسی سے کچھ کہے بغیر...... کسی کو بتائے بغیر کہ وہ غم کا کون سا پہاڑ سر پر لاد کر چلا گیا، اسے آخر کون سا دکھ موت کے منہ میں لے گیا۔ وہ ہم سب سے منہ موڑ گیا ہے میری جان۔'' وہ برستی آنکھوں کے ساتھ مجھے سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''امو جان! آپ پھپھو سے کہہ دیں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔'' میں امو جان سے لپٹ گئی۔ وہ سکتے میں تھیں، آنکھ میں آنسو تھا نہ زبان پر کوئی حرف......

(آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ)

اِدھر اُدھر

کنیز نور علی



ریسٹورنٹ کی فضا میں تلی ہوئی مچھلی اور سوپ کی مہک رچی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی نزاکت سے قدم اٹھاتی شیشے کا دروازہ دھکیلتی اندر داخل ہوئی اور داخل ہوتے ہی اس کی بادامی آنکھوں نے جانچ لیا تھا کہ سامنے والی میز پر بیٹھی عورت نے اس کے کل والے سوٹ جیسا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

''شکر ہے آج میں نے وہ والا جوڑا نہیں پہنا، ورنہ کیا عزت رہ جاتی۔'' دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے کج کج چلتے وہ اپنی میز کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جہاں کوئی پُر شوق نظروں سے تکتا اس کا منتظر تھا۔ جبکہ وہ عورت جسے اس نے آتے ہی دیکھا تھا۔ گھونٹ، گھونٹ قہوہ اپنے اندر اتارتے ہوئے اپنے خاوند کو غور سے دیکھ رہی تھی کہ وہ دائیں طرف والی ٹیبل پر بار، بار مڑ کر دیکھ رہا تھا اس میز پر بچوں نے اودھم مچا رکھا تھا،

بوڑھیوں کی طرح اندازہ لگایا تھا پھر حسرت سے اسی میز کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس کی نظر میں وہ جو تین بچوں میں گھری عورت بیٹھی ہے کیسی بھاگ والی ہے، اور یہاں میری گود اداس ویران ہے۔ وہ ایک بار پھر اداس ہوگئی تھی۔ دن سے لے کر رات تک وہ کتنی بار اداس ہوتی تھی اب تو کوئی گنتی ہی نہیں تھی۔ وہ حسرت سے اسی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اور وہ جو بچوں میں گھری ہوئی تھی اس نے بڑی مشکل سے ننھے کی مٹھی سے اپنا دوپٹا کھینچا تھا اور بچھلے والے نے کیچپ سے سنے ہاتھ اس کی قمیص سے رگڑ ڈالے تھے۔ ماں کا دل چاہا یہیں ایک رکھ کر مارے پر وہ ضبط کر گئی۔ وہ ایک بار جو رونا شروع کرتا تو دو گھنٹے بعد ہی چپ ہوتا، سب سے بڑی بچی ہال میں دوڑتی پھر رہی تھی اور قابو میں نہیں آ رہی تھی اس کے پیر نہیں ٹکتے تھے، ابھی یہاں ابھی وہاں، ماں اپنی جان کو روتی ایک کو دیکھتی دوسرے کو پکڑتی ہلکان ہو رہی تھی۔

"کیا زندگی کا جنجال بن گیا ہے، اپنے لیے ایک لمحہ بھی نہیں ملتا۔ نیند پوری ہونا تو دور کی بات رہی۔" وہ برابر کی میز پر بیٹھے خاندان کو دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔

"ہائے کیسے سوبر اور پرسکون بیٹھی ہے۔ وہ عورت اور بچے بھی...... مجال ہے چہرے سے لے کر لباس تک پر ایک سلوٹ ہو۔ یہاں اپنے کپڑے استری کرنے کا وقت نہیں ملتا۔" اس کا دل چاہا ابھی اسی وقت اپنے سامنے بیٹھے شوہر سے لڑنا شروع کر دے۔ جو یہاں اسے آج مہینوں بعد ڈنر کرانے لایا تھا لیکن دھیان سارا اس کا سامنے لگی ٹی وی کی اسکرین پر لگا تھا۔ برابر کی میز پر بیٹھی ایک اور عورت اپنے موبائل اسکرین پر نظر دوڑاتے ہوئے شوہر کو تیکھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے معصوم اور سلجھے ہوئے بچوں کی باتوں پر مسکراتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے۔ بس یہی سوچ جا رہی تھی کہ اس کے خاوند کی کی آج کل کیا دلچسپی چل رہی ہے۔ وہ یہ ڈھونڈ کر رہے گی اور اس بے توجہی کا

باوقار جوڑے کو نگاہوں میں تولتے ہوئے اس کے دل سے ایک آہ نکلی تھی۔

"وفا بھی اسی دنیا کا ایک حصہ ہے، آخر مجھے ہی ایک بے وفا مرد کیوں ملا۔"

باوقار جوڑے نے اپنی ریزورڈ شدہ ٹیبل پر پہنچ کر سکون سے بیٹھتے ہوئے مسکرا کر جادلہ خیال کرتے ہوئے شاید اپنے دل کی بے چینی کو دبائے رکھا تھا۔ عورت نے اپنے اوپر تانے خول کو بار، بار چٹختے محسوس کیا تھا۔

"آخر زندگی میں محبت کے دن اتنے کم کیوں ہیں، کیا واقعی میرے وجود میں ایک زہر اترا ہوا تھا۔ جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا۔ اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور کینسر بن گیا!! آج کتنے دن بعد وہ اتنی مضبوط ہوئی تھی کہ اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکلی تھی۔ وہ مرنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔ مری ہوئی آنکھوں سے اس نے سامنے والی میز پر بیٹھی بزرگ خاتون کو دیکھا جو اپنے مرد (شوہر) کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک لمبی رفاقت کی چاشنی اس بزرگ جوڑے کو دیکھ کر اسے محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

اور وہاں وہ بزرگ عورت اپنے خاوند کو مسکرا کر بتا رہی تھی کہ اگلے ماہ ان کا بیٹا اپنے بچوں سمیت آ رہا ہے۔ ساتھ ہی اسے اپنے بچوں کی یاد نے گھیر لیا۔ وہ اداس سی ہوگئی۔

"پورا سال انتظار کیا تھا اور اب ایک مہینہ ملے گا، بیٹے کو اپنے سامنے دیکھنے کا... ساری زندگی لگا دی بچوں کو بنانے میں اور اب صلہ کیا ہے...... دوری اور تنہائی، اسے شدت سے احساس زیاں نے گھیرا۔ وہ اداسی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اب اس عمر میں ادھر، ادھر دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔

ہر عورت اپنی، اپنی جگہ مظلومیت کے آخری سرے پر نظر آ رہی تھی۔

▲▲



ناولٹ

محبت لوٹ آتی ہے

ثمر کاظمی

بچپن میں دادی اماں ہمیں پریوں کی کہانیاں سناتی تھیں اور ہم خود کو سچ مچ کی پریاں سمجھتے تھے۔ لیکن اب جا کر پتا چلا کہ پریوں کا بسیرا تو صرف پرستان میں ہوتا ہے کیونکہ پریاں ساتوں نہیں ہوتیں اور کنیز بنت

عمار تو صرف ایک عام سی انسان ہے۔

صبح کی سفیدی خاک نشینوں کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پرندے نے اپنے رزق کی تلاش کے لیے اڑان بھری اور لکڑی کا پرانا دروازہ چر کی

آواز سے کھل گیا۔ فضا میں سورج کی روشنی نے پر پھیلانا شروع کر دیے۔ کھونٹے سے بندھی بھوری بکری اور دڑبے سے مرغے کی ککڑوں کوں کی آواز صحن کے وسط سے ابھری۔ پڑوسن نجمہ کی بلی نے صحن میں دانہ چگتے کبوتر پر چھلانگ لگائی، کبوتر جھٹ سے اڑا تب بلی نے صحن میں رکھی کچی کو دھل پر رکھی برتنوں کی ٹوکری گرا دی۔ چھن، چھن کی آواز گونجی اور پاس کمرے سے ابھرتی چاچی بختاں کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے میں مگن تھی۔ پر وہ تو ڈائری لکھنے میں مگن تھی۔

''ارے کنیزاں! کیا جل تو جلال کا ورد کر رہی ہے تو کون سے وظیفے پڑھ رہی ہے، ارد گرد کا ہوش نہیں، جب دیکھو ان بے جان چیزوں سے چمٹی رہتی ہے۔ ارے میں کہتی ہوں ان زندہ وجودوں کے ساتھ بات کر لے دو گھڑی۔''

''ارے چاچی۔'' وہ مٹی کے چولھے پھلانگ کر اُدھر ہی چلی آئی جہاں چاچی بختاں لکڑیاں جلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کمرے میں لکڑیوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور دیگچی میں ساگ ابل رہا تھا۔ مومنہ کے ہوتے چاچی چپ رہتی لیکن مومنہ کے جانے کے بعد ان کی بند زبان کے تالے کھل گئے تھے۔

''آپ کو پتا ہے مجھے آپ سے کتنا پیار ہے؟'' اس نے چاچی کے ہاتھ سے پرات لیتے ہوئے کہا۔

''اب تو اس گھر کی ہر چیز گواہی دے گی، یہ صدیوں پرانی ٹوکا مشین جو کسی گائے کے انتظار میں جی رہی ہے، یہ ڈربا، یہ کبوتر، یہ درخت اور ہاں یہ پرانا بوسیدہ کمرا اور یہ صحن جس کی صفائی کرتے، کرتے کنیز بنت عمار کی رنگت کملا کر رہ گئی ہے۔'' وہ جب بولتی نان اسٹاپ بولتی جاتی۔

''چپ کر۔'' چاچی نے اسے گھرکا۔ ''تجھے اپنا اتنا لمبا نام لیتے ہوئے وحشت نہیں ہوتی۔'' انہوں نے بات کو بدلا۔

''لو جی چاچی، اس پنڈ میں کتنی ڈھیر کنیزاں ہیں۔ ایک کا نام کو دوسری دیتی ہے۔ اس لیے میں اپنا پورا نام لیتی ہوں۔''

''اچھا زیادہ باتیں نہ بنا، یہ قہوہ پی لے آج بھوری کمبخت نے دودھ نہیں دیا نہ جانے کیا ہوا ہے۔''

''کچھ نہیں چاچی یہ بھی کسی کی آس میں ہے بیچاری۔''

''وہ تو زندہ انسانوں کو بھول گیا، حیوانوں کی کیا فکر اسے، نہ کیا کر اس کا ذکر چنگا نہیں لگتا مجھے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اتنے میں دروازہ دھڑ، دھڑ بجا۔

''یہ اتنے سویرے، سویرے کون آ گیا، جا کنیز دیکھ بیٹا۔'' وہ دروازے تک آئی۔

''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ارے بھائی کون ہے؟'' اس نے ایک ہاتھ سے کبوتروں اور مرغیوں کو آٹے کے چھوٹے، چھوٹے ٹکڑے ڈالنے شروع کر دیے۔

''ارے کون ہے؟'' چاچی نے پوچھا۔

''پتا نہیں، آواز نہیں دے رہا۔'' اس نے جیسے ہی دروازہ کھول کر دیکھا اس کی آنکھوں کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے۔ اسے لگا گلگت کی ٹھنڈی ہوا اس پہ ہنس رہی ہے۔ آٹے کی پرات اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر جا گری۔ وہ حیرت سے دروازے پر کھڑے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے آنے کی امید اس نے چھوڑ دی تھی۔ مسافر لوٹ آیا تھا...... تھکا تھکا شکست سا۔

''اندر آنے کو نہیں کہو گی؟'' وہ اسے بت کی طرح ساکت دیکھ کر بولا۔ وہ چپ چاپ ہٹ گئی اور کمرے میں بند ہو گئی۔ باہر سے اس کی اور چاچی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دل کی بنجر زمین پر عشق پھر سے لوٹ آیا تھا۔

☆☆☆

''موٹی دے میرے کھلونے۔'' دس سالہ شاویز نے سات سالہ کنیز کے بال نوچتے ہوئے کہا۔ وہ بھاں، بھاں کر کے رونے لگی۔ کمرے سے باہر آتے امین چاچا نے یہ منظر دیکھا اور بیٹے کو پکڑ کر دو تھپڑ لگائے۔

''بدتمیز بہن پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔'' انہوں نے کنیز کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہے یہ میری بہن، کالی کلوٹی موٹی بھینس۔'' وہ چڑ گیا اور بھاگ کر باہر نکل گیا۔

''بیٹا چوٹ تو نہیں لگی......'' امین خان نے کنیز کو گود سے اتارتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں چاچو نہیں لگی۔''

''شاویز گندا ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے بھتیجی کو دیکھا۔

امین خان اور عمار خان دو بھائی تھے اور ایک بہن زبیدہ۔ زبیدہ بیاہ کر دبئی چلی گئی۔ امین خان کی شادی بختاں سے ہوئی۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا شاویز۔ بیٹی کی بہت چاہ تھی لیکن شاہ ویز کی پیدائش پر کچھ پیچیدگیاں ہونے پر بختاں بی بی پھر ماں نہیں بن سکی۔ وہ دونوں اپنی ممتا کنیز پر لٹاتے تھے۔ عمار خان شہر میں نوکری کرتا تھا اور اس نے وہیں اپنی کلاس فیلو انیسہ سے شادی کر لی تھی۔ انیسہ کا تعلق اونچے خاندان سے تھا، اپنے خاندان کی مخالفت مول لے کر عمار خان سے شادی کر لی تھی۔ اس کے بھائیوں نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ایک دن وہ تین سال کی کنیز کو گھر آپا کے پاس چھوڑ کر ایک پارٹی سے واپس آ رہے تھے کہ تقدیر نے انہیں موت کے سپرد کر دیا۔ پولیس کو قاتلوں کا سراغ نہ ملا۔ خون میں لت پت بھائی بھاوج کی لاش گاؤں لاتے امین خان ضبط کی کڑی منزل سے گزر رہے تھے۔

''خان جی ہمیں بھائی بھاوج کے قاتلوں کو سزا دلوانی چاہیے۔'' بختاں نے دبے دبے لفظوں میں ان سے کہا بس۔

''نہ بختاں جانے والے چلے گئے میں نے ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ میں اپنی شہزادی کو رولنا نہیں چاہتا، آج عمار خان دشمنی کی بھینٹ چڑھا کل وہ معصوم کنیز کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔'' انہوں نے سوتی ہوئی کنیز کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ یوں کنیز، شاویز کی راج نگری میں مداخلت کرنے آ گئی۔ شروع شروع میں وہ بھی ہوئی بچی تھی۔ امین خان اور بختاں اسے پیار اور توجہ دیتے جتنا شاویز چڑ جاتا۔ اسے اپنی تک چڑھی کزن سے خدا واسطے کا بیر تھا جس کے آنے سے اس کے والدین کی توجہ اس پر کم ہو گئی تھی۔ جب بھی موقع ملتا وہ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔

بچپن کا دور ایک سہانے سپنے کی طرح گزر گیا۔ شاویز پڑھائی کی غرض سے شہر میں ہاسٹل میں مقیم تھا کہ اچانک امین خان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ شاویز خبر ملتے ہی فوراً گھر آیا۔ برآمدے کے پاس بلک، بلک کر روتی لڑکی کو اس نے حیرت سے دیکھا۔ تدفین سے فارغ ہوتے ہی تمام رشتے دار واپس چلے گئے۔ وہ بان کی چارپائی پر ہاتھ آنکھوں پر رکھے لیٹا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اسے پتا تھا کہ اب اسے یہیں رہنا ہے۔ گھر والوں کو اس کی ضرورت ہے۔

''شاہ ویز چائے۔'' اس نے چونک کر دیکھا وہی لڑکی ہاتھ میں چائے لیے کھڑی تھی۔ چھریرا بدن، ستواں ناک، گندمی رنگت یک دم اس کے ذہن میں شبیہ لہرائی۔

''ارے، کنیز تم کنیز ہو ناں؟''

''جی ہاں کنیز ہوں آپ کو کہاں یاد ہوں گی، ہر ویک اینڈ پر آپ کے آنے سے پہلے نجمہ کے گھر چلی جاتی تھی تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو آپ مجھے پسند جو نہیں کرتے۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''اچھا چلو تمہارا شکوہ دور کر دیتا ہوں اب خوب صورت ہو گئی ہو۔ بتاؤ کیسی ہو؟''

''اچھی ہوں۔''

''اماں بتا رہی تھی کہ تم نے پڑھائی چھوڑ دی ہے کیوں؟''

''بس ایسے ہی دل نہیں کرتا پڑھنے کو۔'' وہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ شاویز کا مہربان لہجہ اس کے لیے حیران کن تھا۔

''چلو کل اپنے ہاسٹل کی فارمیلٹیز پوری کرنے جاؤں گا تو تمہارے لیے بھی ایف اے کے فارم لے آؤں گا۔'' دل کے آئینے پر کنیز بنت عمار کی شبیہ لہرانے لگی تھی۔ شاید پہلی نظر کا پیار اسے کہتے ہیں۔ اب آتے جاتے اس کا حال پوچھنے لگا۔

اماں!" وہ جیکٹ کی زپ بند کرتے ہوئے ماں سے بولا۔ سردی یک دم بڑھ گئی تھی۔ دسمبر کے اولین دن تھے، فضا میں ٹھنڈک کا احساس تھا۔ بوندوں کی رم جھم وقفے وقفے سے جاری تھی۔

"بول میرا چن۔"

"اماں وہ کل کنیز کے رشتے کے لیے جو لوگ آئے تھے آپ انہیں منع کر دیں۔"

"کیوں بیٹا، لڑکا تو اچھا ہے، کھاتے پیتے گھرانے کا ہے اور اپنا دیکھا بھالا ہے۔ نجمہ کی ماں بہت تعریف کر رہی تھی اس کی، تجھے کیا اعتراض ہے؟" انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

"اف اماں آپ کو سارے جہان کے لڑکے نظر آتے ہیں اپنے گھر کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔"

"ہیں میرے گھر میں لڑکے کہاں ہیں؟" وہ بوکھلائیں۔ دروازے کی چوکھٹ سے کن انکھیوں سے دیکھتی کنیز بنت عمار نے بے ساختہ اپنی ہنسی دبائی۔ وہ جان گئی تھی کہ شادیز چاہتا کیا ہے۔

"اماں اپنے منہ سے کہتا اچھا لگوں گا کیا اماں بس آپ میری شادی کر دیں کنیز سے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"بیٹا یہ تو کیا کہہ رہا ہے، یہ ساری زندگی کے فیصلے ہیں سوچ سمجھ کر بول...... کل تک تو وہ تجھے پسند نہیں تھی پھر اب؟"

"اماں وہ بچپن تھا تب میں گدھا تھا بس اب سمجھ دار ہو گیا ہوں، مجھے یہ کالی کلوٹی ہی پسند ہے، مجھے یہ اچھی لگتی ہے۔" اس نے دروازے سے نارنجی آنچل کی جھلک دیکھ کر کہا۔

"یہ کالی کلوٹی کسے کہا تم نے ؟" وہ غصے کے تیور لیے باہر نکل آئی۔

"تجھے اور کسے کلوٹی موٹی۔" وہ اسے چھیڑتا ہوا باہر نکل آیا۔

"تو اس کالی کلوٹی سے شادی کرنے کے لیے کیوں مرے جا رہے ہو۔" اس نے غصے سے کہا۔

"بیٹا کیا شادیز جو کچھ کہہ رہا ہے وہ تجھے بھی منظور ہے؟"

بی چاچی۔" کنیز بنت عمار نے بھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ دعائیں یوں بھی مستجاب ہوتی ہیں۔ بچپن میں جس کی شبیہ کو اس نے دل میں بسایا تھا آج وہ حقیقت میں بدل گئی تھی۔ اس کے دن سرشاری میں گزرنے لگے۔ چاچی نے نجمہ کو بلوا بھیجا، وہ دوڑی چلی آئی۔

"آج نجمہ کے نصیب کیسے جاگ اٹھے جو چاچی بختاں نے یاد کیا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"چل زیادہ بک بک نہ کر۔" انہوں نے کروشیا کی کڑھائی والی چادر کو ایک طرف رکھا۔ "جا اندر سے جنتری لے آ کوئی نیک دن دیکھ کر مجھے بتا سیدزادی کو دکھا آنا اور ان کو بتا دینا کہ ہم شادیز اور کنیز ان کی بات پکی کر رہے ہیں۔"

"یہ مشرق اور مغرب مل کیسے گئے؟ اچھا چاچی میں کنیز کے ساتھ بیٹھ کر ہی دیکھتی ہوں۔" وہ جلدی سے وہاں بھاگی جہاں دنیا جہان سے بے خبر کنیز اس ڈائری لکھنے میں مگن تھی۔ اس نے غصے سے ڈائری کنیز کے ہاتھ سے چھینی۔

"گھنی میسنی، تم شادیز کے ساتھ منگنی کر رہی ہو اور مجھے نہیں پتا، مجھے یعنی نجمہ صلاح الدین کو جسے تم اس شادیز کے کھڑوس پن کے قصے سنا، سنا کر پاگل کر دیتی تھیں اور اب جب پوری بات ہو چکی تو مجھے آخر میں بتایا۔" صدمے سے نجمہ کا برا حال تھا۔

"یار مجھے خود نہیں پتا۔" کنیز اس کے حملے سے بوکھلا گئی تھی۔ نجمہ نے اس کے لال ہوتے چہرے کو دیکھا جہاں دنیا جہان کے گلال بکھرے ہوئے تھے اس لمحے نجمہ کے دل نے بے ساختہ دعا کی کہ اس کی یہ خوشیاں سلامت رہیں۔

"او باتوں کی پٹاری...... کیا اندر جا کر مذاکرات کرنے لگ گئی جو کام کہا ہے تجھے وہ کر۔" چاچی بختاں کی اونچی آواز سے گھبرا کر نجمہ کمرے سے نکلنے لگی۔ پھر نکلتے نکلتے شرارت سے بولی۔

"تمہاری ڈولی سجانے کی بات کرنے جا رہی ہوں...... ویسے آپس کی بات ہے یہ شادیز مانا کیسے؟" وہ

"تب وہ اندھا تھا۔" اس نے جل کر کہا۔ نجمہ ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

وہ دن بھی آ گیا جس دن شادیز اور کنیز بنت عمار ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے۔ منگنی والے دن زیادہ لوگ نہیں تھے۔ نجمہ کے گھر والے تھے اور سردار گڑھ کے سرپرست محسن شاہ کی بیوی قدسیہ بیگم اور ان کے بیٹے فیض شاہ بھی آئے تھے۔ ان کا آنا کنیز بنت عمار کے لیے اچھا شگون ثابت نہیں ہوا۔ فیض شاہ کی نظریں کنیز بنت عمار کے ملیح چہرے پر اٹک گئی تھی اور اسی دن سے اس کی بدبختی کے دن شروع ہو گئے تھے کیونکہ حویلی جانے کے بعد بھی فیض شاہ بے چین تھا۔ اس کے سامنے بار، بار اس کا چاند سا مکھڑا ہالہ بنائے کھڑا تھا۔ کنول کے پھول کے مانند کنیز بنت عمار اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ فطرت ہے انسان کی جو چیز اس کے حواسوں پہ چھا جائے جب تک حاصل نہ کرے اسے چین نہیں آتا۔ فیض شاہ کے دماغ میں جنگ چھڑ گئی۔

اس روز وہ بستر پہ لیٹا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ قدسیہ بانو اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"بیٹا وہ تمہیں میں نے داخلہ فارم لینے کے لیے کہا تھا کنیز کے لیے، وہ اسے دینا ہے اچھی بچی ہے محنتی اور ہمت والی۔" ان کے لہجے میں محبت تھی۔ یک دم فیض کے ذہن نے ایک منصوبہ بنایا۔

"اماں لیکن اسے ایسے سمجھ نہیں آئے گی اسے حویلی بلوا لیں، میں اسے سمجھا دوں گا تو وہ آسانی سے فل کر لے گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے آج نجمہ کام پر آئے گی تو اسے کہہ دوں گی۔" وہ اس پر دھیان دیے بغیر نکل گئیں۔ ابلیس اور فیض شاہ دونوں نے قہقہہ لگایا انسان ایک دفعہ پھر شیطان سے مات کھا گیا تھا۔

گلگت کی پہاڑیوں کے پیچھے ایک چھوٹا گاؤں تھا جس کے سرپرست محسن شاہ تھے۔ محسن شاہ نے دو شادیاں کی تھی۔ پہلی شادی منزہ خاتون سے ہوئی جن

دیکھ کر منزہ بیگم نے دل پہ پتھر رکھ کر خود ان کی دوسری شادی کروائی اور شادی کے محض ایک ماہ بعد دماغ کی رگ پھٹنے سے وہ خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ ان کے گزرنے کے بعد محسن شاہ گم صم ہو گئے اور قدسیہ بیگم کو وہ حق نہ دے سکے جس کی وہ حق دار تھیں۔ وقت کے ساتھ، ساتھ البتہ ایک بیٹا اللہ نے انہیں دے دیا تھا۔ فیض شاہ تین سال کا تھا جب محسن شاہ بھی راہیِ عدم ہوئے۔ ان کے گزرنے کے بعد ساری ذمے داری قدسیہ بیگم کو سنبھالنی پڑی۔ فیض شاہ شہر میں رہتا تھا پڑھائی کے سلسلے میں اور قدسیہ بیگم کی بے پروائی کی وجہ سے غلط صحبتوں میں پڑ گیا تھا لیکن ماں کو سب اوکے کی رپورٹ دیتا۔ جس دن کنیز اور شاویز کی منگنی تھی وہ شہر سے آیا ہوا تھا۔ یہیں سے اس کی زندگی بدل گئی۔ وہ معمولی سی لڑکی کنیز بنت عمار اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ زندگی کے راستوں پر آنے والے دنوں میں ایک نئی داستان جنم لینے والی تھی۔

☆☆☆

وہ بینک سے نکلا تو آج بہت خوش تھا۔ وہ کل تک زہر لگنے والی اس کی کزن ایک دم سے بہت خاص لگنے لگی تھی۔ زندگی بہت خوب صورت سی لگنے لگی تھی۔ واپسی پر اس کے دل میں کیا آیا کہ اس نے راستے سے گجرے لیے اب وہ نئی بائیک اڑاتا جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ گھر کی طرف مڑتے ہی گلی کے سامنے دو آدمی نمودار ہوئے اور انہوں نے اسے روک کر مارنا شروع کر دیا۔ ان کے چہرے نقاب میں تھے۔

”ارے کون ہو تم لوگ، کیوں مار رہے ہو مجھے؟“ اس نے بوکھلا کر پوچھا لیکن اسے کچھ نہ بتایا گیا۔ سر پر لگنے والی ایک ضرب شدید تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ مکمل طور پر بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے ذہن میں ابھرنے والا عکس کنیز بنت عمار کا تھا اور پھر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ گلی کے نکڑ پر گاڑی کے اندر فیض شاہ

”چل مختیار۔“ اس نے گاڑی کے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

برتن اچھی طرح مانجھ کر وہ ایک پرانا رسالہ لے کر پڑھنے لگی۔ چاچی بختاں بخار کے باعث سو رہی تھی۔ ابھی وہ کہانی کے دو تین صفحات ہی پڑھ پائی تھی کہ نجمہ کا پانچ سالہ بھائی گڈو بھاگتا آیا۔

”کنیز باجی...... کنیز باجی!“

”کیا بات ہے گڈو کیوں چلا رہے ہو؟“ اس نے بدمزہ ہو کر رسالہ سائڈ پہ رکھا۔ وہ کہانی میں مکمل طور پر گم تھی۔

”باجی وہ شاویز بھائی کو وڈے اسپتال لے گئے ہیں احمد چاچا لوگ، ان کو کسی نے مارا ہے۔“

”ہائے ربا!“ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ اندر سوئی بختاں چاچی ہڑبڑا کر اٹھیں۔

”کیا ہو گیا کنیزاں؟“ انہوں نے دہل کر پوچھا۔ پھر ذرا سا کمرے سے باہر نکل کر دیکھا، کنیز بنت عمار ساکت کھڑی تھی۔

”بتاتی کیوں نہیں، کیا ہوا ہے بت بن گئی ہے کیا؟“ انہوں نے اس کا کاندھا ہلایا۔

”چاچی وہ شاویز......“ آنسو حلق میں پھنس گئے۔

”بک بھی اب کیا ہوا؟ شاویز کہاں ہے، ہوا کیا ہے اسے؟“

”اسے وڈے اسپتال لے گئے ہیں۔“ اس نے اٹک، اٹک کر جواب دیا۔

”ہائے میرے اللہ کس نے میرے لال کا یہ حال کیا، بیڑا غرق ہو کم بختوں کا۔“ چاچی کی ممتا تڑپ اٹھی تھی۔

☆☆☆

وہ چند روز اسپتال میں رہ کر گھر آ گیا تھا مگر حملہ آوروں کا کچھ پتا نہیں چلا۔

وہ چولھے پر شاویز کے لیے دیسی چوزے کی یخنی بنا رہی تھی کہ نجمہ آدھمکی۔

”اوئے مجنوں کی لیلیٰ کیسا حال ہے شاویز کا؟ کچھ پتا چلا کون لوگ تھے اسے زخمی کرنے والے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے کنیز کی طرف دیکھا۔

”نہیں یار پتا نہیں کون تھے خواہ مخواہ کی دشمنی نکالی ہے، اناج بھی ختم ہے اور شاویز کے زخم ابھی تک نہیں بھرے۔“ وہ افسردہ سی بولی۔

”اچھا، اچھا فکر نہ کر ٹھیک ہو جائیں گے شاویز بھائی تم ٹینشن مت لو، میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ تمہیں باجی قدسیہ بلا رہی ہیں، کہہ رہی تھی آ کر فارم فل کروا لو وہ اپنے بیٹے کو دیں گی وہ جمع کروا آئے گا۔“

”اچھا میں ذرا شاویز کو یہ دے آؤں پھر اکٹھے چلتے ہیں۔“ وہ یخنی کا پیالہ لیے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ شاویز کے ماتھے پر ہلکا سا زخم کا تھا۔ وہ آنکھیں موندے لیٹا تھا کچھ ہی دنوں میں پڑے، پڑے چڑچڑا سا ہو گیا تھا۔

”شاویز یہ سوپ پی لیں میں تب تک حویلی ہو آؤں مالکن نے بلایا ہے چاچی سو رہی ہیں۔“

”ہاں تم بھی تنگ آ گئی ہو ناں مجھ سے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

”شاویز؟“ کنیز اس کے لہجے پر حیران رہ گئی۔ ”ایسی بات نہیں شاویز۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”ٹھیک ہے جاؤ تم۔“ وہ بیزار سے لہجے میں بولا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ باہر نکل آئی۔ حویلی کی طرف جاتے ہوئے اس کا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ حویلی کا پھاٹک پار کرتے ہی اسے قدسیہ بیگم لان میں بیٹھی دکھائی دیں۔

”السلام علیکم مالکن کیا حال ہیں؟“

”آؤ کنیز کیسی ہو، کیا بات ہے آج کل آتی نہیں۔“

”بس گھر کے کام ہوتے ہیں۔“

”اچھا وہ تمہارے منگیتر کا کیا حال ہے؟“

”وہ ٹھیک ہے۔“ اس نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ چمن میں چٹی طوطے شور مچا رہے تھے۔

”چائے بنواؤں تمہارے لیے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں، میں بس وہ فارم لینے آئی تھی۔“

”ہاں، ہاں وہ تم فیض کے کمرے میں چلی جاؤ، وہ فل بھی کرا دے گا اسی سے منگوایا ہے۔“ فیض شاہ کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کنیز بنت عمار کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کہاں پھنسنے جا رہی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ فیض شاہ کھڑکی کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ جہازی سائز بیڈ جس کے اوپر سرہانے تاج بنا ہوا تھا نرم، نرم گدے پر بچھا خوب صورت بیڈ کور اس کا دل چاہا اسے اٹھا کر ساتھ ہی لے جائے۔ اسی لمحے فیض شاہ نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگا۔ آنکھیں نیچے کیے وہ کسی دوسرے جہان کی باسی لگ رہی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا اس کے قریب آیا اور اپنا ہاتھ اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ کنیز کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

”تمہاری جگہ یہاں ہونی چاہیے ناں کہ بان کی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر۔“ وہ مخمور آواز میں بولا۔ اس نے آگے بڑھ کر کنیز کو چھونا چاہا، وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

”میں وہ فارم لینے آئی تھی۔“

”مل جائے گا فارم بھی کچھ دیر تو بیٹھو۔“

”نہیں مجھے گھر کے کام کرنے ہیں۔“ وہ خوفزدہ ہوئی۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ اس نے اچانک سے پوچھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ اسے حویلی اپنے اوپر گرتی نظر آئی، وہ الٹے قدم ہٹی اور کچھ کہے بنا وہاں سے نکل کر بھاگتی چلی گئی، گھر کا دروازہ کھولتے ہی اسے لگا جیسے کسی بیاباں سے چھاؤں میں آ گئی ہو۔ مٹھو اور چاچی بختاں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ ابھی سو کر اٹھی تھیں۔

”کیا ہے کنیزاں پیچھے بلائیں لگی ہیں کیا؟“

”بلائیں ہی سمجھیں۔“ اس نے گھبرا کر سوچا اور کمرے میں گھس گئی۔

دوسرا دن اس کے لیے اور منحوس خبر لایا تھا،

قدسیہ بیگم بیٹے کا رشتہ لے کر چلی آئی۔ بختاں چاچی ہکا بکا رہ گئی۔

"آپ جانتی ہیں وہ میرے بیٹے کی منگ ہے پھر بھی؟" انہوں نے حیرانی سے کہا۔

"میں جانتی ہوں لیکن کل آپ کی لڑکی حویلی آئی تھی اور فیض کا کہنا ہے اس میں آپ کی لڑکی کی مرضی شامل ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا، وہ ایسی نہیں ہے۔" انہوں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ کمرے سے باہر آتا شاویز چکرا کر رہ گیا۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

"خیر میں چلتی ہوں آپ لوگ سوچ سمجھ کر جواب دیں۔"

"آپ یہاں سے چلی جائیں اور دوبارہ مت آیئے گا، ہماری کنیز گری پڑی لڑکی نہیں ہے۔" شاویز ان کی طرف بڑھا۔

"بیٹا میں نے بتا دیا ہے ناں تم اندر جاؤ۔"

"نہیں اماں کنیز او کنیز۔" اس نے غصے سے آواز دی۔ وہ گھبرا کر باہر نکلی۔ اماوس کے چاند نے اس کی محبت کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

"تم حویلی کیوں گئی تھیں؟"

"بیٹا اسے میں نے بھیجا تھا۔" چاچی بختاں بیٹے کے تیور دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"کیوں، میں مر گیا تھا کیا؟"

"اللہ نہ کرے، کیسی باتیں کرتے ہو۔" اس دوران وہ مٹی کا بت بنی کھڑی تھی۔ شاویز غصے میں باہر چلا گیا اور قسمت کہ آگے سے فیض شاہ آ رہا تھا۔ وہ ایک نفرت بھری نگاہ اس کی طرف ڈال کر گزرنے لگا تھا کہ فیض شاہ کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

"ہیرا ہمیشہ حویلی میں اچھا لگتا ہے غریب کی کٹیا میں اس کا کیا کام۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" شاویز اس کی طرف پلٹا۔

"مطلب یہ کہ کنیز بنت عمار میری حویلی دیکھ کر بہت مرعوب ہے مروت میں تم لوگوں کے ساتھ ہے۔"

"دیکھ فیض شاہ عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے تو ہمارا سربراہ ہے لیکن اگر عزت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"تیری قسمت اچھی تھی جو پچھلی دفعہ بچ گیا لیکن اب تیرا پکا بندوبست کرنا پڑے گا۔" اس نے سوچا اور ماں کو لے کر چلا گیا۔ شاویز گھر آ کر کتنا چلایا تھا تب کنیز بنت عمار نے سوچا تھا کہ وہ فیض شاہ کو جواب ضرور دے گی۔

☆☆☆

تاروں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا اور کمرے میں بیٹھا شاویز بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔

"آج منڈی میں پھل فروخت کر کے اماں سے کہوں گا بس ہماری شادی کر دیں۔" صبح سویرے ہی وہ سامان اٹھوا کر منڈی کی طرف گیا اور اس کے جانے کے بعد کنیز نے غصے میں حویلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہیں سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ لندن کی یخ بستہ ہواؤں کی سرگوشی کو محسوس کر رہا تھا۔ اس پر ایک زندہ لاش کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے جیسے کوئی مسافر لمبا سفر کر کے آیا ہو۔ فلیٹ کشادہ ہونے کے باوجود اسے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ ٹھنڈی ہوا اس کے وجود سے ٹکرائی تبھی کمرے میں فون کی بیل بجی۔ اس نے چونک کر موبائل کی طرف دیکھا۔ جہاں آئمہ چوہدری کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کال اٹینڈ کی۔

"ہیلو!"

"ہیلو کے بچے۔ جلدی دروازہ کھولو، دس منٹ سے بجا رہی ہوں ایسی بھی کیا بے خبری کہ بندے کو بیل بھی نہ سنائی دے۔" وہ ہمیشہ کی طرح شروع ہو چکی تھی شاویز نے کال بند کی اور دروازہ کھول دیا۔ جینز اور وائٹ شرٹ میں آئمہ چوہدری چیونگم چباتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ پرس صوفے پر اچھال کر کچن میں بڑبڑاتی ہوئی داخل ہوئی۔

"کتنی دفعہ کہا ہے ہمارے گھر میں آ کر رہو لیکن محترم خوددار اتنے ہیں کہ گوارا نہیں۔" وہ کافی بنانے کے ساتھ شاویز کو سنا رہی تھی۔

"نوکرانی ان کو رکھنی نہیں، پرائیویسی میں دخل ہوتا ہے ایسی بھی کیا پرائیویسی کم از کم اپنا کچھ خیال کر لو۔" شاویز کو کافی کا کپ دیتے ہوئے کہا۔

"توبہ کمرا کتنا گندا کیا ہوا ہے۔" وہ پھیلاوا سمیٹنے لگی۔

"کیوں صبح، صبح میرے سر پہ سوار ہو جاتی ہو۔ کتنی دفعہ منع کیا ہے تمہیں۔"

"اس لیے کہ شاویز حسن میں محبت کرتی ہوں تم سے چاہے زبردستی کی ہی سہی۔"

"میں محبت کو نہیں مانتا۔" وہ دور کہیں خلاؤں میں تکتے ہوئے بولا۔

"محبت خود کو منوا لیتی ہے، اچھا اس بحث کو چھوڑو، پاپا نے جلدی آنے کا کہا ہے آج مسٹر رچرڈ کے ساتھ ایک اہم میٹنگ ہے چلو تم ریڈی ہو جاؤ، میں ذرا اپنی ای میلز چیک کر لوں، تمہارا لیپ ٹاپ کہاں ہے؟"

"میز پر پڑا ہے۔" وہ کہتا ہوا واش روم میں گھس گیا۔ آئمہ نے اپنا اکاؤنٹ کھولا اور ای میل چیک کرنے لگی۔

"جیولیٹ کی ای میل، اسے مجھ سے کیا کام؟"

"آئمہ چوہدری تمہارے اس پاکستانی دوست کے کوئی تین چار بار خط آئے ہیں میرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے پاپا نے اپنا نیا ایڈریس دے دو یا پھر میں انہیں پھینک دوں گی کیونکہ میرے بوائے فرینڈ کو لگتا ہے یہ سب میرے کسی عاشق کے ہیں۔ وارننگ۔ بائے۔"

"شاویز کے خط...... کون لکھ سکتا ہے۔" وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اتنے میں شاویز واش روم سے برآمد ہوا، اس نے گھبرا کر لیپ ٹاپ بند کیا مبادا دل میں چھپا چور پکڑا جائے۔

"تمہیں کیا ہوا، چہرے کو دیکھو رنگ کتنا بدلا ہوا ہے سب خیر تو ہے ناں؟" شاویز نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔

"ہاں ٹھیک ہے سب بڑے آئے چہرے پڑھنے والے دل تو پڑھتے نہیں۔" اس نے غصے سے کہا۔

"کیونکہ دل تو پاگل ہے۔" وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ ایک لمحے کو آئمہ کا دل کیا کہ اسے سب بتا دے لیکن دل نے اسے روک دیا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھے اور گاڑی اپنے جانے پہچانے راستوں پر سفر کرنے لگی۔

شاویز اپنے ایک جاننے والے کے توسط سے یہاں لندن آیا تھا لیکن لندن آنے کے بعد وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ شاید خودکشی کر لیتا اگر اسے آئمہ چوہدری نہ ملتی۔ ایک روز وہ لندن کی سڑک پر ٹھنڈ کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ تب آئمہ اسے اپنے گھر لے آئی تھی کئی دن وہ غنودگی میں رہا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کئی دن گم صم رہا۔ اس کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ یہاں ملازمت کے سلسلے میں آیا ہے۔ آئمہ نے اس اپنے باپ کی فیکٹری میں جاب دلا دی۔ شفقت چوہدری لندن کے مانے ہوئے بزنس مین تھے۔ دھیرے دھیرے آئمہ اسے پسند کرنے لگی تھی۔ یہاں اس کی رہائش کا مسئلہ ہوا کیونکہ وہ ان کے گھر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجبوراً آئمہ نے اسے اپنی دوست جیولیٹ کے دو کمروں کے فلیٹ میں رہائش دلوا دی۔ وہ ایک سال اور دو ماہ وہاں رہا پھر جیولیٹ کا بوائے فرینڈ آ گیا اور اس نے شاویز کو وہ جگہ چھوڑنے کو کہا لیکن تب تک شاویز ماں کو اپنی خیریت کا خط جیولیٹ کے فلیٹ والے ایڈریس سے لکھ چکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ کوئی اس کو جوابی خط بھی لکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی الجھی ہوئی زندگی میں مگن تھا۔ ایک دن آئمہ نے اسے پرپوز کیا لیکن اس نے اتنا کہا۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہیں دکھ پہنچے، ویسے بھی میں ایک شکستہ انسان ہوں جو کسی کا نہیں ہو سکتا۔"

☆☆☆

’’اس کا اور میرا تعلق کچے دھاگے کا نہیں ہے کہ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے ٹوٹ جائے۔ روح کے دھاگے کبھی نہیں ٹوٹتے۔ یہ اٹوٹ ہوتے ہیں۔ شاویز اور میرا تعلق بھی ایسا ہی ہے جیسے خزاں کے موسم میں بکھرے پتوں کے بغیر منظر مکمل نہیں ہوتا ویسے ہی کنیز بنت عمار، شاویز کے بغیر ادھوری ہے اور میں اس کی چاہتوں کی ڈور کے ساتھ بندھ چکی ہوں۔ میرے ساتھ یہ سارے موسم اسے کیسے بھولیں گے۔ اس نے ان تمام چیزوں سے محبت کی ہے ناں اگر مجھ سے نہیں تو......‘‘ کنیز نے جال در جال پھیلے ہوئے امرودوں کے درخت پر لٹکتے ہوئے پھلوں کو دیکھ کر کہا۔ اگرچہ جاڑے کا موسم تھا، خشک گھاس پر شبنمی قطروں کی بارات تھی۔ وہ دونوں خشک نالے پر بیٹھی تھیں۔ فضا میں نامانوس اداسی کی لہر تھی خشک ہوائیں اِدھر اُدھر لہرا رہی تھی۔ ٹالی کے زرد پتے صدائیں دے رہے تھے۔ مومنہ اس کی پھوپی زاد چند دن پہلے آئی تھی۔ اسے گاؤں دیکھنے کا شوق تھا لیکن اس کے سب ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ کنیز بنت عمار کو تو شاویز کے نام کی تسبیح پڑھنے میں مگن ہوتی تھی۔

’’اچھا۔‘‘ مومنہ نے لیموں کے چھلکے نالے میں پھینکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

’’مت کھا، کھٹے ہیں۔‘‘ کنیز نے اس کی آنکھوں میں آئے آنسو دیکھ کر کہا۔

’’پتا ہے شاویز کو لیموں کا اچار بہت پسند تھا۔‘‘

’’تمہاری تان شاویز پر ہی آ کر کیوں ٹوٹتی ہے...... تو پھر وہ گیا کیوں؟ اگر اسے آنا ہوتا ان تین سالوں میں آجاتا ناں......! اس نے فیض شاہ کی بات کا یقین کیوں کیا۔ کبھی، کبھی مسافر رستہ ہمیشہ کے لیے بھول جاتے ہیں اور مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں، چلو اب گھر چلیں۔ ایک طرف کہتی ہو اس نے میرا یقین نہ کیا دوسری طرف اس کی آمد کی منتظر ہو۔‘‘ مومنہ نے بیزاری سے کہا۔

’’تمہیں یہ تو یقین ہے ناں مومنہ کہ قیامت نے ایک دن آنا ہے۔‘‘

’’ہاں الحمدللہ میں مسلمان ہوں کیوں یقین نہیں ہوگا بھلا۔‘‘ مومنہ حیرت سے بولی۔

’’اور میرا یقین ہے کہ میری زندگی ختم ہونے سے پہلے وہ ضرور لوٹ آئے گا، تم کہتی ہو ناں مجھے اشک کیوں نہیں آتے کیونکہ مجھے غم نہیں ہے...... مجھے امید ہے اور امید کبھی غمزدہ نہیں ہوتی۔‘‘ کنیز نے کھڑے ہو کر اپنی اوڑھنی جھاڑتے ہوئے کہا۔

’’ایک تو مجھے تمہاری یہ فلسفہ ٹائپ باتیں سمجھ نہیں آتیں۔‘‘ مومنہ اب اچھی خاصی جھنجلا چکی تھی۔

’’کیونکہ تم نے کبھی محبت نہیں کی مومنہ۔‘‘

’’اچھا چل ورنہ ممانی میرا بھرکس نکال دیں گی کہ میرا خیال نہیں اور نکل پڑی ہو سیر سپاٹوں کو۔‘‘ مومنہ نے چاچی بختاں کی نقل اتاری۔

’’ویسے کنیز میری بھابی بن جاناں، احمر بھائی بہت اچھے ہیں مگر ایک تم ہو کہ مانتی نہیں...... اچھا چلو اب۔‘‘ مومنہ نے اسے بت کی طرح ساکت کھڑے دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

آج ان کی بہت اہم میٹنگ تھی۔ آئمہ ہوٹل بلیوسون میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شام کے چھ بجنے والے تھے شاویز راستے میں تھا۔ بیولیٹ کا آج پھر فون آیا تھا کہ اس کے لیے ایک اور چٹھی آئی ہے اور اب وہ کشمکش میں تھی کہ شاویز کو بتائے یا نہ بتائے کیونکہ وہ شاویز کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جس وقت وہ پہنچا، پورے ایک گھنٹا لیٹ تھا۔

’’آج پھر تم لیٹ ہو گئے۔‘‘ آئمہ نے اسے بے نیاز دیکھ کر غصے سے کہا۔ وہ مسکرایا۔

’’شاید بہت لیٹ ہو گیا ہوں اب تو واپسی کے راستے بند ہیں۔‘‘

’’واہ، واہ جناب شاعر بھی بن گئے ہیں، وہ کیا کہتے ہیں۔ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں، اچھا ہماری نو بجے آج مسٹر رچرڈ کے ساتھ میٹنگ ہے۔‘‘ جس وقت وہ لوگ پہنچے سب پہلے ہی سے پہنچ چکے تھے۔ ان کی میٹنگ اچھی رہی۔ واپسی پر وہ دونوں کافی مطمئن تھے۔

’’شاویز تمہیں پتا ہے کل بہت اہم دن ہے؟‘‘

’’کون سا اہم دن؟‘‘ وہ بھنویں اچکا کر بولا۔

’’بس میں نہیں بتاتی۔‘‘ وہ روٹھ گئی۔ شاویز رخ موڑ کر مسکرایا۔

’’اچھا ٹھیک ہے مت بتاؤ۔‘‘ وہ فوراً مان گیا۔ آئمہ نے اچانک گاڑی روک دی تھی۔

’’کیا ہوا؟‘‘ وہ حیران ہوا۔ ’’گاڑی کیوں روکی تم نے؟‘‘

’’تم ذرا بھی میری پروا نہیں کرتے، میں ہی ڈفر ہوں جو تم سے اتنی محبت کرتی ہوں کوئی اور ہوتی تو تمہیں چھوڑ کر چلی جاتی۔‘‘

’’آئمہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا مجھ سے اتنی محبت مت کرو، میں اس قابل نہیں۔‘‘ وہ اذیت سے مسکرایا تھا۔

’’محبت کہاں ان چیزوں کو دیکھتی ہے، یہ تو دل میں بن کہے اتر جاتی ہے۔‘‘

’’میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا، آئمہ پلیز تم میری اچھی دوست ہو، میں اچھی دوست نہیں کھو سکتا۔‘‘

’’اچھے دوست کے ساتھ زندگی گزر جاتی ہے پاپا روز مجھ پر زور دیتے ہیں کہ میں شادی کر لوں لیکن میں کیا کروں میں تمہارے علاوہ کسی اور کا سوچ نہیں سکتی۔‘‘

’’پلیز آئمہ لیو دس ٹاپک۔‘‘ وہ یک دم سے کٹھور بن گیا۔

آئمہ نے چپ چاپ گاڑی چلا دی وہ اب سوچ چکی تھی کہ شاویز سے بات نہیں کرے گی۔ شاویز کا فلیٹ آیا تو وہ چپ چاپ اتر گیا۔ آئمہ خاموشی سے گھر آگئی۔ رات بھر وہ کافی ڈسٹرب رہی صبح ایک سرپرائز اس کا منتظر تھا۔ اس کے سرہانے گلاب کے پھول ایک گفٹ پڑا تھا جس پر لکھا تھا۔ ’’محبتوں کی شہزادی آئمہ چوہدری کے لیے۔ جنم دن مبارک ہو...... فرام شاویز۔‘‘ وہ خوشگوار حیرت میں گھر گئی۔ گفٹ کھولا تو

اندر سے سرخ جیکٹ اور ساتھ میں کالی چوڑیاں۔

''اچھا تو جناب کو میری سالگرہ یاد تھی ایسے ہی بن رہے تھے۔'' ہنسی اس کے لبوں کا احاطہ کر چکی تھی۔ ''خان چاچا!'' اس نے نوکر کو آواز دی۔ ''شاویز کب آیا تھا؟''

''بیٹا وہ تو کل بارہ بجے یہ سامان رکھ کے چلے گئے تھے۔''

''اچھا ٹھیک ہے آپ جائیں۔'' اس نے موبائل کھولا، دو میسج آئے ہوئے تھے، ایک شاویز کا ایک جیولیٹ کا۔

''ریڈی ہو کر فلیٹ میں آجاؤ۔''

''پانچ منٹ ویٹ میں ریڈی ہو کر آتی ہوں۔'' اس نے شاہ ویز کو ریلائی کیا۔ اس نے جیولیٹ کا میسج کھولا لکھا تھا۔

''آئمنہ کی بچی اپنی شکل دکھاؤ اور وہ خط لے جاؤ ورنہ آج بٹلر کو دے دوں گی یہ۔'' اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے۔

''چلو یہ پتا چلے وہ خط ہیں کس کے۔'' وہ سوچ رہی تھی اور گاڑی کا رخ جولیٹ کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ ہلکی، ہلکی بارش برس رہی تھی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ شاویز کی تھوڑی سی توجہ اس کی زندگی میں مسکان لے آئی تھی۔ جیولیٹ اپنے نیگرو والے فرینڈ کے ساتھ تاش کھیل رہی تھی۔

''اوہ ہائے آئمنہ۔'' وہ بولی۔ ''میں وہ لیٹرز لے کر آتی ہوں۔'' نیگرو نے اپنے دانت نکالے۔

''یو آر پریٹی۔'' اسے کوفت ہونے لگی۔

''یہ لو آئمنہ۔'' اس نے لفافے آئمنہ کو پکڑا دیے۔

''تم کافی لو گی؟'' اس نے پوچھا۔

''نو، نو جیولیٹ آج میری برتھ ڈے ہے، مجھے پارٹی پر پہنچنا ہے۔''

''اوہ اچھا، ہیپی برتھ ڈے۔''

''تھینکس جیولیٹ، اچھا میں چلتی ہوں۔'' اس نے خط پرس میں رکھے اور گاڑی میں بیٹھی پھر اس کے جی میں آیا پڑھ لے۔ فطری تجسس کے تحت اس نے لفافے کھولنے شروع کیے۔ جیسے، جیسے وہ پڑھتی گئی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا، آنکھیں جیسے مرچوں سے بھر گئیں۔

''تو یہ تھا تمہاری خاموشی کا راز، اتنا بڑا دکھ تم چھپائے ہوئے تھے بتایا بھی نہیں اور مجھے اپنا دوست کہتے ہو تم، کہاں کی دوستی ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ وہ رو رہی تھی۔

''اب مجھے شاویز کو خوش دیکھنا ہے۔'' گاڑی اس نے ہوٹل کی طرف موڑ دی۔ دور سے اسے شاویز کے ساتھ پاپا اور نیلی آنکھوں والا احمر شجاع بھی دکھائی دیا جو اس کی توجہ کا متلاشی رہتا تھا۔

''اتنی دیر لگا دی بیٹا۔'' پاپا نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ ''ہیپی برتھ ڈے مائی چائلڈ۔''

''تھینکس پاپا۔''

''سالگرہ مبارک ہو آئمنہ!'' احمر شجاع نے خوب صورت پھولوں کا بکے اس کی طرف بڑھایا۔

''تھینکس احمر۔'' اس نے جان بوجھ کر احمر کو گلے سے لگا کر بوسہ دیا۔ شاویز نے حیرانی سے اس کی حرکت کو دیکھا۔

''چلو کیک کاٹیں۔'' شاویز نے اس کی کلائی تھامنا چاہی مگر اس نے احمر کا ہاتھ پکڑا۔

''آج میں کیک احمر کے ساتھ کاٹوں گی۔'' وہ شاویز کو حیران کر رہی تھی۔ کیک کٹ چکا شاویز کو اس کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا۔

''شاویز۔'' وہ اسے پکار رہی تھی۔ ''کبھی، کبھی ہم وہ دیکھتے ہیں جو سچ نہیں ہوتا، سراب کے پیچھے بھاگنا میری بے وقوفی تھی، یہ لو تمہاری منزل۔'' اس نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''کیا ہے اس میں؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری جنت، میری طرف سے ایک گفٹ۔'' وہ مسکرائی۔

''پتا نہیں آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔''

''مجھے آج حقیقت سمجھ آگئی ہے۔ شاویز تم دیر نہ کرو انہیں گھر جا کر پڑھنا بس اب تم جاؤ یہ نہ ہو کہ میں پھر روک لوں۔'' وہ یہ کہہ کر اندر چلی آئی۔

☆☆☆

موسم ابر آلود تھا۔ بادل پورے آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ ''کیا پتا آج بارش ہو چلو جھاڑ دوں لو پھر گند چمٹ جاتا ہے مٹی سے، ایک تو یہ گلگت کی خنک ہوائیں بھی ناں مانو وجود کو برف بنا دیتی ہیں۔'' اس نے تیلی باریک جھاڑو صحن میں لگانی شروع کی لیکن پتے تھے کہ جابجا بکھر جاتے۔ پورے گھر میں ٹاہلی اور شہتوت کے پتے جابجا بکھرے ہوئے تھے۔

''چاچی!'' اس نے سوئی میں دھاگا ڈالتی چاچی کو مخاطب کیا۔ ''آج پکوڑے بناؤں کیا؟''

''بیسن ختم ہے جاؤ جا کر قریشی کی دکان سے لے آؤ، شاویز کو بھی پکوڑے بہت پسند تھے جانے پردیس میں نصیب ہوتے بھی ہوں گے میرا لال رُل گیا۔'' انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ کنیز بنت عمار بوجھل دل کے ساتھ مٹھو کے پنجرے کے پاس آکھڑی ہوئی۔

''دیکھ مٹھو تو ہی کوئی دعا کر، دعا میں بڑی قوت ہے، ہم تو اللہ کے خطا کار بندے ہیں اللہ فرماتا ہے کہ معاف کرنے والا انسان افضل ہوتا ہے جب بندہ معاف کرے گا تو خالق راضی ہوگا میرا رب مجھ سے روٹھا ہے، وہ لوٹ آئے تو......'' آنکھوں کی باڑ سے آنسوؤں نے چھلکنا شروع کر دیا۔ چاچی اس کا ہر معاملے میں ساتھ دیتی تھیں لیکن جب بھی شاویز کا ذکر آتا وہ خاموش ہو جاتیں...... طوطے نے سرگوشی کی اور کنیز بنت عمار نے تڑپ کے رونا شروع کیا۔

☆☆☆

شاویز نے پہلا خط کھولا۔

12 فروری 2004ء

''کیسے ہو شاویز؟ کسی کی اندھیری زندگی میں روشنی بھر کے پھر اندھیرا کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔ میں کوئی وضاحت نہیں مانگتی کوئی سوال نہیں، مجھے کسی دلیل کی ضرورت نہیں آکر دیکھ جاؤ، میں نے تمہارے لمس گھر کے کونے، کونے میں اتار دیے ہیں۔ خدا کہتا ہے جب تک بندہ ناراض تو میں ناراض۔ مجھے خدا کو راضی کرنا ہے، میں نے مومنہ کے دعوے کو غلط ثابت کرنا ہے لوٹ آؤ...... اس سے پہلے کہ میں خدا کو راضی کرنے کے موقع سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ چاچی کی ویران آنکھیں دیکھتی ہوں تو ہول اٹھتے ہیں وہ کچھ نہیں کہتیں لیکن ان کی نظریں سب کہانی بتا دیتی ہیں۔ اس شہر کے باسی کنیز بنت عمار پر ہنستے ہیں۔ نجمہ کی نت نئی کہانیاں بھی دل پر جمی گرد کو دھو نہیں سکتیں۔ مجھے افق کی روشنی سے اس کے زوال تک تمہارا انتظار رہتا ہے۔ بچی گلیوں میں اب رنگ نہیں اترتے۔ بنٹوں سے کھیلتے بچے ساکت ماحول میں چپ چاپ کھیلتے رہتے ہیں میں روز منڈیر پر کوؤں کی آمد کا انتظار کرتی ہوں۔ چاچی کہتی ہیں یہ آئیں تو کسی مہمان کو بھی ساتھ لاتے ہیں لیکن وہ بھی نہیں آتے کبھی کبھی انسان جو سمجھ رہا ہوتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتی۔

تمہاری آمد کی منتظر

کنیز بنت عمار''

5 جنوری 2005ء

''نئے سال کا چن چڑھا۔ سب گھروں میں خوشیاں تھیں ساتھ والی نجمہ کی بات پکی ہو گئی ہے۔ اپریل میں اس کی شادی ہے۔ چاچی نے میٹھے گڑ والے چاول پکائے ہیں لیکن خود نہیں کھائے نہ میرے حلق سے اترے۔ امید ہے تم خیریت سے ہو گے۔ ایک، ایک لمحہ انتظار کرنے کے بعد دوسرا خط لکھ رہی ہوں۔ امرودوں کے باغ میں اب کیڑوں کی حکمرانی ہے۔ برگد کے تمام درخت سوکھنے لگے ہیں۔ گڈو آج کل ہمارے گھر میں بہت پایا جاتا ہے اسے وہ چاچا والی سائیکل پسند آگئی ہے مگر میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی۔ تمہارے لمس کو کیسے کھو دوں؟ چاچی روز پیر مراد شاہ کے مزار پر دیا جلانے جاتی ہیں کہ شاید تم لوٹ آؤ۔ سردار فیض شاہ کی من مانیاں بڑھ گئی ہیں اس نے پھر سے ماں کو بھیجا ہے چاچی کہتی ہیں میں ہاں کر دوں کیونکہ دو سال ہونے کو ہیں تمہاری کوئی خیر خبر نہیں ہے

اور برادری کے سربراہ بھی آئے تھے۔ ویسے بھی اکیلی عورتوں کا رہنا ٹھیک نہیں۔ میرے ہاں کرنے سے بھی برگد کے پیڑوں کو دوسرا کوئی دیوتا منظور نہیں۔ میں جانتی ہوں غلطی میری بھی ہے شاید پر تمہیں مجھ پہ یقین ہونا چاہیے تھا۔ مجھے فیض شاہ کی حویلی میں نہیں جانا چاہیے تھا اور اگر تم مجھ سے یوں سوال نہ کرتے یا میں ہی وضاحت دے دیتی تو تم بھی نہ روٹھتے۔ مجھے میرے مان نے خالی لوٹایا۔ مجھے لگتا تھا میں جواب نہ بھی دوں تو بھی تم مجھے غلط نہیں سمجھو گے پر اب مجھے لگتا ہے میں نے غلطی کی تھی' مجھے وضاحت دینی چاہیے تھی۔ میرے تمہارے تعلق میں ابلیس نے دیواریں کھڑی کر دی تھیں جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو سمجھنے اور سچائی دیکھنے میں ناکام رہے۔ ہجر کے لمحوں کو ختم کر دو شاویز ..... اب لوٹ آؤ۔

فقط

کنیز بنت عمار۔''

اس نے تیسرا خط کھولا۔

5 دسمبر 2006ء

''اکثر روٹیاں پکاتے ہوئے سوچوں میں گم بیٹھی رہتی ہوں اور روٹیاں جل جاتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں میں کبھی کبھی جان بوجھ کر الٹے سیدھے کام کرتی ہوں لیکن چاچی مجھے کچھ نہیں کہتیں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ چاچی بہت چپ رہنے لگی ہیں اور تم پیسے مت بھیجا کرو۔ ویسے بھی ان کا کیا کریں گے، میری وہی روٹین ہے چاچی کو ایک دفعہ فون تو کر دو شاویز۔ میری ندامت کم ہو جائے۔ میں یہ اعتراف کرنے میں نہیں ہچکچاتی کہ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے مالکن قدسیہ نے بلوایا تھا اور اسی دن فیض شاہ بھی حویلی آیا ہوا تھا۔ میری بدبختی کے اماوس کا چاند میری زندگی میں داخل ہو چکا تھا۔ فیض شاہ کی نگاہیں خود پر پڑتے ہی میں نے پہچان لی تھی کہ عورت خود پر پڑنے والی ہر نگاہ کو جان جاتی ہے (تمہیں اس کا غم ہے کہ میں حویلی کیوں گئی) تم بیمار تھے میں تو قارم لینے گئی تھی تاکہ تمہیں تکلیف نہ ہو۔ مجھے اس بات کا غم ہے صرف کہ تم نے میرا یقین نہ کیا اگر تمہیں میری بات کی وضاحت چاہیے تھی تو تم نے اب تک یقین کر لیا ہوگا کہ میں فیض شاہ کی دلہن بن چکی جو تم نے اس دن دیکھا وہ سچ نہیں تھا شاویز وہ سراب تھا نظر کا دھوکا۔ میں اس سے ملنے یا رحم کی بھیک مانگنے نہیں گئی تھی بلکہ یہ کہنا تھا کہ وہ میری شاویز کی محبت کو جانتا نہیں۔ وہ ہنسا تھا مجھ پر لیکن میں اب بھی اس یقین کے ساتھ ہوں اب تمہیں اور کیا وضاحت چاہیے سردیوں کا موسم ہے اور سردیوں کی صبح تو اور بھی اداس ہوتی ہے۔ صبح جب دھند ہوتی ہے تو میرے دل میں اداسی بڑھ جاتی ہے۔ اک خنک احساس کے ساتھ میرے دل کی دنیا میں کہر بڑھتا جاتا ہے۔ مجھے میرا مان لوٹا دو۔

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

کنیز بنت عمار۔''

11 جنوری 2007ء

''اداسیوں کے موسم میں
وقت کے شکنجے میں
تم نے ہم کو چھوڑا تھا
دل ہمارا توڑا تھا
اور آج کچھ تو ایسا ہے
چاند تیرے جیسا ہے
رات کی خاموشی میں
یاد تم جو آتے ہو
جی کو ہم جلاتے ہیں
وحشتوں کے موسم کو
اب تو دور کر دو ناں
روشنی سے بھر دو ناں

فقط تمہاری کنیز بنت عمار۔''

آخری خط میں صرف یہ نظم درج تھی۔

شاویز کی آنکھیں پانیوں میں ڈوب گئیں۔

''تم ٹھیک کہتی ہو کنیز محبت کو وضاحت کی ضرورت نہیں۔ میں ہی پاگل تھا، محبت کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں کسی میڈل یا جیت کی ضرورت نہیں، محبت تو خود ایک جیت ہے۔''

''تمہاری کنیز مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔''

اس کی آنکھوں میں اچانک سے مرچیں بھر گئیں ایک منظر سامنے ابھرا۔

''جھوٹ بولتے ہو تم وہ ایسی نہیں ہے۔'' اس نے فیض شاہ کو یقین سے کہا۔

''اچھا ویسے بھی تم اسے کیا دے سکتے ہو، میرے پاس ہر وہ آسائش ہے جو اسے سکھی رکھ سکتی ہے۔'' فیض شاہ نے اسے کہا تھا۔

''کنیز کا تمہاری حویلی میں بھلا کیا کام؟ آئندہ اس کا نام لیتے ہوئے سو بار سوچنا فیض شاہ، عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے تم اگر سردار ہو تو میرے اندر بھی خاندانی کا خون ہے یہ میری وارننگ سمجھو۔''

''دیکھ لوں گا میں تمہیں۔'' اس نے اپنے پیچھے آواز سنی تھی۔ گھر آ کر وہ کتنا چلایا تھا۔

''کنیز تم حویلی کیوں گئی تھیں..... میں مر گیا تھا کیا؟''

''کیا بات ہے شاویز کیوں چلا رہے ہو؟'' اماں کمرے سے نکلیں۔

''اماں کہہ دو اسے آج کے بعد حویلی گئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

''لیکن کیوں شاویز؟ مجھے مالکن بلاتی ہے تو جانا پڑتا ہے..... ان کے احسان ہیں۔''

''مگر تم آج کے بعد نہیں جاؤ گی۔''

''ٹھیک ہے نہیں جائے گی چاچا کنیز اس کے لیے لسی لے آ۔'' چاچی نے شاویز کا دھیان بٹانا چاہا تھا۔

''کیا سردار فیض نے شاویز کو کچھ کہا ہے، میں اس کا منہ توڑ دوں گی ابلیس کہیں کا۔'' اس نے سوچا تھا۔ شاویز کے جانے کے بعد وہ نکلی تھی۔ اسے راستے میں فیض شاہ نظر آ گیا تھا۔

''بلے او بلے ہماری شہزادی کی آج ہم پہ کیسے نظر پڑی ہے۔'' وہ خباثت سے مسکرایا تھا۔ ''شادی کر لو مجھ سے فائدے میں رہو گی۔''

''مجھے عارضی چیزوں سے نہ بہلاؤ سردار فیض شاہ۔ آسمان کی اڑان بھرنے والے پرندے زمین کی طرف نہیں دیکھتے ان کے ارادے کچھ اور ہوتے ہیں اور ان کے ارادے پکے ہوتے ہیں جو کوئی چیز نہیں مٹا سکتی۔''

''لیکن ان کو گرنے کا خوف رکھنا چاہیے۔'' ایک زہریلی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی گئی۔

''گرنے کا خوف ان کو ہوتا ہے جن کو گرنے کا خطرہ ہو۔ اگر میں گر بھی گئی تو مجھے سنبھالنے والے ہاتھ ہیں' تم میری اور شاویز کی محبت کو جانتے نہیں، پانی میں مل جائے تو بھی سب سے ممتاز نظر آئے گی۔'' اور شاویز کچھ سن تو نہ پایا بس کنیز کو اس کے قریب دیکھ کر اس کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور وہ سب کچھ چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ کنیز نے اسے گھر سے نکلتے نہیں دیکھا لیکن دروازے پر گری چابیوں اور شاویز کے بٹوے میں لگی اپنی تصویر گری دیکھ کر وہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔

☆☆☆

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس نے خود کو پرسکون سا محسوس کیا۔ برگد کے پیڑوں کو آمد کی نوید دی۔

''اب میں آ گیا اب تمہارے کھلنے کے دن ہیں۔'' گھر میں قدم رکھتے ہی اسے ماں کی صورت نظر آئی۔ بختاں نے اسے بنا کچھ کہے گلے لگا لیا۔ طوطے نے ٹیں، ٹیں کی آواز نکالی جیسے اس کی آمد سے خوش ہوا ہو۔ کمرے سے آٹے کی پرات لے کر نکلتی کنیز بنت عمار کے ہاتھوں سے آٹے کی پرات گر گئی۔

''ارے کتنا رزق ضائع کرتی ہو تم۔'' وہ اس کے سامنے جا کر مسکرایا تھا۔

''اپنوں سے معافی نہیں مانگی جاتی یہ مجھے کنیز بنت عمار نے ہی سکھایا تھا۔'' گرد کے بادل چھٹ گئے تھے اب ان دونوں نے برگد کے پیڑوں کو نئے سرے سے سجانا تھا۔ عشق کی کونپل دوبارہ مضبوطی سے جڑ گئی تھی۔ محبت دل کی سرزمین پر پھر سے لوٹ آئی تھی۔ کنیز بنت عمار نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ زندگی پھر سے مسکرانے لگی تھی۔

▲▲

مکمل ناول



عام سے خاص تک

عقیلہ حق

ایک عجیب سا شور تھا جو اس کے کانوں میں بھنبھنا رہا تھا۔ رات کی گہری خاموشی میں کانوں میں بھنبھناتا شور اس کو اپنے کانوں پر ہاتھ رکھنے پر اکسا رہا تھا لیکن کانوں پر ہاتھ رکھنے سے کیا ہوتا، شور کانوں سے ہوتا ہوا لفظوں کی شکل میں برسوں سے اس کے خون کے ساتھ اس کے وجود میں دوڑ رہا تھا۔ کتنے برس ہو گئے۔ ایک مکمل زندگی گزارنے کے باوجود وہ سو نہیں پائی تھی، وہ سو بھی کیسے سکتی تھی۔ اس نے خاموشی سے برابر میں لیٹے اپنے بے حد

محبت کرنے والے شوہر کو دیکھا...... چند لمحے، اسمارٹ، قابل، شریف، ایک کامیاب بزنس مین اس کے خوب صورت لبوں پر ایک مسکراہٹ ابھر آئی اس کے دل نے بے ساختہ کہا۔ ''الحمدللہ......!''

لیکن پھر کان میں بھنبھناتا شور لفظوں میں ڈھل گیا...... وہ لفظ...... وہ لفظ نہیں خنجر تھے...... اس کا وجود دودھاری خنجر سے زخمی ہونے لگا۔ پاس پڑا فون جو وائبریشن پر لگا ہوا تھا۔ vibrate ہونے لگا۔ اس نے جگمگاتی اسکرین پر نام دیکھا تو اس کے پورے وجود میں ایک نفرت بھری لہر دوڑ گئی۔ اس کے لبوں نے اس نام کو نفرت سے دُہرایا اور فون ڈسکنیکٹ کر دیا...... اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی
بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا
بنو تیرے جھومر کی لڑ جو ٹوٹی
بنو میں موتی چنتا آیا

آف وائٹ کرتہ اور گولڈن کمخواب کا چوڑی دار پاجامہ کاندھے پر لہراتا آرگنزا کا دوپٹا، کانوں میں کندن کے بڑے بڑے آویزے اور گھٹنوں کو چھوتی چوٹی، کندن کی خوب صورتی بندیا سے سجی مانگ، دونوں ہاتھوں میں کھنکتی خوب صورت چوڑیاں انتہائی مہارت سے ہوا میک اپ وہ دورجنوں لڑکیوں میں نمایاں لگ رہی تھی۔

احمد علی صاحب کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا، بڑی بیٹی ثمینہ کی آج مہندی تھی۔ بیٹا علی عباس میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا۔ اور سب سے چھوٹی اور لاڈلی زری جو BSC سال اول کی طالبہ تھی احمد علی صاحب کی ایک چھوٹی سی کپڑے کی دکان تھی لیکن ان کی سلیقہ شعار بیگم راشدہ کی وجہ سے الحمدللہ ان کے گھر میں کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ احمد علی صاحب شہر کے متوسط علاقے میں رہتے تھے، تین کمروں اور بڑے سے صحن والا سو گز کا مکان ان کی جنت تھا اور آج اس جنت سے ایک شہزادی کی شادی وہ بہت دل سے کر رہے تھے اور ان کی دوسری لاڈلی شہزادی اپنی خوب صورتی اور شرارتوں کی وجہ سے محفل کی جان بنی ہوئی تھی۔

''یہ جنت کی حور...... زمین پر کیسے؟'' رضا نے چپکے سے کاشف جو دولھا بھی تھا اور اس کا خالہ زاد بھی کے کان میں سرگوشی کی۔

''چپ، حدِ ادب، محترمہ میری اکلوتی سالی ہیں۔'' کاشف نے مصنوعی غصے سے جواب دیا۔

''یعنی تیری آدھی گھر والی اور میری......'' رضا نے کہتے کہتے بائیں آنکھ بند کی اور بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

''جی نہیں...... بالکل نہیں...... حد ہوتی ہے کنجوسی کی۔ 5000 سے ایک روپیہ بھی کم نہیں۔'' زری نے دولھا کاشف کی چھنگلی پر مہندی لگا کر ضدی لہجے میں کہا۔

''5000 اُف پانچ ہزار تو میں نے کبھی دیکھے تک نہیں۔'' کاشف نے ہزار کا نوٹ بڑھاتے ہوئے بالکل یتیمانہ لہجے میں کہا۔

''حد ہوتی ہے کنجوسی کی، ایک نوٹ، یا اللہ......''

طیبہ جو زری کی بڑی گہری دوست تھی نے کہا اور ہزار کا نوٹ واپس کاشف کی جیب میں رکھ دیا۔

''اچھا تو آپ کو ایک نوٹ پر اعتراض ہے یہ لیں بہت سارے نوٹ۔'' رضا نے ہزار کا نوٹ ہٹا کر دس کے نوٹوں کی گڈی زری کی طرف بڑھائی۔

''واہ واہ...... یا نصیب دولھا مارا ہے۔ ہمارے یار نے۔'' کاشف کے سارے دوست پرجوش انداز میں بولے۔

''معاف کیجیے گا، جو آپ عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر جمعرات کو چادر چڑھاتے ہیں اپنے پاس رکھیں اور برائے مہربانی ہمارے معاملات میں بالکل دخل اندازی نہ کریں۔'' زری جو اس قدر دھکم پیل اور رش میں یہ نہیں دیکھ پائی تھی کہ دس کے نوٹوں کی گڈی کس نے دی ہے نے گڈی اٹھا کر سائڈ پر رکھی اور آخر کار 5000 لے کر ہی کاشف کی جان چھوڑی۔

''حسن اور بدتمیزی ساتھ، ساتھ...... لگتا ہے رضا میاں آپ کی تلاش ختم......'' رضا نے نوٹوں کی گڈی کی پٹی کھول کر کاشف پر نچھاور کرتے ہوئے اسے دیکھا جو اپنی خوب صورت آنکھوں سے ساری محفل کو دیکھ رہی تھی، نہیں دیکھ رہی تھی تو صرف اسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

اور پھر مہندی سے لے کر ولیمے تک وہ ہر روز ایک نئے روپ میں رضا پر بجلیاں گراتی رہی اور رضا...... رضا کا دل چاہتا، دل چاہتا کہ......

☆☆☆

رضا، کاشف کا خالہ زاد تھا، تین بہنوں اور تین بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا مگر بینک بیلنس اور جائداد تھی سو ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور ایم بی اے کر کے ایک پرائیوٹ کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، اس کی ایک شادی شدہ بہن امریکا میں مقیم تھی۔ بے فکری اور اعلیٰ جاب نے رضا کے مزاج کی شگفتگی پر خوب صورت اثرات مرتب کیے تھے۔

☆☆☆

''اُف ماشاءاللہ آپا کی سسرال تو بہت ہی بڑی ہے اور اس پر ایکا اور اتفاق، ان لوگوں کے اتفاق نے تو تھکا دیا۔'' زری نے چائے کی ٹرے میں تھرماس رکھتے ہوئے طیبہ سے کہا جو اس کی مدد کرنے کی نیت سے آئی ہوئی تھی، یہ الگ بات کہ سوائے آرام سے بیٹھنے کے وہ کچھ بھی نہیں کر رہی تھی بقول اس کے یہ بھی بہت بڑا کام تھا، آرام سے بیٹھنا آسان تو نہیں ہوتا ناں......

ثمینہ کی سسرال اسلام آباد میں تھی یہاں بھی کچھ رشتے دار تھے جو سسرال سے کوئی نہ کوئی ملنے چلا آتا، ثمینہ سارا دن ماں، باپ کے ساتھ گزارتی اور شام کو ہوٹل چلی جاتی جہاں اس کی سسرال والے ٹھہرے ہوئے تھے۔ آج راشدہ بیگم نے ثمینہ کی سسرال والوں کو خاص کر بلایا تھا کہ کل وہ سب لوگ اسلام آباد جا رہے تھے وہ جہیز میں دیا سامان پیک کروا رہی تھی۔ گو کہ اس کے سسرال والوں نے جہیز لینے سے سختی سے انکار کیا تھا لیکن راشدہ بیگم ماں تھیں اور مائیں تو بیٹیوں کی پیدائش کے دن سے ہی گھر کے کونے میں ایک صندوق لا کر رکھ دیتی ہیں اور پھر جب تک ان کی بیٹی وداع نہ ہو جائے وہ اس صندوق کا ڈھکن کبھی بند کرتی ہیں اور کبھی کھول کر...... ایک، ایک چیز کو تکتی ہیں، وہ صندوق دراصل ایک صندوق نہیں ہوتا، اس میں ایک خاندان کی تہذیب، ایک ماں کی سلیقہ مندی اور ایک لڑکی کے خواب رکھے ہوتے ہیں۔ اس صندوق میں رکھے جوڑوں اور دیگر سامان کو وہ لڑکی خوابوں میں استعمال کرتی ہے، کبھی اس میں رکھے رنگ برنگے جوڑوں کو پہن کر سرسبز وادیوں میں اٹھلاتی پھرتی ہے تو کبھی خوب صورت کڑھائی والے دوپٹے کو اوڑھ کر اپنے اچھے نصیب کی دعائیں کرتی ہے۔ اور آج راشدہ بیگم بھی وہ صندوق کھولے بیٹھی تھیں اور بیٹی کی امانت اس کے حوالے کر رہی تھیں، خواتین کی نگاہوں میں ستائش تھی، اور کیوں نہ ہوتی، راشدہ بیگم کے ساتھ، ساتھ ان کی بیٹیاں بھی سلیقہ مند تھیں۔

''نالائق، نکمی...... مسلسل بیٹھی چپس کھائے جا رہی ہو، میں نے چائے کی ٹرے تیار کر دی ہے ذرا اندر تو لے جاؤ، میں ذرا دروازے پر جا کر دیکھ لوں کون ہے، اب جو بیل پر ہاتھ رکھا ہے تو ہٹا ہی نہیں رہا، میرے خیال سے کرنٹ لگ گیا ہے، کمبخت کا ہاتھ ہی چپک گیا ہے۔'' زری نے زبردستی چائے کی ٹرے، بازو سے پکڑ کر طیبہ کو کھڑا کر کے اسے تھمائی اور خود تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔

ٹی پنک ایمبرائڈری دوپٹا اور نیلا سادہ کھدر کا سوٹ، کرتے کے گریبان پر جھولتے کندن کے بٹن، کمر پر لہراتی لمبی سی چوٹی اور چہرے پر بار، بار آتی بالوں کی لٹیں جنہیں وہ گھڑی، گھڑی کان کے پیچھے کر رہی تھی لیکن اگر بالوں کی شرارتی لٹیں شرارت کرنے پر اتر آئیں تو مجال ہے کسی کے قابو میں آ جائیں۔

''جی فرمایئے......؟'' اس نے دروازہ کھول کر سامنے کھڑے لڑکے سے پوچھا۔

اور رضا...... اسے ایسا لگا...... جیسے سانس رک گئی ہو،

وہ تو اس دنیا کا رہنے والا تھا، جہاں مصنوعی ہنسی اور میک اپ سے لتھڑے چہرے، بناوٹ اور بے حیائی اس کے چاروں طرف ناچتی تھی...... لیکن ایسا معصوم، سادہ اور بے خبر حسن...... یہ تو اللہ کی نعمت ہے، اس کے دل نے کہا۔

"پہلے آپ بیل پر ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گئے تھے اب آپ بولنا بھول چکے ہیں، آپ کے ساتھ پرابلم کیا ہے؟" اس نے تنک کر کہا۔

"میرے خیال سے آپ کی یادداشت چلی گئی ہے یہ ڈاکٹر کا کلینک نہیں ہے۔ کراچی نفسیاتی اسپتال فلاں جگہ ہے آپ وہاں جائیں۔"

"ایک منٹ...... ایک منٹ......" وہ دروازہ بند ہی کر رہی تھی کہ رضا نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اسے روکا۔

"جی......" زری دروازہ بند کرتے، کرتے رکی۔

"اندر سے آپ میری امی کو بھیج دیں۔"

"آپ کی امی...... آپ کی امی کون ہیں؟ آپ کون ہیں بھئی؟ کیا کہوں اندر جا کر......؟" زری حیران تھی۔

"بس کچھ نہیں، آپ کو کچھ نہیں کہنا، بس کہیے کہ......"

اس کی بات سن کر زری کو یقین ہو گیا کہ وہ نارمل نہیں ہے...... کیا واقعی وہ نارمل نہیں تھا۔

بلیک سوٹ، سفید شرٹ، ریڈ ٹائی میں چھ فٹ سے نکلتا قد، صاف رنگ پر شرارت سے مسکراتی گہری براؤن آنکھیں، گھنی مونچھوں تلے شرارتی مسکراہٹ لیے ہونٹ بلیک گاڑی سے ٹیک لگائے وہ نوجوان...... ہر لڑکی کا خواب ہو سکتا تھا لیکن اس کے مدِمقابل کوئی عام لڑکی نہیں زری تھی...... زری...... جس کی سوچ اور ہر انداز عام لڑکیوں سے مختلف تھا۔

"باہر کوئی صاحب آئے ہیں، وہ کہہ رہے ہیں کہ اندر جا کر کہہ دیں کہ جن کا بیٹا سب سے خوب صورت ہے وہ خاتون باہر آ جائیں کہ ان کا بیٹا انہیں لینے آیا ہے۔" زری نے حرف بہ حرف اس کے الفاظ دہرائے۔

"رضا آیا ہوگا......" درمیانی صورت شکل کی ایک خاتون نے چائے کا کپ میز پر رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے اتنا یقین، اماں تو بہت عام سی ہیں، اگر وہ ان ہی کا بیٹا ہے تو یقیناً انہوں نے اغوا کیا ہوگا، نہیں، نہیں شکل سے تو اغوا کار خاتون نہیں لگتیں، کسی کا لے کر پالا ہوگا......" اس نے دل کو یقین دلایا اور شام کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

ثمینہ چلی گئی اور پڑھائی کے ساتھ، ساتھ گھر داری کی بہت ساری ذمے داری بھی زری کے کندھوں پر آ گئی، جسے اس نے خوش اسلوبی سے قبول کر لیا۔

وہ ایک پختہ سوچ رکھنے والی لڑکی تھی، اس کے نزدیک دو اور دو چار ہوتے ہیں پانچ نہیں......

وہ زندگی کو حقیقت کی آنکھوں سے دیکھتی تھی...... اللہ پر یقین رکھنے والی ماں، باپ کی لاڈلی اور خاندان کی مثالی لڑکی تھی۔

☆☆☆

اور پھر رضا نے ان کے گھر میں داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ ڈھونڈ ہی لیا...... اس نے زری کے بھائی علی عباس سے دوستی کر لی اور عباس کی دوستی اسے گھر کے اندر لے آئی اور یہی اس کا مقصد تھا۔ احمد علی صاحب کے گھر کا ماحول بہت سادہ تھا، ان کے گھر میں ان کے اپنے خاندان کا کوئی لڑکا نہیں آتا تھا۔ کجا کے رضا لیکن ایک تو ثمینہ کی سسرال کا حوالہ، دوسرے عباس کی دوستی اور پھر رضا کا اپنا اعلیٰ اخلاق ان باتوں نے بہت جلد ہی رضا کو احمد صاحب کے دل اور گھر میں ایک خاص جگہ دے دی۔

وہ اکثر آفس سے واپسی پر احمد علی صاحب کے گھر چلا آتا، تین کمروں کا چھوٹا سا صاف ستھرا سا گھر اس کو اپنے بڑے سے خوب صورت سجے ہوئے گھر سے بھی بہت اچھا لگتا، جہاں سکون تھا، جہاں محبتیں تھیں اور جہاں زری تھی۔

"آئیں جلدی سے ہاتھ دھو کر آ جائیں اور کھانا کھا لیں۔" زری جو دستر خوان لگا رہی تھی، رضا کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر بے تکلفی سے بولی۔

"ارے بیٹا کیا کہہ رہی ہو، رضا میاں یہ کہاں کھاتے ہوں گے۔" راشدہ بیگم نے زری کو گھورا۔

"مونگ کی مسالے والی بھنی دال، زیرہ کھٹائی سے بھری ہری مرچیں، سوجی کا حلوا اور گرم، گرم چپاتیاں، ارے اماں اس قدر اسپیشل کھانا ہے، رضا بھائی جیسے لوگ تو ایسے کھانوں کو ترستے ہیں، چلیں آ جائیں، آج ہمارے توسط سے کھائیں۔" زری نے ہنستے ہوئے رضا کو دوبارہ آفر کی جو واقعی یہ کھانا، کھانا چاہتا تھا۔

"زری۔" راشدہ بیگم نے اس کو ڈپٹا۔

"ارے، رے نہیں آنٹی...... زری بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ اس قدر لذیذ ڈنر تو میں ضرور کروں گا......" رضا نے صحن میں لگے واش بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے کچن میں کھڑی زری کو مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

"میں اپنی زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں، میرا دل چاہتا ہے، میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں، میں اپنے علم کو استعمال کروں، میں ملک و قوم کی خدمت کروں...... میرا نام میرے خاندان کے لیے باعثِ عزت و افتخار ہو...... میں بہت آگے جانا چاہتی ہوں بہت آگے۔"

"پلیز اس سے آگے ذرا دیکھ کر کیونکہ سیڑھیاں شروع ہو گئی ہیں، آپ گر بھی سکتی ہیں۔" زری اور طیبہ ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں اور یہ ان کا بی ایس سی کا آخری سال تھا۔

طیبہ کا رشتہ اس کے کزن کے ساتھ طے ہو چکا تھا اور جلد ہی اس کی رخصتی تھی لیکن زری...... زری آسمان کی وسعتوں کو چھونا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"بیٹا میں نے سنا ہے رضا کی والدہ رضا کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں، مجھے رضا بہت پسند ہے اگر تم لوگ مناسب سمجھو تو زری کے لیے ذکر چھیڑ دو۔"

رضا کی پوری فیملی کو کینیڈا کی امیگریشن مل چکی تھی انہوں نے کب سے اپلائی کیا ہوا تھا۔ بلکہ زیادہ تر شفٹ بھی ہو چکے تھے۔ بس یہاں رضا اور اس کی والدہ تھیں۔ ضروری کام نمٹانے کے ساتھ، ساتھ وہ رضا کے لیے لڑکی بھی دیکھ رہی تھیں۔

کاشف اور ثمینہ اسلام آباد سے آئے ہوئے تھے، جب انہوں نے راشدہ بیگم سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے دل میں دبی خواہش کا اظہار کر دیا۔

"آپ فکر نہ کریں امی میں بات کروں گا۔" کاشف جو داماد کم اور بیٹا زیادہ تھا اس نے انہیں تسلی دی۔

☆☆☆

"رضا کا بس نہیں چلتا کہ برابر والا گھر لے کر تمہارے پڑوس میں ہی رہنے لگے، جب دیکھو محترم کی گاڑی منہ بسورے تمہارے دروازے پر کھڑی ہوتی ہے، انہیں دنیا میں کوئی اور کام نہیں۔ تمہارا گھر نہ ہوا، ڈاکٹر کی دوائی ہو گیا، صبح آفس جاتے ہوئے رکنا ہے، شام کو گھر جاتے وقت ٹھہرنا ہے، ویسے تمہارا گھر تو ان کے گھر کے راستے میں آتا بھی نہیں...... اُف میرے خدا اس لائن پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"سوچو تو تب ناں، جب اس خالی کھوپڑی میں بھیجا ہو۔" زری نے مسلسل بولتی طیبہ کو ٹوکا۔

"بھیجا ہی تو ہے...... لو بھائی یہاں کہانی روز ٹوئسٹ لے رہی ہے اور میں زولوجی کی ڈائیگرامز میں ہی الجھی ہوئی ہوں۔" طیبہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے اس قدر بے بسی سے کہا کہ زری کا بے ساختہ قہقہہ نکل گیا۔

☆☆☆

"اچھا تو تم پاس ہو گئیں......؟" رضا نے گلاب جامن منہ میں رکھتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔

آج زری کا رزلٹ آیا تھا، اس نے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔

"چلیں واپس رکھیں گلاب جامن...... مشکوک بھی ہو رہے ہیں اور مسلسل گلاب جامن بھی کھائے جا رہے ہیں۔" زری جل کر بولی۔

"دیکھو میری ڈیش۔"

"یہ ڈیش کیا ہوتا ہے؟ ہائیں۔" زری اچھل ہی تو پڑی۔

''ارے یار، ایک تو تم لڑکیوں کو بیچ میں بولنے کی بیماری بہت ہوتی ہے، حد ہوتی ہے، میری بات تو مکمل ہونے دو۔'' زری کے غصے کو رضا نے انجوائے کیا۔

''ہاں...... تو میں کہہ رہا تھا میری ڈیش، گلاب جامن الگ چیز ہے اور تمہارا رزلٹ الگ......'' رضا نے افسوس بھرے انداز میں گردن کو نفی میں ایک شانے سے لے کر دوسرے شانے تک گھمایا۔

''چھوڑیں مٹھائی کا ڈبا آدھا کھا گئے پہلے آپ مجھے ڈیش کا مطلب بتائیں۔'' زری نے اس کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبا لے کر ریفریجریٹر کے اوپر رکھا اور پلٹ کر غصیلے انداز میں اس سے پوچھا۔

پنک لان کی فرنٹ اوپن شرٹ جس پر خوب صورت وائٹ بٹن لگے ہوئے تھے، وائٹ چکن کی شلوار اور کندھوں پر جھولتا سفید پر پنک کڑھائی والا دوپٹا...... بالوں کو اس نے جوڑے کی شکل میں لپیٹا ہوا تھا اور ناک میں جگمگاتی لونگ...... رضا نے جیب سے رومال نکالتے ہوئے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔

''تم...... ناراض ہو جاؤ گی اگر میں اس بلینک کو فل کر دوں میری جان......'' وہ صرف سوچ کر رہ گیا...... کہ الفاظ تو بہت تھے جو وہ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی شخصیت کے آگے رضا جیسا انسان جس کے اردگرد حسینائیں منڈلاتی پھرتی تھیں، بول نہیں پاتا تھا۔

☆☆☆

''میری ڈیش......؟ کیا مطلب۔'' زری نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔

''مطلب......؟ کیا مطلب ہو سکتا ہے بھلا؟''

''میری ڈیش......'' رضا نے ریموٹ سے اے سی کی کولنگ بڑھائی...... ''میری جان......''

''زری تم میری جان ہو...... میں تمہیں کیسے مطلب بتاتا تمہاری شرافت سے ڈر لگتا ہے میری ڈیش......'' رضا نے جیسے اپنے آپ سے کہا...... اور مسکرا دیا۔

☆☆☆

''ہائے ہینڈسم......'' رضا جو فائلوں میں سر جھکائے بیٹھا تھا ایک مترنم سی آواز پر چونک اٹھا۔ سرخ و سفید رنگ، شہید آگیں آنکھیں، بہترین تراشیدہ بال، خوب صورت تراش خراش کا سوٹ، پیروں میں ہائی ہیل کے شوز اور سفید موئی ہاتھوں میں تھاما بلیک پرس...... رضا نے اسے دیکھا تو جیسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"how are you" اس کی مترنم آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔

''فائن......!'' رضا نے سر کو جھٹکا۔

ہنی اس کی کمپنی کے مالک مسٹر جبران کی اکلوتی بیٹی تھی جو کینیڈا سے ایم بی اے کر کے حال ہی میں لوٹی تھی اس نے مسٹر جبران سے ہنی کا ذکر تو بہت سنا تھا لیکن دیکھا پہلی بار تھا، ریشم کے لچھے جیسی ہنی...... وہ مسکرایا لیکن......

☆☆☆

اس نے صحن میں رکھے گملوں میں پانی ڈالا...... اور پھر پائپ سے صحن کو دھو کر وائپر سے خشک ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر مسلسل بجتی بیل پر چونک گئی۔

''اُف...... آپ نہیں بدلیں گے۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہی کہا اور اس کے یقین کے مطابق وہاں رضا ہی کھڑا تھا۔ گرے قمیص پر سیاہ ریشم کے دھاگوں سے کڑھائی...... سیاہ شلوار، ایک پائنچہ اونچا اور ایک نیچا، جلدی سے پہننے میں اڑسی شلوار وہ صحیح بھی نہیں کر سکی، ایڑی پر چمکتی چاندی کی باریک پازیب، گلابی ایڑیاں، خوب صورت نرم پاؤں، ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹتی وہ کتنی سادہ کتنی حسین لگ رہی تھی۔ کوئی رضا سے پوچھتا، ریشم کی طرح مسکراتی ہنی کہیں خلا میں گم ہو گئی اور چاروں طرف صرف...... زری، زری...... زری تھی۔

''خدا کی قسم، آج بھی پہلی دفعہ کی طرح آپ صرف دروازے کی گھنٹی بجاتے ہیں اور پھر خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' رضا کے گھر میں داخل ہونے کے بعد اس نے دروازے کی کنڈی لگاتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ پہلی دفعہ کی طرح آج بھی دروازہ تم کھولتی ہو...... تم زری...... تم کو دیکھ کر تو مسافر راستہ

...... وہ کوئی کر رہ گیا۔

''آپ بیٹھیں، میں ذرا اماں کو بلا لاؤں۔'' اس نے دوپٹا سینے پر پھیلاتے ہوئے رضا سے کہا۔

''اماں...... اماں نہیں ہیں گھر پر کیا؟'' رضا نے پوچھا۔

''نہیں، وہ پڑوس میں گئی ہوئی ہیں۔'' زری کا انداز سرسری سا تھا۔ صاف ستھرا صحن، ابر آلود موسم سرخ گملوں میں کھلتے ادھ کھلے گلاب اور نکھری پنکھڑی سی زری...... اندر کمرے میں بجتا ہلکا، ہلکا میوزک...... صحن میں ہلکی سی سرسراتی آواز......

ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا......

رضا کو لگا ایک سرور ہے جو اس کے وجود پر چھا رہا ہے...... تنہائی یہ موسم...... اُف...... قسمت بار، بار مہربان نہیں ہوتی۔

خوش قسمتی صرف ایک بار...... دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔

''چپ نہ رہ...... بول دے...... پھر یہ موقع بار، بار نہیں آئے گا......'' کوئی رضا کے اندر تڑپا...... ''کہہ دے رضا...... پوچھ لے رضا...... محبت کی بھیک مانگ لے...... حسن کو خراج عقیدت پیش کر دے۔ جو دل میں ہے کہہ دے...... اس لمحے جو کہنا چاہتا ہے کہہ دے...... جو سننا چاہتا ہے وہ سن لے......'' اس کا دل دھڑ، دھڑ کرنے لگا۔ وہ مرد تھا...... لیکن گھبرا رہا تھا۔

''مرد کیوں گھبرا رہے ہو......'' کسی نے اس کے اندر سے اسے سمجھایا۔ لیکن مدِمقابل، مدِمقابل بھی زری تھی۔ کوئی عام لڑکی نہیں۔

''ہاں وہ عام لڑکی نہیں ہے۔

چل پھر تو اس کے لیے خاص بن جا۔'' اس کے اندر سے، کسی نے اس کی ہمت بڑھائی۔

''ٹھہرو زری......'' زری جس کا ایک قدم دہلیز کے پار تھا اور ایک اندر وہ جیسے ٹھٹک کر رک گئی۔

''جی، بولیے......'' وہ پلٹی۔

اسے رضا، رضا نہیں لگا۔

اس کا دل دھڑ...... دھڑ کرنے لگا۔

☆☆☆

''میرا بیٹا...... میرا شہزادہ...... کیوں ضد کرتا ہے، چل چھوڑ خاندان اور پنڈ کو اگر کوئی لڑکی پسند ہے تو مجھے بتا، میں چودھری صاحب سے بات کروں گی...... میں انہیں منا لوں گی......'' بی بی نے اکلوتے لاڈلے سپوت چودھری تیمور سے کہا۔

''نہیں بی جی کوئی نہیں پسند، کوئی پسند ہی تو نہیں آتی۔'' چھ فٹ سے نکلتا قد، چوڑے شانے، سیاہ کرتے شلوار میں ملبوس، کاندھے پر چادر ڈالے اس گبرو چودھری تیمور نے ماں سے دلی سچائی سے کہا۔

''کیوں پسند نہیں آتی، کیا بڈھا ہو گیا ہے جو ایسی باتیں کرتا ہے۔'' چودھرائن کلثوم جو چودھری تیمور کی بی جی تھیں نے محبت سے پچکارا۔

''بڈھا نہیں ہوا دل ٹوٹا ہے بی جی دل......'' اس کی آنکھیں بولیں اور چودھرائن کا دل رو دیا۔

رقیہ ان کی بھانجی ہی تو تھی، بچپن کی منگ تھی وہ تیمور کی، دودھ اور شہد سے گندھی رقیہ کا تیمور بچپن سے دیوانہ تھا، جب وہ ہنستی تو حویلی میں ساز بکھر جاتے، بڑے چاؤ اور ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھیں وہ اسے...... تیمور کا تو خوشی کے مارے زمین پر پیر ہی نہیں ٹکتا تھا اور چودھری رجب علی اور چودھرائن کلثوم (بی بی) ایک ننھے چودھری کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن نہ جانے کیا ہوا ایک رات دبے پاؤں موت کا فرشتہ ان کے گھر چلا آیا اور پھر اسے بھی رقیہ ہی پسند آئی وہ جو تیمور کے بغیر قدم نہیں اٹھاتی تھی، ایک لمبے سفر پر، اکیلی روانہ ہو گئی اور جاتے، جاتے حویلی کی ساری خوشیاں اور رونق اپنے ساتھ لے گئی۔

کئی سال گزر گئے تھے، زندگی معمول پر آ گئی تھی، ہزاروں ایکڑ زرعی زمین کے مالک اور کئی گاؤں کی ملکیت رکھنے والے آکسفورڈ گریجویٹ تیمور علی کا کہیں دل نہ لگتا تو اس نے شہر میں کاروبار شروع کر دیا اور وہیں شہر کے پوش علاقے میں ایک کوٹھی بنوائی۔

پھر وہ کبھی گاؤں اور کبھی شہر میں رہتا لیکن سکون

کی نیند اور خواب گاہ کا سکون شاید اس کے نصیب میں نہیں تھا۔

بی جی کا اصرار بڑھ رہا تھا، تیمور ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس کی خاموشی ان کو رلاتی تھی، حویلی کے صحن میں پوتے کھلانے کی خواہش انہیں بے کل رکھتی۔ اور وہ اللہ پاک سے رات دن بیٹے کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتی رہتیں۔

عرش والا فرش والوں کے کتنا قریب ہے اگر فرش والوں کو اندازہ ہو جائے تو ان کے لیے بیٹھنا محال ہو......

☆☆☆

''چودھری صاحب...... وہ ملک صاحب کی صاحبزادی نے آج پھر پھولوں کا گلدستہ بھیجا ہے۔''

تیمور ابھی سو کر اٹھا ہی تھا کہ اس کے ملازم خاص فرہاد نے ہاتھ باندھ کر مئودبانہ انداز میں کہتے ہوئے گلدستہ میز پر رکھا۔

''کیا بکواس ہے یہ فرہاد، واپس کرو یہ پھول!'' اس کا موڈ بری طرح بگڑ گیا۔

فرہاد ایک قدم گھبرا کر آگے بڑھا...... اور پھر جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا کہ تیمور علی ہاتھ میں پھول پکڑے اسے گھور رہا تھا۔

☆☆☆

''بیٹا میں چاہتا ہوں اس دفعہ ہماری آبائی سیٹ پر الیکشن تم لڑو۔'' ملک رجب علی نے متانت سے سر جھکائے کھانا کھاتے تیمور سے کہا۔

''میں...... ابا جی میں......؟'' تیمور حیران ہوا۔

''کیوں......؟ کیا ہوا پتر......؟ جس طرح ہر خاندان کی ایک شناخت ہوتی ہے، ہمارے خاندان کا بھی ایک وقار ہے کبھی کوئی حکومت ایسی نہیں بنی جس میں ہمارے گھر اور ہمارے خاندان کا کوئی فرد وزارت میں نہ ہو، اسمبلی میں نہ ہو، مجھے امید ہے تیرا خالو ملک وجاہت علی اس دفعہ بھی بھاری اکثریت سے جیت کر سارے خاندان کا سر فخر سے اونچا کرے گا۔''

''میں اپنے ابا کو بہت چاہتی ہوں۔'' رقیہ نے مان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سینے پر سر رکھا۔

''اچھا ابا کو چاہتی ہے اور کہہ بھی رہی ہے میرے سینے پر سر رکھ کر۔'' تیمور نے اس کے ریشم کے لچھوں جیسے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت بھری خفگی سے کہا۔

''جل گئے ناں......'' اس کی ہنسی کے ساز بکھر گئے۔

''ارے میرے سوہنے سرکار وہ تو باپ ہیں ناں، بیٹی کی پہلی محبت، انہیں چاہتی ہوں اور تم پر......'' وہ مسکرائی تیمور کا دوسرا بازو بھی اس کی کمر کے گرد لپٹ گیا۔

''اور تمہیں......'' اس نے اس کے سینے میں سر چھپایا اور اس کے گھنیرے بالوں نے تیمور کے سارے وجود کو جیسے چھپا لیا، تیمور کے وجود سے اٹھتی بھینی بھینی مہک کو اس نے اپنے وجود کے اندر اترتے محسوس کیا۔

اور تیمور، تیمور تو جیسے اس کی ریشمی زلفوں کی زنجیروں میں قید ہی ہو گیا تھا، اس کے بازوؤں کا گھیرا رقیہ کے گرد تنگ ہوا، وہ کسمسائی، اس نے گھیرا مزید تنگ کر دیا۔

''تم پر...... تم پر تو میں مرتی ہوں۔'' اور پھر اس کی ہنسی تیمور کی دیوانگی میں کہیں کھو گئی۔

''اور بستر کی سلوٹیں......''

''کیا سوچ رہا ہے ملک تیمور علی، کہاں کھو جاتا ہے تو بیٹھے، بیٹھے۔'' چودھری رجب علی کی آواز اسے حقیقت میں لے آئی۔

''پتر، تیرا ابا کہہ رہا ہے اس دفعہ بھی تیرا خالو یعنی تیری رقیہ کا باپ الیکشن لڑ رہا ہے تو بھی لڑ، انشاء اللہ اس سال بھی خاندان کی سیٹیں خاندان میں ہی رہیں گی، تیرا خالو بھی پوچھ رہا تھا۔'' چودھرائن کلثوم نے خالی، خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے، خاموش بیٹھے لاڈلے کو سمجھایا، یہ الگ بات کہ اس کی ویران آنکھوں نے ماں اور باپ دونوں کے دل کو مسل کر رکھ دیا۔

وہ خاموش کا خاموش ہی رہا۔

''تیمور، میرا ابھی دل چاہتا ہے، میں آپ کو بہت اوپر دیکھوں۔'' اسے لگا رقیہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئی ہو جیسے اور رقیہ کی بات کو وہ کیسے رد کر سکتا تھا۔

ایک ہپناٹائزڈ سی کیفیت میں اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

''جیتا رہ میرا شیر......'' چودھری رجب علی نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا...... اور وہ بھی ہلکے سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

''فرہاد......'' وہ زور سے دہاڑا۔

''جی چودھری صاحب......'' فرہاد کپکپاتا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا، فرہاد، تیمور علی کا ملازم خاص تھا، دونوں بچپن سے ساتھ تھے، احترام کے رشتے مالک اور نوکر کے تعلق کے ساتھ، ساتھ وہ اس کا ان کیا دوست بھی تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پھولوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

''پھول ہیں سرکار......'' فرہاد ہکلایا۔

''بے وقوف گدھے، یہ تو مجھے بھی معلوم ہے...... پر یہ یہاں کیوں نظر آ رہے ہیں۔''

''سائیں ملک صاحب کی صاحبزادی نے بھیجے ہیں...... اور نیچے ڈرائنگ روم میں وہ خود بیٹھی ہیں۔''

''اُف یہ انوشہ......'' اس کا دماغ جیسے اڑ گیا۔

''کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہے کوئی عورت اس طرح پیچھے پڑ جائے، اپنی سطح سے گر جائے مجھے سخت ناپسند ہے اور یہ لڑکی تو جیسے ہر میٹنگ میں پہنچ جاتی ہے، اُف عورت اور وقار...... دو علیحدہ نام نہیں ہونے چاہئیں۔''

انوشہ ایک محفل میں اسے ملی تھی، ایک بہت بڑے مل اونر کی سب سے چھوٹی، لاڈلی اور حد سے زیادہ ماڈرن بیٹی، تیمور نے لاکھ آکسفورڈ سے پڑھا ہو اس کا خمیر تو گاؤں کی سوندھی مٹی سے گندھا تھا، بی جی ہمیشہ باوضو اسے دودھ پلاتی تھیں، بی جی کی گود اور مزاج کی سادگی نے اسے اندر سے ایک سیدھا سادہ شریف النفس انسان بنا دیا تھا۔ بظاہر وہ ایک، لمبا چوڑا، رعب دار، مغرور، اکھڑا سا چودھری لگتا تھا لیکن اندر سے نیک طینت......

☆☆☆

''چودھری صاحب، ماشاء اللہ الیکشن تو آپ جیت ہی جائیں گے، بس چھوٹا منہ بڑی بات، ہمت نہیں ہے اجازت دیں تو ایک بات کہوں......'' سیاہ ڈنر سوٹ، سفید شرٹ، سرخ ٹائی، پیروں میں سیاہ برانڈڈ شوز، براؤن آنکھوں میں حد درجہ سنجیدگی، براؤن مونچھوں تلے ایک دوسرے میں پیوست ہونٹ، سلیقے سے چمکتے ہوئے بال۔

فرہاد نے آئینے میں نظر آتے اپنے چھوٹے سرکار، اپنے دوست کو دیکھتے ہوئے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔

''کہو......؟'' تیمور علی نے پرفیوم کی بوتل کا ڈھکنا ہٹا کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور پھر اپنے آپ کو کلون میں بھگوتے ہوئے کہا۔

''سرکار، میرے ماں، باپ، میرے بیوی بچے آپ پر قربان، آپ کی تنہائی دیکھی نہیں جاتی، بس اب آپ شادی کر لیں سرکار......'' سوکھے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے فریاد نے وہ بات کہہ ہی دی جو وہ کئی دنوں سے اپنے آپ سے کہتے، کہتے تھک سا گیا تھا۔

''شادی؟'' چودھری ملک تیمور علی کے منہ سے نکلا...... اور اس کی نظر آئینے میں نظر آتے، کپکپاتے فرہاد پر جیسے ٹک سی گئی......

☆☆☆

''دیکھو طیبہ میں نے چھپکلی پر ایک نظم لکھی ہے۔'' زری نے اپنی ہنسی پر کنٹرول کرتے ہوئے طیبہ سے کہا۔

''چھپکلی تم بہت تیز ہوتی ہو
روشنی میں کہیں چھپ جاتی ہو
اندھیرے میں نکل آتی ہو
اماں کو دیکھ کر بھاگ جاتی ہو
میرے آتے ہی نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو
مجھے گھورتی رہتی ہو
مجھے بہت ڈراتی ہو
تم جانتی ہو، میں تم سے کتنا ڈرتی ہوں
پھر بھی تم؟

ترس نہیں کھاتی ہو
آخر ہمارے گھر سے
تم کہیں اور کیوں نہیں چلی جاتی ہو"
"چپ رہو بس کرو تم اپنا یہ چھچکی نامہ اور بھی جانے وہ کیا، کیا سنانے والی تھی جب طیبہ نے اسے ٹوکا۔
"کہو، کھیت کی، سنو کھلیان کی، میں سوال کچھ کر رہی ہوں، جواب محترمہ کیا دے رہی ہیں۔ زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ، سمجھیں ورنہ......"
طیبہ نے کچن میں رکھی چھری ہوا میں لہراتے ہوئے لوفرانہ انداز میں کہا۔
"اس دن کا بتاؤ......" طیبہ نے فرضی مونچھوں کو تاؤ دیا۔
"گوری کر کے ہار سنگھار
ہو جا چلنے کو تیار
سجن تجھے لینے آئے، بلم تجھے لینے آئے"
زری نے کچن کا کاؤنٹر صاف کرتے، کرتے رک کر ایک نظر طیبہ کو دیکھا اور گانا، گانا شروع کر دیا۔
"بکواس بند کرو زری......" طیبہ جل ہی تو گئی۔
"اس دن......" زری نے چائے کی پتیلی چولھے پر رکھی اور جیسے اپنے آپ سے کہا۔
"جی رضا بھائی......!"
"ٹھہر جاؤ زری...... میری بات سنو پلیز......"
رضا کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔
زری نے ایک نظر کھلے دروازے سے باہر دیکھا اور ایک نظر صحن کے بیچوں بیچ، سوال بنے کھڑے رضا کو دیکھا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔
اور دل کا دروازہ، دل کا دروازہ......
"زری تم جانتی ہو، تم...... تم...... بس تم ہو......"
رضا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کہے۔
"زندگی بار، بار نہیں ملتی، خوش قسمتی، صرف ایک بار دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ سب کہہ دے۔" کوئی رضا کے اندر تڑپا۔
زری آہستہ، آہستہ چلتی، صحن میں بچھے تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ دل دھڑ، دھڑ کر رہا تھا، اسے سانس لینی مشکل لگ رہی تھی۔
قسمت کتنی مہربان تھی، اس نے نظریں جھکا کر ہتھیلیوں میں بکھری لکیروں کو دیکھا۔
"تم بہت نصیب والی ہو تمہاری جیسی تقدیر لاکھوں میں کسی ایک کی ہوتی ہے۔" اسے کالج کے مینا بازار میں ہاتھ دیکھتی اس لڑکی کا جملہ یاد آ گیا، جسے سن کر وہ بہت ہنسی تھی۔
"کبھی ڈیزائنر سوٹ نہیں پہنا...... کبھی جہاز کو اندر سے نہیں دیکھا، کبھی شہر سے باہر نہیں گئی، کبھی کسی بڑے ہوٹل میں کھانا نہیں کھایا...... اور ہاتھ کہتا ہے تم بیگم صاحبہ ہو۔" وہ بے ساختہ ہنس دی تھی لیکن...... وہ آج سوچ کر ہنسی نہیں کیونکہ اس کے پیروں میں رضا بیٹھا ہوا تھا، یونانی دیوتاؤں جیسا حسن اور شان و شوکت رکھنے والا رضا......
اس نے رضا کو نظر اٹھا کر دیکھا لیکن نہ جانے کیوں، دل میں ایک بے کلی سی محسوس ہوئی۔
"پتا ہے زری میں نے بچپن بہت تکلیفوں میں گزارا ہے، اس مقام تک پہنچنے کے لیے میں نے بہت محنت کی ہے لیکن میری جان!" رضا ایک لمحہ کے لیے رکا۔
"میری جان......" زری پورے وجود سے کانپ گئی، اس کا نازک وجود ہولے، ہولے لرزنے لگا...... اسے ڈیش کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔ ان سنا، لفظ...... چھوٹا سا لفظ...... اسے پیار کی طرح لگا۔
رضا نے اس کے وجود کی کپکپاہٹ محسوس کی...... اس نے زری کے قریب ہونا چاہا وہ لاشعوری طور پر پیچھے ہٹ گئی۔
"زری، گھبراؤ نہیں، آج سن لو...... جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں۔ زری ابھی میری منزل آئی نہیں۔ مجھے بہت آگے جانا ہے، کرایے کے مکان سے اپنے مکان اور زندگی کی ہر آسائش لیکن زری ان سب چیزوں کے ساتھ تم، میری جان تم...... تمہارے بغیر کچھ بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ تم صرف ایک بار کہہ دو...... تم میرا ساتھ دو گی...... زندگی کا سفر تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں زری...... زری کچھ تو بولو...... کچھ تو کہو...... تم کیا چاہتی ہو؟"
"بہت عام سی لڑکی ہوں میں، بہت عام سی خواہشیں ہیں، ایک گھر ہو، دریچہ ہو، پیارا، پیارا سا بچہ......" زری سوچ کر رہ گئی۔
"تم عام لڑکی نہیں ہو۔" رضا نے جیسے اس کے دل کی سن لی تھی۔ اس کی نظریں اور جھک گئیں۔
گلابی پیروں کو چپل میں قید وہ دیکھنے لگی۔
"تم بہت خاص ہو زری، کوئی وعدہ، کوئی محبت کا دیا میرے ہاتھ میں تھما دو...... میں اس دیے کی روشنی میں تم کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں...... زری، کچھ تو کہو......" رضا کی آواز بوجھل ہوئی۔
اس نے نظریں اٹھائیں۔
اس سے پہلے وہ کچھ کہتی دروازے کی بجتی بیل دونوں کو حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔
"بہن مراقبے میں کیوں چلی گئیں، بتاؤ ناں اس دن کیا ہوا تھا۔" طیبہ کا بس نہیں چل رہا تھا، تیل سے بھرا فرائی پین زری کے سر پر انڈیل دے۔
"ہاں اس دن...... اس دن بہت خاص ہوا تھا۔"
زری نے دانتوں تلے ہونٹ دبا کر شرارت سے طیبہ کو مسکراتے دیکھ کر کہا۔
"اس دن اماں آ گئی تھیں۔" زری نے کہا اور تیزی سے باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔ کیونکہ طیبہ کے خطرناک تیور بتا رہے تھے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
"بدتمیز کہیں کی، ایسے کہہ رہی ہے اماں آ گئی تھیں...... جیسے اماں تو اس کے ابا سے ناراض ہو کر میکے بیٹھی ہوئی تھیں ناں...... اور اس کی دادی مرحومہ انہیں لینے گئی ہوئی تھیں۔" طیبہ بڑبڑائی اور پھر بے ساختہ ہنس دی...... زری کا دمکتا چہرہ جو کہانی سنا رہا تھا شاید اس کو بیان کرنے کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں تھی۔
مگر لفظوں کی ضرورت...... ہمیشہ پڑتی ہے......
نادان لڑکی کیسے جان پاتی......

☆☆☆

"سائیں جی، سرکار میرے کوئی شہر میں ہی لڑکی پسند کر لیں۔ وہ ملک صاحب کی......"
"خبردار جو تم نے ملک صاحب کی بیٹی کا نام لیا......"
تیمور علی دہاڑا، گاڑی چلاتے فرہاد کے ہاتھ اسٹیرنگ پر کانپے...... اف اس نے جلدی سے بریک لگائے۔
گاڑی کے آگے کوئی گرا تھا۔
فرہاد نے گھبرا کر چوہدری تیمور علی کی طرف دیکھا جو تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تھا۔

☆☆☆

"ابا پلیز چلیں ناں ڈاکٹر کے پاس، اتنا تیز بخار ہو رہا ہے آپ کو۔" زری نے سیاہ چادر میں اپنے آپ کو لپیٹتے ہوئے احمد علی کی کلائی پکڑ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔
"چلے جائیں...... بہت تیز بخار ہے، اللہ خیر کرے۔" راشدہ بیگم نے میاں کو تسلی دی۔
"بس ابا، میں نے برابر والی خالہ کے بیٹے سے رکشے کے لیے کہا تھا، رکشا آ گیا ہے...... ابا چلیں پلیز۔"
زری نے نقاہت زدہ باپ کو کلائی سے پکڑ کر آہستہ، آہستہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، پیچھے، پیچھے راشدہ بیگم چل رہی تھیں کہ اگر وہ خدانخواستہ چکرا کر گرنے لگیں تو وہ سنبھال لیں۔
"امی، آپ بے فکر رہیں، میں ابا کو لے جاؤں گی آپ گھر پر ہی رہیں، بھائی آئیں گے تو پریشان ہوں گے۔" اس نے ماں سے کہا اور باپ کو لے کر رکشے میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

اس نے سیاہ نفیس چادر کو جسم کے گرد پھیلایا۔ دسمبر کی سردیاں اور خنک ہوا اس کو اچھا لگا، اس نے سامنے ہاتھ ہلاتے لوگوں کو مسکرا کر دیکھا اور پھر جوابا بہت خلوص سے ہوا میں ہاتھ لہرائے، یہ اس کے لوگ تھے۔
اسے عام سے خاص بنانے والے......
اس کے لیے ہنسنے والے، اس کے لیے رونے والے۔ وہ ان سب کے بغیر کچھ نہیں تھی۔
سکیورٹی نے اسے چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا، سڑک پر اس کی گاڑی تھی اس سڑک کو فی الحال عام لوگوں کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔

فٹ پاتھ کے اس پار ٹریفک رواں دواں تھا اور پھر آہستہ آہستہ جام ہونے لگا کیونکہ اسے دیکھ کر لوگوں نے اپنی گاڑیاں سلو کر لی تھیں۔ اس نے ایک دفعہ پھر مسکرا کر سب کی طرف دیکھا، اتنے رش میں، شور میں، مجمعے میں وہ شاید یہ نہیں دیکھ سکی......

کوئی گاڑی سے اتر کر اسے بہت حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

لیکن کون؟ وہ بھلا کون ہو سکتا تھا؟

☆☆☆

''میری بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں...... کئی اعلیٰ بزنس مین اور سیاسی گھرانے اسے اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتے ہیں، میں نے زندگی بھر بنی کی ہر خواہش پوری کی...... حتیٰ کہ اگر اس نے پاکستان میں بیٹھ کر انگلینڈ کے کسی ریسٹورنٹ کی کسی اسپیشل ڈش کی فرمائش کی تو میں نے چارٹر طیارے کے ذریعے وہ ڈش اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ اب میری بیٹی نے پھر ایک فرمائش کی ہے اور وہ فرمائش تم تک جاتی ہے۔''

ہزاروں گز پر بنا وسیع و عریض محل نما گھر......

در و دیواروں سے چھلکتی امارت، قدم قدم پر ہاتھ باندھے کھڑے مودب ملازم...... انواع و اقسام کے لوازمات سے سجی میز...... ایک طرف بے پروائی سے ریموٹ سے چینل سرچنگ کرتی بنی اور دوسری طرف میز کے اس پار بیٹھے مسٹر جبران...... اور کانٹے سے فنگر فش کو گودتا رضا......

آج مسٹر جبران نے رضا کو آفس کے بعد کھانے پر انوائٹ کیا تھا۔

رضا سمجھ رہا تھا کہ شاید پروموشن ملے گی یا پھر چند دن پہلے اس کے باس نے کہا تھا کہ اسے نئی ماڈل کی گاڑی دی جائے گی تو اسے یہ بھی گمان تھا شاید باس کوئی اہم ذمے داری کے ساتھ ساتھ اسے نئی گاڑی کی چابی دیں گے...... لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔

وہ اسے اپنی اکلوتی بیٹی دے رہے تھے...... اس نے نظریں اٹھا کر بیش قیمت پینٹنگز سے سجی دیواروں کو دیکھا۔ اور پھر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا......

مسٹر جبران نے اس کی طرف دیکھا اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور اٹھ کر چلے گئے۔

''کیا سوچ رہے ہو رضا...... چلو بس چھوڑو کھانا، چلو آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔'' بنی نے اس کے ہاتھ سے فورک لے کر میز پر رکھا اور اس کا بازو پکڑ کر کرسی پر سے کھڑا کر دیا۔

اور پھر رضا ایک ہپنا ٹائزڈ کیفیت میں ایک روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے چل دیا۔

ہاں روبوٹ کے مانند......

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر آپ لوگ زمین پر چلنے والوں کو انسان سمجھنا کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔''

زری نے غصے سے کانپتے ہوئے تیز لہجے میں اس شخص کو جھڑکتے ہوئے کہا جو زمین پر گرے اس کے ابا کو اٹھانے کے لیے جھکا تھا۔

''بی بی، کٹ بہت دور ہے...... سامنے ہی ڈاکٹر کی دکان ہے آپ یہاں اتر جائیں اب سو روپے میں، میں اتنا بڑا چکر کاٹ کر نہیں آؤں گا......'' رکشے والے نے رکشا روک کر روکھائی سے کہا تھا۔

''بھائی میرے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم بیس روپے اور لے لو لیکن ہمیں کلینک کے سامنے اتار دو۔'' زری لجاجت سے بولی، رکشے والا خاموش رہا۔

''بیٹا اتر جاتے ہیں، میری اتنی ہمت ہے انشاء اللہ روڈ پار کر لوں گا۔'' احمد علی بیٹی کی پریشانی اور رکشے والے کی بے حسی بھانپتے ہوئے رکشا سے اتر گئے۔

روڈ سنسان تھا، زری کرایہ دے رہی تھی کہ انہوں نے سڑک پر پیر رکھ دیا اور پھر نہ جانے کہاں سے بلیک V8 آئی اس سے پہلے کہ وہ بھاگ کر ابا کو پیچھے کھینچتی، گاڑی کے بریک تیزی سے چرچرائے اور احمد علی سڑک پر گر گئے۔

''ابا آپ ٹھیک ہیں ناں......؟'' اس نے گھبرا کر احمد علی سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا، میں ٹھیک ہوں۔'' احمد علی گاڑی سے اترنے والے شخص کی شخصیت سے مرعوب ہو گئے تھے......

سنسان روڈ، جوان بیٹی کا ساتھ، بڑی سی گاڑی سے اترنے والا وہ بارعب جوان اور پھر تیزی سے اس کے چاروں طرف کھڑے ہونے والے مسلح گارڈز......

''جناب، بزرگوار ہم آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔'' فرہاد نے جلدی سے احمد علی سے کہا۔

دو بالشت کی معمولی لڑکی اس کے سردار کو باتیں سنا رہی تھی جو اس کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''تو آپ کا خیال ہے، یہاں بیمار باپ کے ساتھ میں واک پر نکلی ہوں، آپ لوگوں کی آنکھوں پر تو پردے پڑے رہتے ہیں ناں...... ہٹیں راستہ دیں، ڈاکٹر کا کلینک بند ہو جائے گا۔'' اس نے فرہاد سے کہا۔

خاموش کھڑے، ایک ٹک دیکھتے ملک تیمور علی کو تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا...... اور ابا کا ہاتھ پکڑ کر روڈ کراس کر گئی۔

''اگر میرے ابا کو کچھ ہو جاتا تو میں آپ کو چھوڑتی نہیں۔'' اس کمزور سی لڑکی نے تیمور علی کو دھمکی دی تھی۔ اگر تو وہ اس کی کلائی پکڑ لیتا تو کلائی کی ہڈی تو ٹوٹ سکتی تھی لیکن وہ ہاتھ نہیں چھڑا سکتی تھی۔

تیمور علی یاد کر کے مسکرایا۔

سارے باڈی گارڈز اور فرہاد کا خوف کے مارے برا حال تھا، کسی کی ہمت نہ ہوئی چھوٹے سرکار کے آگے سر اٹھانے کی اور وہ لڑکی...... وہ لڑکی چیخ رہی تھی، فرہاد کو یقین تھا، آج اس کی خیر نہیں......

''فرہاد......!'' تیمور علی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر سر ٹکاتے ہوئے پکارا۔

''جی میرا سائیں...... میرے ماں، باپ، میرے بیوی بچے آپ پر قربان حکم......'' فرہاد ہر قسم کی سزا کے لیے تیار تھا۔

''فرہاد یہ لڑکی......'' اور پھر تیمور کے منہ سے نکلے جملے نے ایک بار پھر اسٹیرنگ پر اس کی گرفت کم کر دی......

☆☆☆

''ارے یار...... چار دن کی ملاقات محبت کہاں سے ہو گئی...... ہر اچھی چیز اچھی لگتی ہے لیکن اس سے بھی اچھی اور نایاب چیز...... بن مانگے قدموں میں آ گرے تو......''

''لیکن......'' رضا نے کچھ کہنا چاہا۔

''ارے یار...... یہ عام سے گھروں کی عام سی لڑکیاں...... ان سے شادی کر لو تو کیا ملتا ہے، محبت وحبت تو دو دنوں میں ختم ہو جاتی ہے اور باقی رہ جاتے ہیں صرف میاں، بیوی...... پھر وہی مسائل...... وہی زندگی...... ساری زندگی پیسے گننے میں گزر جائے گی۔ چار بچے ہوئے اور اپنی زندگی ختم...... بس روز صبح اٹھ کر پیسے گننا اور بجٹ بناتے رہنا۔''

رضا کے دیرینہ دوست اشعر نے آئندہ زندگی کا اتنا خوفناک نقشہ کھینچا کہ ایک لمحے کے لیے تو وہ کانپ کر ہی رہ گیا۔

''اور ویسے بھی تجھے کون سا اس لڑکی سے...... کیا نام ہے اس کا......'' اشعر نے شہادت کی اور درمیانی انگلی سے کنپٹی کو دباتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''زری......'' رضا کا لہجہ دھیما تھا۔

''ہاں، ہاں وہی زری، گوٹا کناری......'' اشعر کا لہجہ مذاق اڑاتا ہوا تھا لیکن نہ جانے کیوں آج رضا کو برا نہیں لگا۔

''یار...... بس...... دماغ سے سوچ...... مالداروں کی زندگی...... عیش، خوب صورت، ماڈرن، پڑھی لکھی بیوی...... اللہ معاف کرے، ہماری بیویاں تو کتنے ہی پرفیوم لگائیں ان کے پاس سے لہسن، پیاز کی بُو ہی آتی رہتی ہے جیسے میری بیوی......'' اشعر کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔

''خیر...... ہاں تو میں کہہ رہا تھا ایک اچھی زندگی تیری منتظر ہے جس دفتر میں تو نوکری کرتا ہے وہاں پہ مالک کی کرسی پر بیٹھے گا...... پاگل ذرا سوچ......''

آج جب رضا نے اپنے بچپن کے دوست اشعر کو جبران صاحب کے پرپوزل کے بارے میں بتایا تو

وہ تو جیسے تپ ہی نٹ اچھل کر رہ گیا تھا۔

''زندگی کے وہ سارے خواب اور آسائشات جو مڈل کلاس کے لوگ سوچتے، سوچتے بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی، چھوٹی خواہشات آرزوئیں بن جاتی ہیں اور پھر حسرتوں کی صورت قبروں میں ساتھ چلی جاتی ہیں...... کیوں ایسا ہی ہے ناں......؟'' اشعر بولا۔

''اب تم کہو گے نہیں ایسا نہیں ہے، دنیا کے کئی کامیاب ترین لوگ ہماری کلاس سے ہی تعلق رکھتے ہیں...... بے شک تم بالکل صحیح کہو گے لیکن اتنی بڑی دنیا میں چند...... صرف چند لوگ...... ہماری ساری زندگی یونہی گزر جاتی ہے۔ پل، پل ترستے، بلکتے...... ذرا سا موسم ابر آلود ہوتا ہے تو ہمارے بچے ضد کرتے ہیں کہ سمندر پر چلیں اور ہماری جیب اجازت نہیں دیتی تبھی تو انہیں لے جاتے ہیں اور کبھی ڈانٹ کر چپ کرا دیتے ہیں اور یہ مالدار لوگ یہ گرمیاں گزارنے ہمارے شمالی علاقہ جات نہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ جاتے ہیں۔ تو سوچ...... تجھے زندگی میں ایک چانس ملا ہے، اپنی تقدیر بدلنے کا...... سوچ رضا...... سوچ......'' بستر پر لیٹا، وہ اشعر کی باتیں دُہرا رہا تھا سوچ رہا تھا، اس کی باتیں کڑوی ضرور تھیں لیکن...... قابلِ غور تو تھیں ناں......

☆☆☆

''انوشہ...... دیکھو میں ملک صاحب کی بہت عزت کرتا ہوں، میں جس مزاج کا آدمی ہوں...... میرا گزارہ تمہارے ساتھ بہت مشکل ہے، بہتر یہی ہے کہ میرا خیال دل سے نکال دو، ویسے بھی تمہارے اور بھی بہت سارے دوست ہوں گے ان کے ساتھ وقت گزارہ کرو...... برائے مہربانی آئندہ مجھے پھول بھیجنا اور نہ ہی مجھے فون کرنا۔'' چودھری تیمور علی نے انوشہ کی بات سنے بغیر ٹیلیفون کی لائن کاٹ دی۔

ہینڈسم، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اکلوتا، شاندار سیاسی کیریئر رکھنے والا گبرو جوان جس پر دیوانہ وار لڑکیاں مرتی تھیں، بڑے سے بڑے خاندان کے لوگ اسے اپنی بیٹی دینے کی خواہش رکھتے تھے۔

لیکن چودھری تیمور علی، جس نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا جو بڑی، بڑی طرح دار حسیناؤں کو لفٹ بھی نہیں کرواتا تھا اس کا دل آیا بھی تو......

فرہاد نے اپنے چودھری کو دیکھتے ہوئے سوچا اور بے ساختہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

''ارے میں نے تو ایسی سنائیں کہ مسٹر یاد رکھیں گے ساری عمر...... بڑے ہیرو بن کر اپنی گاڑی سے اترے تھے میرے ابا کو کچھ ہو جاتا تو...... اس کے سارے باڈی گارڈز کپکپا رہے تھے، میں نے تو ذرا سی بھی پروا نہیں کی۔'' زری نے فخریہ لہجے میں طیبہ کو سنایا۔

موسم ابر آلود تھا، وہ دونوں گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھی گرما گرم چائے کا لطف اٹھا رہی تھیں۔

''واہ کیا افسانوی سین ہوگا...... کسی رائٹر نے اپنے ناول میں ایسا ہی ایک سین لکھا تھا یا نہیں لکھا تو اب لکھ دے گی۔ غصے والی فٹ پاتھ پر چلتی خوب صورت لڑکی اور V8 میں سوار کوئی جاگیردار...... جس کے غصے اور رعب سے دنیا کانپتی تھی...... لیکن وہ لڑکی بالکل پروا نہیں کرتی اور اس جاگیردار، اس وڈیرے کو ذرا سی بات پر بے نقط سنا دیتی۔ اور وہ ہینڈسم جاگیردار اس کی اسی ادا پر اس کا عاشق ہو جاتا ہے اور پھر ہر قیمت پر اسے حاصل کر لیتا ہے......''

''اوئے...... اوئے محترمہ چپ رہو...... جبھی منع کرتی ہوں ہر وقت یہ رسالے مت پڑھا کرو سارا وقت تمہیں ہیرو، ہیروئن ہی نظر آتے رہتے ہیں اور تم تو تھیلے والا بھی مل اوز لگتا ہے حد ہوتی ہے خیالی پلاؤ پکانے کی بھی تمہیں بدہضمی نہیں ہوتی۔'' زری نے آنکھیں بند کر کے تصورات سے کھیلتی طیبہ کو ہنستے ہوئے ٹوکا۔ طیبہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنستیں دروازے پر بجتی تیز بیل اور گلی میں محسوس ہوتی ایک عجیب سی ہلچل نے دونوں کو چونکا دیا۔

''کون ہے؟'' زری نے پوچھا تھا۔

☆☆☆

جب کوئی بات بگڑ جائے، جب کوئی مشکل پڑ جائے
تم دینا ساتھ میرا، او ہمنوا...... تم دینا ساتھ میرا

شیشوں سے باہر موسلا دھار بارش برستی، سبز درختوں پر گرتی بہت خوب صورت لگ رہی تھی...... مائیک ہاتھ میں پکڑے گاتا گلوکار سرخ قالینوں اور سنہری بارڈر والی سیڑھیوں پر سے ہنسی کے ساتھ اتر کر ڈائننگ ہال کی طرف جاتے ہوئے اسے بہت اچھا لگا، خوب صورت انگلش لہجے میں اردو بولتی ماڈرن ویل ڈریسڈ وہ لڑکی۔

☆☆☆

''یقین کریں میں آپ سے صاف، صاف کہہ رہی ہوں اگر آپ لوگوں نے دو منٹ کے اندر یہ کیرم بند نہیں کیا تو......'' زری نے رضا اور عباس کے سر پر کھڑے ہو کر تیز آواز میں کہا۔

باہر موسلا دھار بارش میں گلی میں شور مچاتے ننگ دھڑنگ بچے، تیز بارش کی ہلکی سی پھوار کبھی کمرے میں بھی محسوس ہوتی۔ مگر کھڑکی کے ایک پٹ کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔

اورنج اور سرخ رنگ کے سادے قمیص شلوار میں بے پروائی سے کندھے پر جھولتے دوپٹے کو کندھے پر پھیلائی ہاتھ میں لفلیر پکڑے وہ ان کے سر پر کھڑی تھی۔

''ارے یار...... بس میں بازی جیتنے والا ہوں۔'' رضا نے اسٹرائیکر کو جماتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس بہت ہوگئی...... آپ تو بازی ہاریں گے ہی...... تو جناب بظاہر آپ کی جیتی ہوئی بازی مات ہوئی۔'' زری نے کیرم کے سارے گیم کو ہاتھ سے خراب کرتے ہوئے کہا...... ''جلدی نیچے آئیں، پکوڑے اور املی کی چٹنی تیار ہے ہارے ہوئے کھلاڑی......'' زری نے ہنستے ہوئے کمرے سے نکلتے، نکلتے پلٹ کر کہا۔

''بدتمیز...... سارا گیم خراب کر دیا......'' عباس

نے پیر پٹخا۔

''گیم خراب نہیں کیا...... رضا صاحب بازی جیتنے کے لیے غلط راستہ اختیار کر رہے تھے...... بازی تو مات ہونا ہی تھی۔''

زری نے گرما گرم پکوڑا، چٹنی میں ڈبو کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''کون سا غلط راستہ......؟'' رضا مسکرایا۔

"what's a tasty pakory" انوشہ کا کانونٹ لہجہ اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آیا، سرخ ٹاپ اور جینز میں نفاست سے فورک میں پکوڑا پھنسائے چٹنی میں ڈبوتی انوشہ کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔

''اوہ یس......!'' رضا مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''یو نو رضا......! میں نے زندگی میں جو چاہا وہ پایا، چاہے وہ کوئی چیز ہو یا کوئی انسان......'' ہنی کے لہجے میں ایک انجانا سا غرور تھا۔

ایک لمحے کے لیے رضا کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوئیں...... اس نے جیب سے رومال نکال کر ٹھنڈے یخ ماحول میں پسینہ پونچھا اور پھر زبردستی مسکرا دیا...... وہ جانتا تھا مسکرانا بہت ضروری ہے کہ آج ہنی کے کہے پر ہی جبران صاحب نے نئی BMW کی چابی اسے دی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر جائے اور اپنے گھر والوں کو دکھائے فل اسپیڈ میں شہر کی سڑکوں پر دوڑاتا پھرے اور پھر اشعر...... اشعر کے پاس جائے کہ آج کل اسے اس کی ہر ہدایت اور نصیحت بہت کارآمد لگ رہی تھی۔

''پھر زری......؟'' زری کے گھر وہ کیسے جا سکتا ہے اس کی تو گلی میں بھی یہ گاڑی نہیں آسکتی......

''اوہ گاڈ...... ان لوگوں کو اپنی رہائش بدلنی چاہیے لیکن رہائش بدلنے سے ان کے حالات تھوڑا ہی بدل جائیں گے۔'' اس نے تلخی سے سوچا۔

''زری بہت خوب صورت ہے کیا کرو گے اس کی خوب صورتی کا، ارے اگر مرد کی جیب گرم ہو تو سیکڑوں خوب صورت لڑکیاں آس پاس منڈلاتی رہتی ہیں......''

کہیں سے آواز ابھری۔ ''زندگی میں آنے والے چانس کو ضائع مت کر...... ایک عام سی لڑکی کے لیے...... خاص بننے کو منع مت کر......''

''کیا سوچ رہے ہو......؟'' وہ جو اشعر کی نصیحتیں یاد کر رہا تھا ہنی کی کھنکتی ہوئی آواز میں پوچھے گئے سوال پر جیسے حقیقت میں واپس آگیا۔

''کچھ نہیں......'' اس کو لگا جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

''شیور......!'' ہنی کا لہجہ کھوجتا ہوا تھا۔

وہ خاموش رہا۔

''ایک بات بتائیں رضا، اکثر مڈل کلاس فیملیز میں لڑکے، اپنی کزنز وغیرہ کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں...... ان کی زندگی میں کوئی رنگ اور ہلچل نہیں ہوتی تو کسی نہ کسی لڑکی کے خوابوں میں وہ کھوئے رہتے ہیں، آپ کے ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں......'' ہنی کا لہجہ تمسخر اڑاتا ہوا تھا۔

رضا نے ایک نظر سرخ ٹاپ اور جینز میں ملبوس خوب صورت تراشیدہ بالوں اور نفاست سے کیے گئے میک اپ میں دھیمے، دھیمے بولتی، مسکراتی سی ہنی کو دیکھا۔ لان کے سادہ سے سوٹ میں گلے میں جھولتا دوپٹا، کمر پر لہراتی لمبی سی چوٹی اور چوٹی سے نکلتے شریر بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستی پسینے میں شرابور زری چھم سے اس کی آنکھوں میں اتر آئی، عام سی زری......

رضا نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا......

''میری زندگی...... میں کسی عام سی لڑکی کے لیے جگہ نہیں...... my special lady''

☆☆☆

''میڈم بہت اسپیشل خاتون ہیں...... اتنی باوقار اتنی سوفٹ...... اتنی مالدار...... اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ، کچھ لوگوں کا نصیب اللہ سونے کے قلم سے لکھتا ہے۔''

سیاہ شیفون کی ساڑی پر سیدھے کندھے پر میرون شال ڈالے، صراحی دار گردن پر ڈھلکا ہوا بڑا سا جوڑا، سیدھے ہاتھ میں ڈائمنڈ کا بریسلیٹ، مخروطی انگلیوں میں ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں، رودھرم پر کھڑی دھیمے لہجے میں، ٹھہر، ٹھہر کر بولتی، وہ وزیر سماجی بہبود اور تعلقات عامہ تھی، جو آج ایک ادارے میں بطور چیف گیسٹ مدعو تھی......

پیچھے کرسی پر بیٹھی نادیہ جو اس کے دفتر میں ٹائپسٹ تھی نے مرعوب لہجے میں اپنی ساتھی کولیگ سے کہا۔

''ہاں یار بہت زبردست پرسنالٹی ہے ان کی...... اور ان کے شوہر بھی تو ایک بہت بڑے بزنس مین ہونے کے ساتھ، ساتھ فارن منسٹر بھی ہیں۔''

''ہاں یار...... بس اللہ کی تقسیم ہے لیکن میڈم میں ذرہ برابر غرور نہیں...... بہت ہی نائس لیڈی ہیں، کچھ دن پہلے میں نے ان کا انٹرویو سنا تھا، اس قدر خوب صورت لہجہ ہے، اس قدر خوب صورت الفاظ استعمال کرتی ہیں کہ بندہ بس کھو جائے۔''

وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن تھیں اور انہیں احساس تک نہیں تھا، کوئی ان سے بہت قریب بیٹھا سب سن رہا تھا۔ منسٹر صاحبہ واپس جا رہی تھیں، میڈیا والے انہیں گھیرے ہوئے تھے، وہ چلتی جا رہی تھیں اور ساتھ، ساتھ سوالوں کے جوابات بھی دے رہی تھیں۔

''میڈم آپ اتنی پولائٹ اتنی تحمل والی ہیں کبھی آپ کو غصے میں نہیں دیکھا؟ لیکن کیا کبھی کوئی ایسا شخص بھی ہے جس کا جب بھی آپ کو خیال آتا ہو یا وہ نظر آجائے تو غصے کی لہر آپ کے جسم میں دوڑ جاتی ہو۔'' ایک نجی ٹی وی کے رپورٹر کے سوال نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے...... وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔

چند سیکنڈ کے لیے اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ مگر اس نے کمال مہارت سے اپنے تاثرات نارمل رکھے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی مجمعے کو چیرتا ہوا ایک ویل ڈریسڈ آدمی آگے بڑھا اور اس نے جلدی سے کہا۔

"excuse me madam" وہ پلٹی۔

"are you" اس کے چہرے کے تاثرات اتنے سرد تھے کہ اس شخص کے سوال کا آدھا حصہ اس کے منہ میں ہی رہ گیا تھا۔ اس نے مڑ کر رپورٹر کو دیکھا اور پھر اس شخص کو...... اور پھر بغیر جواب دیے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کیا اس نے جواب نہیں دیا تھا۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

☆☆☆

''اس روز کیا ہوا تھا طیبہ...... کیوں پوچھتی ہو۔'' اس نے تصور میں طیبہ سے پیار بھرا شکوہ کیا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے رضا کی خوشبو کو اپنے چاروں طرف محسوس کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ اور مسکراتے ہوئے تکیے پر سر رکھ دیا۔

''آپ بہت اچھے ہیں رضا...... بالکل خوابوں کے شہزادے جیسے، باوقار، محبت کا پیکر...... آپ پوچھ رہے تھے کیا مجھے آپ سے محبت ہے؟

محبت...... م وح ب ت

یہ بظاہر چار حرفی لفظ (مگر اصل میں پانچ حروف) بہت بڑی ذمے داری ہوتا ہے۔ بابل کی دہلیز پر بیٹھی بیٹیوں پر ان معنی میں جچتا نہیں جیسا آپ پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ اچھے ہیں، آپ مجھے اچھے لگتے ہیں، آپ کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتے ہیں اور میں بھی ایک لڑکی ہوں اور بہت عام سی لڑکی ہوں لیکن محبت جیسا عہد میں آپ سے نہیں کر سکتی۔ میں ایک بیٹی ہوں جس پر ماں، باپ بے انتہا بھروسا کرتے ہیں؟ میں بہن ہوں، جس پر بھائی فخر کرتا ہے۔ میں چاہتی ہوں اگر میں بیوی بنوں تو میرا شوہر میری پاکیزگی کا اعتبار کرے...... میں چاہتی ہوں اگر ہماری شادی ہو تو آپ مجھ سے اور میں آپ سے ٹوٹ کر محبت کریں اور جو ہم نہ مل سکے تو آپ کو جب بھی میرا خیال آئے تو آپ میرا نام احترام سے لیں۔ کیونکہ مجھے اپنی عزت

بہت عزیز ہے۔ اگر میں اپنی خواہشوں کو ترتیب دوں تو شاید آپ اس لسٹ میں پہلے نمبر پر ہوں...... لیکن......''
وہ مسکائی۔

''اب اس دل میں
کوئی اور داخل نہیں ہو سکتا
کیونکہ
تمہارے آنے کے بعد
میں نے تالا لگا کر
چابی گہرے سمندروں میں پھینک دی ہے......
لیکن یہ نظم، یہ اظہار محبت، اپنے وقت کا منتظر ہے......
اور وہ وقت کب آئے گا......''

اس کا دل بے صبری سے دھڑکا۔
اور دل...... دل تو دل ہوتا ہے ناں......

☆☆☆

طیبہ اور زری نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
''کون ہو سکتا ہے؟'' دونوں کی آنکھیں سوال کر رہی تھیں۔
''سلام بی بی جی......'' زری کے دروازہ کھولنے پر ایک ادھیڑ عمر خاتون کھڑی نظر آئی۔
''جی، آپ کون......؟''
''وہ بڑی چودھرائن آئی ہیں۔'' زری نے دیکھا اس خاتون کے پیچھے ایک باوقار سی خاتون بڑی سی چادر اوڑھے ہاتھ میں تسبیح سنبھالے چہرے پر متانت لیے کھڑی تھیں۔
سرخ خوان پوش سے ڈھکے تھال کو پکڑے وہ عورت اسے بتا رہی تھی۔
''یہ کون ہیں؟ میں تو آپا اور کاشف بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔''
ثمینہ اور کاشف اسلام آباد سے آئے ہوئے تھے اور آج وہ رضا کی طرف گئے ہوئے تھے...... ہر جگہ ساتھ لے جانے والی ثمینہ نے آج اس سے پوچھا تک نہیں تھا، وہ حیران ضرور ہوئی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے آپا اور کاشف بھائی کا کوئی اور پروگرام بھی ہو...... وہ سر جھٹک کر اماں کے بالوں میں مالش کرنے بیٹھ گئی تھی۔
''لیکن یہ لوگ کون ہیں؟''
ابا نماز پڑھ کر آئے تھے، اماں اور ابا اب حیران نظروں سے گھر میں داخل ہوتی ان عورتوں کو دیکھ رہے تھے جو ادب سے سلام کر کے سرخ کپڑے سے ڈھکے تھال ایک طرف ترتیب سے رکھ رہی تھیں۔
''کون ہیں یہ لوگ؟'' زری اور طیبہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں نے آنکھوں سے سوال کیے، گلی میں چمچاتی لینڈ کروزر کھڑی تھی...... مسلح گارڈز دروازے کے باہر کھڑے تھے، محلے کی کھڑکیوں سے خواتین سر باہر کیے حیرت سے دیکھ رہی تھیں، چند راہ گیر...... تو ٹھٹک کر رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔
''میں چودھرائن کلثوم ہوں، چودھری ملک تیمور علی میرا ایک ہی بیٹا ہے۔'' سرخ و سفید رنگت، قیمتی کڑھائی والی چادر میں لپٹی، دونوں ہاتھوں میں کلائیوں تک بھری سونے کی چوڑیاں، ہاتھوں میں رچی مہندی، باوقار، سلجھی ہوئی وہ خاتون اپنا تعارف کروانے کے بعد نظروں ہی نظروں میں بیٹھنے کی اجازت طلب کر رہی تھیں۔ اور پھر......

☆☆☆

''یہ مٹھائی کس خوشی میں......؟'' کاشف نے پلیٹ سے گلاب جامن اٹھاتے ہوئے شگفتہ لہجے میں اپنی خالہ سے پوچھا۔ وہ ابھی، ابھی ان کے ہاں پہنچے تھے۔
''رضا کی سسرال سے مٹھائی آئی ہے، منہ میٹھا کرو......'' خالہ مسکرائیں اور گلاب جامن کاشف کے منہ میں جیسے پتھر کی ہو گئی...... اور ثمینہ اس کا تو پورا وجود جیسے زلزلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔
''رضا مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔'' کاشف نے سرد لہجے میں موبائل فون سے کھیلتے رضا سے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

''سائیں جی...... بڑی چودھرائن گئی تھیں آپ

کے رشتے کے لیے......'' فرہاد نے ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر تیمور علی کو بتایا۔
''پھر......؟'' تیمور علی کا لہجہ بے تاب ہوا۔ فرہاد نے برسوں بعد اپنے چھوٹے چودھری اپنے مالک کو اس قدر...... بے تاب دیکھا تو ایک خوشی بھرا اطمینان اس کے چہرے پر رنگ گیا۔

☆☆☆

''رضا مجھے تم سے اس چھوٹے پن کی امید نہیں تھی۔'' کاشف کا بس نہیں چل رہا تھا کہ تھپڑ مار، مار کر رضا کا چہرہ سرخ کر دے۔
''تم...... تم تو کہتے تھے......'' ''یار دیکھ تیری تو سالی ہے یعنی آدھی گھر والی مگر میری پوری گھر والی بنا دے خدا کی قسم جنت کی حور ہے...... اب تو زری کے بغیر سانس نہیں لی جاتی۔ کیا اسپیشل چیز اللہ نے زمین پر اتار دی۔ پرفیکٹ لڑکی، خوب صورت، خوب سیرت، تعلیم یافتہ، بااخلاق، باادب بہت خاص، بہت اسپیشل...... اور......''
''چل چھوڑ کاشف تو بھی کیا بات لے کر بیٹھ گیا۔'' رضا نے بیزاری سے کاشف کی بات کاٹی۔
''تو تم......'' کاشف نے تھوک نگلا۔
''ہاں یار...... میں ایک عام سی لڑکی کے لیے اپنے فیوچر کو داؤ پر نہیں لگا سکتا، ہی پاکستان میں رہنا نہیں چاہتی، میری ساری فیملی کا کینیڈا کا امیگریشن ہو چکا ہے، تم جانتے ہو سب جا چکے ہیں، ہاں جبران صاحب نے ایک بہت بڑا گھر ہمیں گفٹ کیا ہے، گھر والے وہاں سیٹ کر رہے ہیں اسے، اماں شادی کی رسومات کے لیے رکی ہوئی ہیں، ایکچولی ہی تو سب رسومات کو بہت ہی فضول سمجھتی ہے لیکن اماں کی خوشی کی خاطر میں نے اسے بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔''
رضا بول رہا تھا کہ یک دم اس کے موبائل فون کی بجتی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔
رضا...... کی آنکھوں سے کاشف کے چہرے کے بدلتے رنگ چھپ نہ سکے۔

☆☆☆

زیورات، پھل...... مٹھائی...... کپڑے...... ثمینہ ایک، ایک تھال پر سے کپڑا ہٹا کر دیکھتی جا رہی تھی اور حیرت سے کبھی ماں اور کبھی گم صم بیٹھی زری کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''اتنا کچھ...... پہلی دفعہ میں......'' اس نے حیرت سے پہلے ابا میاں اور پھر کاشف کو دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔
''کون لوگ تھے، زری کو کیسے جانتے ہیں؟''
''کہاں دیکھا ہے؟'' ثمینہ نے جیسے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔
''بیٹا بہت بڑا خاندان ہے، بہت بڑے لوگ ہیں...... ہمیں معلوم ہے، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا لیکن وہ خاتون بہت بضد ہیں کہ ہم بھی ان کے گھر آ جائیں......'' احمد علی کا لہجہ دھیما تھا۔
زری نے ایک نظر باپ کی طرف دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔
''تو چلیں ناں ابا...... ہماری زری کے تو نصیب کھل گئے۔'' ثمینہ بہت ایکسائٹڈ تھی۔
''ہاں ہمیں ضرور جانا چاہیے بلکہ زری کا رشتہ بس یہیں طے کر دینا چاہیے تاکہ بہت سے کم ظرف لوگوں کو پتا چلے کہ زری کی کیا حیثیت ہے۔'' کاشف کے لہجے میں چند گھنٹوں پہلے والی تلخی جھلک رہی تھی۔
''تم لوگ اس قدر جذباتی کیوں ہو رہے ہو، میں کہہ رہا ہوں رشتہ اپنے جیسوں میں ہی اچھا رہتا ہے۔ سچ پوچھو تو میری تو مرضی نہیں ہے۔'' ابا کا لہجہ کھردرا ہوا۔
''اچھا اماں آپ بتائیں...... لڑکے کی ماں کیسی تھیں اور کیا کہہ رہی تھیں؟''
ثمینہ نے خاموش بیٹھی ماں کا گھٹنا ہلایا...... جو ہاتھوں میں موٹے، موٹے کنگن پکڑے انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔
''بہن میرے بچے نے زندگی میں بہت کم فرمائش کی ہے...... آپ کی بیٹی کے لیے تو اس نے ضد پکڑ لی ہے، میرے لیے اور میرے خاندان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی کی بات ہو ہی نہیں سکتی کہ میرا

پتر شادی کے لیے راضی ہو گیا...... امیری، غریبی کوئی حیثیت نہیں رکھتی، یہ تو اللہ پاک کی تقسیم ہے...... اس میں کسی کی اچھائی یا برائی کا تعلق نہیں ہے...... یہ تو مولا پاک کی تقسیم ہے۔ اگر تفریق ہے تو نیکی اور بدی کی بنیاد پر...... اللہ پاک نے آپ کو نیک سیرت بیٹی دی ہے۔ اللہ اس کا نیک نصیب کرے......"

"لیکن......" راشدہ بیگم نے بولنا چاہا۔

"میری بہن...... کچھ نہ بولیں...... رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں اگر اللہ پاک کو منظور نہ ہو تو رب سوہنے کی مرضی لیکن یہ سارا سامان میری دھی کا ہی ہے۔ یہ واپس نہیں ہوگا۔ میں کل گاڑی بھیجوں گی...... آپ انکار کرنے سے پہلے صرف ایک دفعہ میرے پتر سے مل ضرور لیجیے گا۔"

☆☆☆

سیاہ آسمان پر تاروں کا جال بکھرا ہوا تھا، صحن میں لگے گملوں میں پھول مسکرا رہے تھے...... لیکن وہ اداس تھی...... آنسو اس کے چہرے پر سے پھسلتے ہوئے اس کے گریبان میں منہ چھپا کر رو رہے تھے۔

سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں، وہی دو آنکھیں، ناک اور کان...... صرف ایک چیز جو اسے بازار میں کھڑی عورت سے ممتاز کرتی ہے، وہ اس کی عزت ہوتی ہے...... اور اس کی عزت...... اس نے بے دردی سے چہرے پر پھسلتے آنسوؤں کو مسلا......

پھر ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھا اور پھر کئی دفعہ کا ملایا ہوا نمبر پھر ری ڈائل کر دیا۔

مسلسل بجتی گھنٹیوں سے شاید تنگ آ کر دوسری طرف فون ریسو کر لیا گیا...... اور پھر کسی نے بھاری مردانہ آواز میں کہا......

☆☆☆

"سامعین وناظرین آج ہمارے سامنے ایک کامیاب لیڈر، کامیاب بزنس لیڈی، کامیاب شاعرہ، کامیاب سماجی ورکر بیٹھی ہوئی ہیں۔" وہ آڈینس سے اس کا تعارف کروا کر اب اس سے مخاطب تھی۔

"میڈم اتنی ساری کامیابیوں کو جب آپ اپنے نام کے ساتھ جڑا دیکھتی ہیں تو کیسا لگتا ہے اور ابھی، ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے ہے لیکن آج آپ ہمارے پاک وطن کی سیاست کا ایک درخشاں ستارہ ہیں، آپ کا نام چیف منسٹر کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے تو میڈم یہاں تک کے سفر میں، وہ کون سا جذبہ تھا، وہ کون سی تحریک تھی جس نے آپ کو دن و رات کی تفریق کے بغیر محنت پر اکسایا اور آج آپ...... لوگوں کے لیے خاص کر خواتین کے لیے ایک مثال بن چکی ہیں تو اس موقع پر آپ کیا کہیں گی......؟" ٹی وی اینکر نے سیاہ ساڑی میں ملبوس، کاندھے پر سیاہ شال جس کے بارڈر پر سنہری زری کا کام تھا۔ ہلکے، ہلکے میک اپ اور لمبے سیاہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے اس باوقار خاتون سے پوچھا جو اس کے اسٹوڈیو میں چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کا سوال سن رہی تھیں۔

اس نے ایک ادا سے اپنی خوب صورت ساڑی کا پلو درست کیا اور مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں بس اتنا کہا۔

"جی ایک جذبہ تھا...... یا یوں سمجھیں ایک سوال تھا جس کا جواب دینا تھا۔"

☆☆☆

"رضا......" وہ ہولے سے بولی۔

"یار کیا مصیبت ہے، تم پاگل تو نہیں ہو، پریشان ہو گیا ہوں میں تم سے، بندہ مصروف ہو سکتا ہے اور تم ہو کہ فون پر فون کیے جا رہی ہو، میں نے جتنی بار ڈسکنیکٹ کیا تو تم نے میسج لکھ بھیجا اور جب میں نے کوئی ریپلائی نہیں کیا تو تم نے واٹس ایپ پر وائس میسج کر دیا۔ میں تو بیزار ہو گیا ہوں تم سے۔" وہ حق دق فون کان سے لگائے اس کی بیزاری کی داستان سن رہی تھی۔

"برائے مہربانی ایک رحم کرو، آئندہ مجھے فون نہیں کرنا...... سمجھیں۔"

رضا نے نہایت بے دردی سے کہا۔ اس کی سنے بغیر کہ اس لہجے پر جس وجود کے پرخچے اڑائے ہیں، وہ

اصل میں کہنا کیا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"اماں بس میں بہت پڑھوں گی، مجھے شادی نہیں کرنی......" زری نے الماری میں سے کپڑے منتخب کرتی ماں کے پیچھے کھڑے ہو کر ضدی لہجے میں کہا۔

"اماں کچھ تو بولیں؟" زری کو ماں کی خاموشی نے ایک جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تو اس نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ اپنی بات دہرائی اور ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"شادی نہیں کرنا چاہتیں کیوں...... کسی کا انتظار ہے کیا؟" راشدہ بیگم نے سرد لہجے میں سرد آنکھیں اس کی آنسو بھری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

اور زری کو ایسا لگا کہ جیسے اس کا سارا وجود پتھر کا ہو گیا ہو اور اس کی ماں نے اس کے وجود کو آدھا زمین میں گاڑ کے پتھروں سے سنگسار کر دیا ہو، اسے ایسا لگا دنیا کی ساری عمارتیں اس کے اوپر آ گری ہوں۔ اور اس کا وجود، اس کی خواہشیں، اس کا مان اور اس کا دل سب کچھ ملبے تلے دبا ہو۔

وہ چند لمحے ماں کی پشت کو دیکھتی رہی جو دوبارہ الماری کی طرف رخ پھیر چکی تھیں۔

"امی...... رضا بھائی نے صاف منع کر دیا ہے، وہ اپنے باس کی بیٹی سے شادی کر رہے ہیں۔"

"کیوں بیٹا......؟ تم اس سے کہتیں ناں کہ پھر اس نے اور اس کی ماں نے ہمیں کیوں آس دلائی تھی۔" راشدہ بیگم کو جب ثمینہ نے رضا سے ہونے والی گفتگو اور اس کی ماں کے رویّے کے بارے میں بتایا تو انہوں نے تاسف بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

"ارے امی، آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، اچھا ہوا ان کی لالچی طبیعت کا ہمیں پہلے ہی پتا چل گیا، ورنہ بعد میں اگر پتا چلتا تو ہم کیا کر لیتے۔"

ایک وقت آتا ہے بیٹیاں ماں کی سہیلیاں بن جاتی ہیں اور ثمینہ نے بھی ماں کو سہیلیوں کی طرح بہلایا...... راشدہ بیگم ماں تھیں اور وہ زری کے دل کی کیفیت سمجھتی تھیں۔ انہیں بہت دکھ تھا، ایک چھوٹا سا کھلونا ٹوٹنے پر واویلا کرنے والی، ذرا سا بخار ہو جائے تو وصیت لکھ ڈالنے والی ان کی زری اتنے سارے آنسو پی رہی تھی...... اپنے آپ کو بے پروا اور مضبوط ثابت کرنے کے لیے الٹی سیدھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ سب سمجھ رہی تھیں۔

زری کی تکلیف...... رضا کا لالچ...... تیمور علی کی خواہش...... سونے کا ڈھیر...... دل کی خوشی کے آگے سب بیکار ہوتا ہے......

وہ عورت تھیں...... اس لیے جانتی تھیں...... ان کی بیٹی ہر حال میں سمجھوتا کر سکتی ہے...... وہ ماں تھیں انہیں یقین تھا......

کہیں بیٹی کو ساری زندگی دُہرے انداز میں نہ گزارنی پڑ جائے انہیں خدشہ تھا۔

☆☆☆

"مجھے خدشہ ہے کہ یہ امیر زادے، جنہیں ہر چیز بن مانگے مل جاتی ہے، میری بیٹی سے شادی اس کی وقتی خواہش نہ ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ بہت بڑے لوگ ہیں ہماری اور ان کی کوئی برابری نہیں، رشتے برابر والوں میں صحیح رہتے ہیں، ہمارے گھر سے بڑے تو ان کے گھر میں لائن سے بنے سرونٹ کوارٹرز تھے......"

احمد علی نے چودھری تیمور کے گھر سے واپسی پر بیوی سے کہا۔

وہ خاموش رہیں......

5000 گز پر بنا طویل و عریض محل نما گھر، وسیع و عریض لان جس میں لائن سے فوارے چل رہے تھے۔ گیٹ سے لے کر اندرونی داخلی دروازے تک مؤدبانہ ہاتھ باندھے ملازمین...... سنگ مرمر کے ستونوں سے لپٹے رات کی رانی کے مہکتے پھولوں والے پودے کہ جن بیل بوٹیوں کو گولائی سے ستون کے گرد باندھا گیا تھا، ہوا میں جھومتے رنگ برنگے گلاب اور شرماتی لجائی...... مہکتی، چنبیلی کی خوشبو...... قیمتی فانوسوں

ساتھ آنے والے ان کے گھر والوں کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا......

''بسم اللہ...... بسم اللہ...... میرے سوہنے رب نے مہمان بھیجے ہیں، تشریف لائیں۔'' چودھرائن کے ساتھ کلف لگا پگڑ لگائے چودھری صاحب بھی استقبال کو آگے بڑھے۔

احمد علی کو چودھری رجب علی سے گلے ملتے وقت نہ جانے کیوں اپنے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ محسوس ہوا۔

''آپ بے فکر رہیے...... آپ کی بیٹی، ہماری بیٹی بن کر رہے گی، چودھری تیمور علی میرا ایک ہی ایک بیٹا ہے اور اس کی خوشی ہمیں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ بات میں آپ کو بتا دوں، میرے بیٹے کو کبھی کوئی معمولی چیز، کوئی عام چیز پسند نہیں آئی۔ اگر اس نے وجی زرینہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے تو میں بغیر دیکھے کہہ سکتا ہوں وہ بہت خاص ہو گی۔''

چودھری رجب علی نے خاموش بیٹھے احمد علی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن......'' احمد علی نے سوکھے ہوتے حلق میں تھوک نگلا۔

''بس بھائی میرے، سب ٹھیک ہے، یہ ہے میرا بیٹا چودھری تیمور علی۔'' کلثوم بیگم نے سیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سے بڑے باوقار انداز میں آ کر چودھری تیمور علی اسی طرف آ رہا تھا سب کی نظریں بے ساختہ اس کی طرف اٹھ گئیں...... احمد علی کو لگا...... جیسے ان کا وجود ہلکورے کھا رہا ہو، وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور پھر ان کے منہ سے نکلا تو بس......

''آپ......''

☆☆☆

''طیبہ، میں صرف ایک بات رضا سے کرنا چاہتی ہوں، صرف ایک جملہ لیکن وہ میرا فون ہی ریسیو نہیں کر رہے۔'' زری اس دن اکیلی تھی تو اس نے طیبہ کو بلا لیا تھا۔ طیبہ اسے کہتے ہوئے بے بسی سے موبائل

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا...... طیبہ کو دلی تکلیف ہوئی...... لیکن اس نے اپنے آپ کو مضبوط ظاہر کیا۔

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کب تک
جو تمہیں بھلا چکا ہے، اسے تم بھی بھول جاؤ

بھولنا آسان نہیں ہوتا، اس نے ایک بار پھر نمبر پریس کیا تو طیبہ افسوس سے سر ہلانے لگی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس کا فون چھین کر فرش پر دے مارے...... لیکن وہ بے بس تھی...... اور زری......

☆☆☆

رضا نے اسکرین پر جگمگاتے نام کو دیکھا اور ایک اکتاہٹ اس کے سارے وجود پر چھا گئی۔

اس نے ہمیشہ کی طرح لائن کاٹ دی اور آج تو حد ہی کر دی۔ فون کو پاورڈ آف کیا اور سم نکال کر ہوا میں اچھال دی۔

☆☆☆

''بعض اوقات ہم اللہ سے جو کچھ مانگتے ہیں وہ اللہ پاک ہمیں نہیں دیتا...... جانتی ہو کیوں؟'' ثمینہ نے خاموشی سے چینل سرچنگ کرتی زری کے ہاتھ سے ریموٹ چھین کر ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ ہم اس قابل نہیں ہوتے......''

زری کا لہجہ ثمینہ کو تڑپا گیا۔

''نہیں میری جان بلکہ اس لیے کہ اللہ نے اس سے زیادہ قیمتی چیز ہمارے لیے رکھی ہوتی ہے۔ ہماری سوچ ہماری خواہشات بہت معمولی بہت حقیر ہوتی ہیں لیکن اللہ پاک کی عنایات بے شمار، ہم اپنی اوقات کے مطابق مانگتے ہیں اور وہ ہم کو اپنی شان کے مطابق دینا چاہتا ہے...... لیکن ہم کم ظرف اپنی سطح پر آ کر رک جاتے ہیں، ضد کرتے ہیں، واویلا مچاتے ہیں، کیوں آخر کیوں؟ کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے والے...... اللہ پاک کی حکمت پر بھروسا اور یقین بھلا کیوں نہیں رکھتے......'' جانے وہ اسے تسلی دے رہی تھی یا سمجھا رہی تھی۔

''پتا ہے میں نے کہیں پڑھا تھا، جب اللہ ہماری دعا سنتا ہے اور ہماری مانگی ہوئی چیز ہمیں عنایت کرتا

نہیں کرتا تو اور زیادہ شکر ادا کرنا چاہیے...... کیونکہ اب اللہ پاک اس خواہش کو اپنی شان اور مرضی کے مطابق پورا کرے گا۔ کچھ لے کر اس سے بہتر ادا کرے گا...... تم آدھا خالی گلاس کیوں دیکھ رہی ہو تم کو آدھا بھرا گلاس کیوں نظر نہیں آ رہا...... زری...... تم اتنی بے وقوف کیوں ہو......'' زری کی طویل خاموشی نے ثمینہ کو جھنجلا دیا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا...... کہ وہ پتھر بنی بیٹھی زری کو اٹھا کر پٹخ دے۔

''خالی گلاس اور...... رضا...... آپا یہ کیوں سمجھ رہی ہیں کہ میں شاید رضا کی محبت میں گرفتار ہوں اور اپنی ناکام محبت کا سوگ منا رہی ہوں۔ محبت اور رضا...... ہونہہ...... پسند تو ہمیں بہت سی چیزیں آتی ہیں...... پسند اور اچھا لگنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور محبت...... محبت تو بہت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے۔ الحمد للہ...... میں نے ایک لمحے بھی رضا سے محبت نہیں کی...... ہاں وہ اچھے ہیں بلکہ وہ اچھے تھے، مجھے اچھے لگتے تھے۔ لیکن میری انا اور عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں...... دکھ اس بات کا نہیں کہ رضا نے میرے مقابلے میں بہتر مستقبل کو چنا...... تکلیف صرف ایک بات کی ہے، میری اور میرے خاندان کی تضحیک کرنے کا حق انہیں کس نے دیا...... میری انا...... میری عزت نفس...... میری خودی...... میری شخصیت...... میرا وقار...... اور میرا دل...... سب ماتم کناں ہیں، میں رضا سے صرف ایک جملہ کہنا چاہتی ہوں...... صرف ایک بات...... وہ کہتے ہیں ایک عام سی معمولی لڑکی...... میں کہنا چاہتی ہوں کہ میں دراصل......'' ثمینہ نہ جانے کب کی کمرے سے جا چکی تھی اور زری آنکھیں بند کیے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی، آنسو آنکھوں سے نکل کر چہرے سے پھسلتے اس کے گریبان میں منہ چھپا کر کبھی رو رہے تھے اور کبھی ہنس رہے تھے۔

زندگی رخ بدل رہی تھی...... اس نے کھڑے ہو کر باہر کھلنے والی کھڑکی کو ہمیشہ کے لیے بند کیا اور واپس اپنی جگہ پر آ گئی۔

☆☆☆

''اُف کتنے بڑے اور سادہ لوگ، سارے خاندان والے منہ کھولے بیٹھے تھے...... اور تیمور بھائی، تیمور بھائی کس قدر ہینڈسم لگ رہے تھے، ماشاء اللہ...... اللہ پاک نے زری کو ہر چیز سے نوازا ہے۔ پیسہ، دولت، خاندان، حسب نسب...... اثر رسوخ......'' اس نے توقف کیا۔ ''اللہ پاک نے ہر چیز سے تیمور بھائی کو نوازا ہے۔'' زری کی رخصتی کے بعد واپس گھر آتے ہوئے ثمینہ جذباتی اور خوشی سے بھرپور لہجے میں کاشف سے کہہ رہی تھی۔

کاشف آسمان پر اڑتے جہاز کو دیکھ رہا تھا کہ آج رضا کی اپنی بیگم کے ساتھ کینیڈا روانگی تھی۔

☆☆☆

زندگی اتنی خوب صورت ہو گی یہ تو زری نے سوچا تک نہیں تھا۔ تیمور اتنے اچھے اور co.opretive

ہوں گے اس کا تو زری کو اور اس کے گھر والوں کو اندازہ تک نہیں تھا...... وہ گاؤں جاتی تو سارا گاؤں، اس کے آگے پیچھے پھرتا اور جب وہ شہر کی وسیع و عریض محل نما کوٹھی میں شفٹ ہوئی تو تیمور نے بے انتہا محبت اور اعتبار کے ساتھ، ساتھ نوکروں کی ایک فوج اس کی خدمت کے لیے کھڑی کر دی...... تیمور ایک بزنس مین ہونے کے ساتھ، ساتھ ایک کامیاب سیاسی پس منظر بھی رکھتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے کہیں، کہیں زری کا اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے، ایلیٹ کلاس میں موو کرنے کے لیے ابھی اسے کچھ وقت درکار ہوگا سو غیر محسوس طریقے سے وہ زری کی تربیت کر رہا تھا۔ بعض اوقات زندگی میں ہمیں ایک یوٹرن کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہم اس یوٹرن سے واقف نہیں ہوتے اور جب ہم انجانے میں وہ یوٹرن لے لیتے ہیں تو زندگی اتنی تیزی سے رخ بدل لیتی ہے کہ کبھی ہمیں خود بھی یقین نہیں آتا۔

شادی کے بعد اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کے ساتھ، ساتھ زری کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور نعمت دونوں ہی سے نوازا۔

اس کی شاعری نوجوان دلوں کی دھڑکن بن گئی، وہ ایک ہمدرد سوشل ورکر کے ساتھ بہترین بیوی اور ذمے دار ماں بھی تھی۔

تیمور کی محبت، اس کے اعتماد، بھرپور ساتھ نے زری کی شخصیت ہی بدل کے رکھ دی تھی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، جس شخص پر میں نے اتنا غصہ کیا تھا، وہ میری محبت میں گرفتار ہو جائے گا۔'' تیمور کے سینے پر سر رکھ کر اس نے محبت بھرے لہجے میں ہزار دفعہ کی دہرائی ہوئی بات کو پھر دہرایا۔

تیمور نے تکیے پر سے ہلکا سا سر اٹھا کر اپنی محبوب بیوی کے چہرے کو محبت سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے دوبارہ تکیے پر سر رکھ کر اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں میں چھم سے کوئی اتر آیا۔

''ہائے چودھری جی میرا وڈا دل چاہتا ہے کہ بیگم صاحبہ بنوں......'' رقیہ نے پراندہ ہلاتے ہوئے معصومیت سے تیمور سے کہا۔

آکسفورڈ سے پڑھا ہوا تیمور اس کی سادگی پر بے ساختہ ہی تو ہنس دیا۔

''تم بیگم صاحبہ ہی تو ہو، اس حویلی کی رانی، پورے گاؤں کی چھوٹی چودھرائن۔'' تیمور نے اپنے لہجے میں بے تحاشا پیار سموتے ہوئے کہا اور اسے اپنے سے مزید قریب کر لیا۔

''نہ جی چودھری جی جیسی ٹی وی میں دکھاتے ہیں ناں، ویسی بیگم صاحب بننے کو دل چاہتا ہے، اتی ضد کی پر آپا نے پڑھنے ہی نہیں دیا۔'' رقیہ نے منہ بسورا۔

''بس میری بھولی رانی، دل چھوٹا نہ کرو، میٹرک آپ کے ابا نے کرا دیا ہے اور باقی......'' تیمور کچھ کہتے، کہتے شرارت سے مسکرا دیا۔

''باقی...... واقی...... کچھ نہیں، چودھری تیمور مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے آپ نے مجھے پڑھانا ہے، شہر کے بڑے، بڑے کالجوں میں پھر میں بھی ایک دن الیکشن لڑوں گی۔'' رقیہ جذباتی انداز میں لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اچھا پھر......'' تیمور نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''پھر...... پھر......'' لیکن تیمور کی دیوانگی نے رقیہ کو مزید بولنے نہیں دیا اور وہ اس کی محبتوں کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔

''کیا ہوا تیمور، کیا سوچ رہے ہیں؟'' زری نے آنکھیں بند کیے تیمور سے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں میری جان، بتاؤ انسان کی اچھائی کا پیمانہ میرے نزدیک کیا ہے؟'' تیمور نے سوال کے بدلے میں سوال کیا۔

''کیا؟'' زری نے پوچھا۔

''اس کا اپنے ماں، باپ کے ساتھ رویہ...... جب میں نے آپ کو اپنے ابا کے لیے اس قدر پریشان

دیکھا اور آپ کی بے خوفی دیکھی تو میں نے سوچا، جس سچائی محبت اور اچھائی کو میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، وہ سب اس لڑکی میں ہے اور پھر اسی وقت میں نے فیصلہ کیا اور فرہاد سے کہا۔

''فرہاد یہ لڑکی...... وہی ہے جس کی مجھے تلاش تھی اس کا پتا لگاؤ اور پھر فرہاد نے کمال مہارت سے آپ کو fallow کیا اور آج آپ میری بیوی ہیں۔ اور ماشاء اللہ آپ کی تعلیم بھی مکمل ہو چکی ہے...... گھر بھی مکمل ہو گیا ہے، میں چاہتا ہوں آنے والے الیکشن میں ہماری خاندانی سیٹ پر آپ کھڑی ہوں۔''

''میں......؟'' زری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''جی آپ......'' تیمور مسکرایا۔

''میری خواہش نہیں ہے لیکن اگر آپ کی خواہش ہے تو پھر سر تسلیم خم ہے......'' زری نے ایک ادا سے کہا۔

تیمور نے ایک نظر محبت سے مسکراتی اپنی محبوب بیوی کو دیکھا...... مجھ سے زیادہ یہ کسی کا خواب تھا اس نے دل ہی دل میں کہا اور تیمور نے اپنے گرم ہونٹ اس کے سرد ہاتھوں پر رکھ دیے۔

☆☆☆

لگتا تھا زری پیدا ہی آسمان کی وسعتوں کو چھونے کے لیے ہوئی تھی۔ وہ جس جگہ جاتی، جہاں کھڑی ہو جاتی، کامیابی اس کے قدموں سے لپٹ جاتی۔

وہ خوب صورت تھی اب خوب صورت ترین بلکہ حسین ترین ہو گئی تھی...... وہ صندلی، اس کی صراحی دار گردن اور مخروطی انگلیوں میں جب سجتے تو دیکھنے والے کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتے، وہ جو رنگ پہنتی وہ اس کا بن جاتا۔

وہ ہر دلعزیز شاعرہ تھی، اس کی کہی غزلیں گانا بڑے، بڑے گلوکاروں کے لیے باعث فخر ہوتا۔

اس کے بچے ہر سال اپنے اسکول کے ٹاپ طالب علم قرار پاتے، اس کا شوہر، اس کی پوری سسرال اس کی دیوانی تھی۔

محبت اور دولت دونوں اس پر دل و جان سے مہربان تھے لیکن پھر بھی...... کہیں دل میں ایک خلش سی تھی، ایک کانٹا سا چبھا تھا، لمبی، لمبی تقریریں کرنے والی، مسز زرینہ تیمور علی کے حلق میں ایک جملہ آ کر اٹک جاتا۔

اس کا دل چاہتا، زمین کی تہوں سے آسمان کی وسعتوں سے یا دنیا کی کھا کھی سے کہیں سے کہیں سے بھی وہ سامنے آ جائے اور پھر وہ کہے......

☆☆☆

اس نے فون سائلنٹ پر لگایا ہوا تھا لیکن ہر آنے والی کال پر اس کی اسکرین جگمگانے لگتی اور اسکرین پر جگمگاتا نام، اس کو سر تا پا سلگا دیتا، نفرت کی ایک لہر اس کے سارے وجود میں دوڑنے لگتی......

''کیا ہوا، کس کا فون آ رہا ہے؟'' تیمور نے مندی، مندی آنکھوں سے بیڈ سے پاؤں لٹکائے ہاتھوں میں موبائل فون تھامے بیٹھی زری سے سرسری لہجے میں پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔

''معلوم نہیں ویسے ہی......'' اس نے آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے عام لہجے میں کہا اور ایک میسج سینڈ کر کے فون پاور ڈ آف کر دیا۔

''اب اس سلسلے کو ختم ہو جانا چاہیے۔'' اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں لیکن صرف آنکھیں موندنے سے بھی کسی کو کبھی نیند آئی ہے بھلا......؟

☆☆☆

''رضا کے ساتھ تو بہت ہی برا ہوا، سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔ بڑے باپ کی بگڑی بیٹی، چھ ماہ بھی ساتھ نہ رہ سکی، ٹشو پیپر کی طرح رضا کو زندگی سے نکال باہر کیا، رضا نے بہت چاہا کسی طرح بات بنی رہے لیکن اتنی زیادہ عرصے کسی کو برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی حتیٰ کے شوہر کے ساتھ بھی وہ ایک open relation ship یا open marriage رکھنا چاہتی تھی، اور رضا

ٹھہرے ایک مشرقی مرد وہ چاہتے تھے کہ بیوی ان کے لیے کھانے پکائے، ان کے لیے سجے سنورے اور ان کے اشاروں پر ناچے..... تو بیگم صاحبہ کیا ناچتیں، رضا صاحب ہی چکرا کر رہ گئے اور ایک نیا بوائے فرینڈ بھی رضا سے برداشت نہ ہوا اور ایک دن سب کچھ ختم ہوگیا۔ رضا کو جھوٹے الزام میں جیل کروادی گئی اور جن بہن، بھائیوں کے لیے رضا نے بنی کی دولت پر دانت گاڑے تھے وہ سب مزے سے کینیڈا میں سیٹل ہوگئے اور رضا کو کئی سالوں بعد deport کردیا گیا..... آج کل محترم کوئی چھوٹی موٹی جاب کررہے ہیں.....'' جب زری نے ثمینہ اور کاشف کو بتایا کہ آج سڑک پر رضا سے اس کا سامنا ہوا تھا، روڈ کے اس پار حیرت سے وہ اسے تک رہا تھا اور زری ایک نظر ڈال کر اپنی شاندار گاڑی میں بیٹھ گئی تھی تو ثمینہ نے اسے رضا کے بارے میں بتایا تو ایک لمحے کے لیے اس کا دل افسردہ ہوا لیکن پھر اسے ایک عجیب سی خوشی بھی محسوس ہوئی۔

''پتا ہے طیبہ میرا دل کیا چاہتا ہے.....'' اسے وہ ہی دن یاد آگیا۔

''میرا دل چاہتا ہے زندگی میں اللہ پاک جب کبھی میرا رضا سے سامنا کروائے تو میں ایک ایسے مقام پر ہوں کہ رضا کو اس بات کا ضرور احساس ہو کہ میں ایک عام سی لڑکی نہیں تھی..... بلکہ انہیں یہ احساس ہو کہ وہ میرے قابل نہیں تھے..... کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ میرا ہاتھ تھام کر محبت کی دہلیز پر لانے والے نے مجھے، کیا کچھ نہ کہا، میں تو اپنی نظروں ہی میں گر گئی۔'' آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں، سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے دل طیبہ کے سامنے کھولا تھا۔

''اللہ پاک اپنے بندوں کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، میری ایک بات یاد رکھنا زری، انسان اپنی نیت کی کھیتی کاٹتا ہے ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ یہ رضا تمہارے سامنے کھڑا ہوگا اور اس لمحے تم ضرور پوچھنا کہ.....''

''کیا سوچنے لگیں زری؟'' ثمینہ نے خاموش بیٹھی اپنی اس چھوٹی بہن سے کہا، جو آسمان کی وسعتوں کو چھونے کے باوجود اس کے چھوٹے سے گھر میں بیٹھی مزے سے چائے پی رہی تھی۔

''ایک نہ ایک دن تو روزِ حساب آتا ہی ہے اور میرے خیال سے روزِ حساب آگیا ہے۔''

اس نے چائے کا مگ سینٹر ٹیبل پر رکھا اور اپنے آپ سے باتیں کرتی باہر نکل گئی اور ثمینہ حیرت سے اس کی پشت کو بس تکتی رہ گئی۔

☆☆☆

''میڈم وہ صاحب آج پھر صبح سے آئے بیٹھے ہیں، جا ہی نہیں رہے۔'' اس کی سکریٹری نے انٹرکام پر بیزار لہجے میں اس سے کہا۔

''اندر بھیج دیجیے.....'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

☆☆☆

نیوی بلیو ساڑی کاندھے پر پڑی میرون ریشم کے کام کی شال، لمبی صراحی دار گردن پر سیاہ چمکدار بالوں کا ڈھلکا ہوا جوڑا، گلے میں جھولتی نازک سی چین اور چین میں جھولتا چھوٹا سا نازک سا لاکٹ..... سفید کلائی میں پہنا نفیس و نازک ڈائمنڈ کا بریسلیٹ..... وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ باوقار انداز میں ہاتھوں کو سینے پر لپیٹے بااعتماد پرمتانت سے بھرپور، باختیار زری.....

ایک لمحے کے لیے اندر آنے والے شخص کے قدم لڑکھڑائے تھے اس نے دیکھ لیا اور اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جی..... مسٹر رضا..... برسوں پہلے، میرے فون پر برہم ہونے والے اور پھر میرے بار، بار رابطہ کرنے پر سم کو ہی بند کردینے والے، آپ کو مجھ سے کیا کام ہے..... آج یہاں کیوں آئے ہیں..... خیریت؟''

''اوہو..... وہ جو اس روز سڑک کنارے آپ نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے آپ کو بتا تو دیا تھا کہ جی میں مسز زرینہ تیمور علی ہوں پھر کون سی کھوج آپ کو بار، بار مجھ جیسی عام سی لڑکی کو جو سو گز کے مکان میں رہتی تھی

اور اب نہیں رہتی اب وہ 10 کنال کے گھر میں رہتی ہے..... اوفوہ میں بھی کہاں سے کہاں نکل گئی، جی مجھ عام سی لڑکی جس کا مستقبل گھر میں جھاڑو دینا اور کچن میں صرف پکوڑے تلنا ہیں اس سے آپ کو ایسا کیا کام ہے جو آپ ہر روز میرے دفتر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔''

''زری.....'' رضا نے کچھ بولنا چاہا۔

''نو، نو مسٹر رضا، آج آپ نہیں بولیں گے، آپ کی مسلسل کالز کے بعد آپ کو یہاں آنے کا میسج میں نے آپ کی سننے کے لیے نہیں کیا تھا، آج آپ کو میری صرف میری بات سننا ہوگی۔''

''زری.....'' رضا نے خشک ہوتی زبان کے ساتھ کہنا چاہا۔

وہ سرد لہجے میں غرائی۔ ''مسٹر معمولی آپ کو اس قدر بے تکلفی سے نام لینے کی ہمت کیسے ہوئی، میں زری نہیں بلکہ مسز زرینہ تیمور علی ہوں، MNA مستقبل کی چیف منسٹر، تیمور انڈسٹریز کی مالک..... آپ جیسے لوگ میری گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں مسٹر رضا..... شاید آپ کو پتا نہیں کہ آپ کو اندر آنے کی اجازت دینے کی کئی وجوہات ہیں.....

''سب سے پہلے یہ کہ میں خود آپ سے ملنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا..... آپ نے میری محبت، میرا خلوص، نفرت کی پوٹلی میں باندھ کر آنچ کی کر، لگا کر میرے منہ پر دے ماری، شکریہ مسٹر رضا کیونکہ اس وجہ سے میں مضبوط ہوئی۔

''آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے احساس دلایا دنیا میں کوئی چیز آخری نہیں ہوتی، مجھے یہ لگن لگی کہ مجھے اپنے آپ کو منوانا ہے۔ اور ہم بے مہرہ، کم عقل لوگ اللہ سے اپنی اوقات کے مطابق مانگتے ہیں، روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں اس کے باوجود جب مالک برحق وہ چیز ہم کو نہیں دیتا تو پتا ہے اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اس نے ہمارے لیے کوئی اپنی پسند کی بہترین چیز رکھی ہوتی ہے، میں آپ جیسے لالچی، خود غرض اور سطحی آدمی کے لیے روئی..... اللہ نے آپ سے مجھے بچایا اور بدلے میں مجھے تیمور جیسا ساتھی ملا، میں خام مال تھی انہوں نے مجھے تراشا، مجھے سنوارا اور آج میں آپ کے سامنے ہوں، پتا ہے لوگ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں..... اور پھر میں انہیں کیا جواب دیتی ہوں۔

''میڈم..... وہ کون سا جذبہ تھا، وہ کون سی تحریک تھی، جس نے آپ کو دن اور رات کی تفریق کے بغیر محنت پر اکسایا اور آج آپ..... لوگوں کے لیے خاص کر خواتین کے لیے ایک مثال بن چکی ہیں۔''

اس نے مسکرا کر سامنے بیٹھی اینکر کو دیکھا، کندھے پر سے ڈھلکتی شال کو درست کیا۔ اور پھر اطمینان بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''میں عام سے خاص تک کا فاصلہ ختم کرنا چاہتی تھی۔''

''زری.....'' زری کو خاموش دیکھ کر رضا نے اسے مخاطب کرنے کی جسارت کی..... رضا کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

''جی رضا صاحب میں عام سے خاص تک کا فاصلہ ختم کرنا چاہتی تھی، میں آپ جیسے سطحی مردوں اور دوسرے لوگوں پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ گھروں میں رہنے والی، پکوڑے تلتی، روٹیاں پکاتی بچوں کو بہلاتی بظاہر عام عورتیں، عام نہیں ہوتیں ہر عورت کے اندر ایک خاص بلکہ بہت خاص عورت چھپی ہوتی ہے۔ میری ماں، میری دادی، میری پڑوسن حتیٰ کہ میرے گھر میں کام کرنے والی عورت بھی اپنے اندر ایک خاص عورت کو چھپائے مردوں کے معاشرے میں سروائیو کرنے کی کوشش کررہی ہوتی ہے۔ بس کوئی چودھری کے ہاتھ لگ جاتی ہے اور کسی کے نصیب میں آپ جیسے پتھر ہوتے ہیں جو خود راستے کا پتھر ہوں، وہ ہیرے کی قدر کیا جانیں۔'' زری نے برسوں سے سینے میں اٹھتے طوفان کو باہر نکالا۔

''زری.....''

''نو زری.....'' زری نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

''میں بہت شرمندہ ہوں، میری زندگی کی

غلطیوں میں سے ایک غلطی تم کو نہ سمجھنا تھی......" رضا کا لہجہ ٹوٹا ہوا سا تھا۔

زری کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آئی۔

"نہیں، وہ آپ کی غلطی نہیں، میری زندگی پر آپ کا بہت بڑا احسان تھا اگر آپ وہ احسان نہ کرتے تو تیمور جیسا نفیس انسان مجھے کیسے ملتا۔ خیر آپ تو فالتو آدمی ہیں لیکن میں بہت بزی ہوں میرا وقت بہت قیمتی ہے، میری آج کافی اپائنٹمنٹ ہیں، میرا انٹر کام بار، بار بج رہا ہے۔ اب آپ جاسکتے ہیں کبھی واپس نہ آنے کے لیے...... ہاں آپ نے جو جاب کے لیے درخواست دیتی ہے میری سیکرٹری کو دے دیں اگر کسی محکمے میں آپ کی ضرورت ہوگی یا آپ کو ایفائڈ کروں گی تو آپ کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی، یاد رکھیے اس وقت میں کسی ایسے شخص سے بات نہیں کررہی جسے میں جانتی تھی بلکہ اپنے دفتر میں کھڑے اپنے حلقے کے ایک شخص کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کررہی ہوں جو میرے سامنے کھڑا ہے۔"

لفظ تھے یا پتھر......

نازک سی زری اندر سے اتنی سخت چٹان ہوگی رضا نے سوچا بھی نہیں تھا...... لفظوں کی سنگباری نے اس کے وجود کو پاش، پاش کردیا تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔

MNA مسز زرینہ تیمور انٹر کام پر بات کررہی تھی۔

"اب آپ جاسکتے ہیں۔" اس نے اپنی بات مکمل کرکے رضا سے کہا۔ "اور ہاں جاتے، جاتے سب سے خاص بات تو سنتے جائیں۔" وہ جو اپنے وجود کو گھسیٹ کر بڑی مشکل سے مڑا تھا...... اپنی جگہ پر پتھر بن گیا۔

"یاد ہے ایک رات میں آپ کو بار، بار فون کررہی تھی اور آپ میرا فون مسلسل کاٹ رہے تھے، اور پھر جب آپ نے ریسیو کیا تھا تو میری بات سنے بغیر مجھے اپنے ظرف کے مطابق بے نقط سنائی تھیں اور میری بات نہیں سنی تھی۔ پتا ہے اس رات میں کیا کہنے کے لیے فون کررہی تھی۔" زری بات کرتے، کرتے ایک لمحے کے لیے رکی۔

"کیا؟" رضا کے لب خاموش تھے لیکن اس کا دل پوچھ رہا تھا۔

"میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔ اب ہم عام سے خاص تک کا سفر طے کرنے کے بعد ہی ملیں گے...... لیجیے اس سم کو اس ڈسٹ بن میں ڈال دیجیے گا جہاں آپ نے اپنی سم ڈالی تھی تاکہ میں آئندہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکوں۔" اس نے فون سے سم نکال کر رضا کی طرف حقارت سے اچھالی۔ اسے لگا اس کا وجود ریزہ، ریزہ ہوکر جیسے فضا میں بکھر گیا ہو، وہ کیا سوچ کر آیا تھا لیکن زری نے ثابت کردیا کہ وہ اس کے لائق نہیں تھا۔ وہ بہت خاص تھی۔

عام سے خاص تک کا سفر دوسرے کی پیسے کی بنیاد پر نہیں بلکہ کٹھن خطوط پر چل کر طے کیا جاتا ہے، اسے پتا چل گیا تھا، باہر مسلسل بارش ہورہی تھی اور وہ کسی انجانی سمت میں سر جھکائے پیدل چلے چلا جارہا تھا۔ بارش کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے مسلسل بہتے آنسو کسی کو نظر نہیں آرہے تھے...... وہ رورہا تھا، کیوں؟ اسے نہیں پتا تھا، اس کو عمر بھر شرمندگی کا رونا، رونا تھا کہ وہ جانتا تھا۔

"کیا ہوا مسٹر اندھے ہوگیا؟" وہ جو سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ گاڑی سے سر نکالے، چیختے ہوئے اس کی آدمی کی آواز پر چونک اٹھا تھا۔

"میں نے پوچھا اندھے ہوگیا؟" گاڑی والا پھر چلایا۔

"نہیں...... اندھا تھا۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا...... اور پھر وہ روڈ پر جمع ہوتے لوگوں کی پروا کیے بغیر پھوٹ، پھوٹ کر رودیا۔

اب اسے ساری زندگی ندامت کے آنسو بہانے تھے شاید اس لیے نہیں کہ اس نے زری کو کھودیا تھا بلکہ اس لیے کہ زری کے صبر نے جیتی زندگی اسے اللہ کی گرفت میں دے دیا تھا اس کی رسی کھنچتی جارہی تھی۔

اور جب اللہ پاک رسی کھینچتا ہے تو بحیثیت مسلمان ہم سب جانتے ہیں کیا ہوتا ہے، مجھے بتانے کی ضرورت تو نہیں۔



ایفائے عہد...... وصف الٰہی

سب تعریف اس اللہ تعالیٰ کے لیے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے...... تو ہی وہ اللہ ہے کہ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں جو بخشنے والا اور انتہائی بخشنے والا اور انتہائی عظمت والا، بڑا اور انتہائی بڑا ہے، تو ہی وہ رب ہے جس نے بغیر مواد کے تمام چیزوں کو پیدا کیا اور بغیر کسی نمونے اور مثال کے صورتوں کی نقش آرائی کی اور کائنات عالم میں ہر چیز کی تدبیر وکارسازی کی۔ تو وہ عظیم ہستی ہے کہ تیری ذات کو سمجھنے سے عقلیں عاجز ہیں...... اے میرے رب...... تو ہر عیب سے پاک ہے تو بے حد بڑا ہے، ہم تیرے لائق، تیری حمد وثنا نہیں کرسکتے...... اے میرے رب! تو رحمت نازل فرما نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان کی آل پر...... درود وسلام ہو ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر......

آج ہم جس موضوع پر بات کریں گے وہ ہے...... "ایفائے عہد" کسی سے قول واقرار کرکے اسے پورا کرنے کو ایفائے عہد کہتے ہیں...... پابندیٔ عہد میں زبان سے اقرار کرکے دل سے اسے پورا کرنے کی نیت رکھنا ضروری ہے...... لہٰذا جس سے عہد کیا جائے اس پر عمل کرنا ہی درحقیقت عہد کی پابندی ہے۔

ایفائے عہد کی صفت جس عظیم ہستی میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے وہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ ہے...... اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے بندوں سے بہت وعدے کیے ہیں...... مثلاً "اعمال قبول کیے جائیں گے، نیکی کی جزا دی جائے گی جنت عطا ہوگی...... دنیا میں سچ بولنے کے لیے خواہ کتنے ہی مصائب برداشت کیے ہوں ان کا اجر عطا کیا جائے گا۔ شفاعت نصیب ہوگی۔" وغیرہ، وغیرہ، قرآن کریم میں باری تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر کیا گیا ہے۔

"اللہ تعالیٰ وعدے کے خلاف نہیں کرتا......" (سورۂ زمر)

"اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے۔" (سورۂ توبہ)

اللہ تو بہ کے بعد یہ صفت انسانوں میں سب سے زیادہ ان مقدس ہستیوں میں موجود رہی جنہیں نسلِ انسانی کی ہدایت وقتاً فوقتاً ذمے داریاں سونپی گئیں، جن میں سب سے زیادہ افضل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔

عہد کی اہم صورتیں توجہ طلب ہیں۔

1۔ سب سے زیادہ اہم وہ عہد ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان روزِ ازل ہوا...... جب اللہ تعالیٰ نے سب کی ارواح سے اپنے رب ہونے کے بارے میں دریافت کیا اور سب نے اس کی ربوبیت کا اقرار کیا...... اسی کو "عہد الست" کہا جاتا ہے۔

2۔ بنیادی طور پر اجتماعی امور میں وہ معاہدات جو دو سلطنتوں اور دو فریقوں کے درمیان کیے جائیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہمارے سامنے ہے کہ آپ نے غیر مسلموں سے جو معاہدات کیے ان کا پورا پاس کیا۔

3۔ روزمرہ زندگی میں فرد کا دوسرے افراد کے ساتھ لین دین، تعلقات وغیرہ کا قول وقرار بھی عہد میں آتا ہے۔

قرآن کریم میں اس کا حکم آیا ہے...... "اے ایمان والو...... اپنے اقراروں کو پورا کرو......" (سورۂ مائدہ)

4۔ معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے سے میل جول کا وہی انداز اختیار کرنا جس کی توقع ایک دوسرے سے ملنے جلنے سے ہوجاتی ہے...... وہ بھی عہد کی ایک باریک شکل ہے...... ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ام المومنین...... حضرت خدیجہؓ سے زیادہ مجھے کسی خاتون پر رشک نہیں آیا۔ ان کا انتقال میرے نکاح سے تین سال قبل ہوچکا تھا لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ان کا تذکرہ فرماتے تھے اور جب بکری ذبح کرتے تو گوشت ان کی سہیلیوں کو بھیجا کرتے ...... یعنی جو طرز عمل حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں تھا اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم رکھا۔

عہد کی پابندی مسلمان کی امتیازی خصوصیت ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے جنبش کرے تو کر جائے مگر ایک مسلمان اپنے قول و قرار سے نہ پھرے، اپنے کیے گئے وعدے کی خلاف ورزی نہ کرے اس کے سامنے ہر وقت اپنے خالق کا یہ فرمان رہے کہ...... ''اور عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ قیامت کے دن عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔'' (سورۂ بنی اسرائیل)

اسلام میں ایفائے عہد کی اہمیت بے پناہ ہے...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وعدہ پورا کرنے کی تاکید فرمائی ہے...... بلکہ یہاں تک فرمایا...... کہ ''اس کا دین نہیں جس میں وعدے کی پابندی نہیں'' اس لیے ہر مسلمان کو وعدے کا پکا اور سچا ہونا چاہیے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کرو اور نہ اس سے مذاق کرو اور نہ اس سے ایسا وعدہ کرو جو پورا نہ کر سکو......'' (ترمذی شریف)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا......

''جس میں تین باتیں ہوں وہ سمجھو کہ منافق ہے پہلی بات یہ ہے کہ جھوٹی بات کہے...... دوسرا وعدے کو پورا نہ کرے...... تیسرے یہ کہ امانت میں خیانت کرے......'' (مسلم شریف)

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''وعدہ ایک طرح کا قرض ہے، کم بختی ہے اس کی جو وعدہ کرے پھر اس وعدے کے خلاف کرے......''

رسول خدا نے فرمایا...... ''کہ جس قوم میں عہد شکنی کی عادت پھیل جاتی ہے اس میں خوں ریزی بڑھ جاتی ہے اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے اس میں اموات کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔''

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''وعدہ قرض کی شکل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے پیغمبر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یوں تعریف فرمائی ہے کہ وہ وعدے کے صادق تھے۔''

حضرت شقیق بلخیؒ کا قول ہے کہ اگر تم کسی مرد خدا کو پہچاننا چاہتے ہو تو دیکھو کہ وہ حق تعالیٰ کے وعدے پر زیادہ بے خوف ہے یا مخلوق کے وعدوں پر زیادہ بھروسا رکھتا ہے۔''

تو جو وعدہ اللہ کے ساتھ کیا جائے وہ بہت مقدس حیثیت رکھتا ہے اور اسے ہر حال میں پورا کرنا چاہیے...... راہ معرفت میں جو بندہ قدم رکھتا ہے اور اللہ کے حضور سچی توبہ کرتا ہے تو یہ توبہ ایک قسم کا وعدہ ہی ہے (یعنی اب یہ برا فعل انجام نہیں دوں گا) اور پھر اللہ کے بندے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے اپنے اس وعدے کو ساری عمر نبھاتے ہیں اور اللہ کی معرفت کو پا لیتے ہیں۔

ہر نبی اور پیغمبر کا یہ وصف ہوتا ہے کہ وہ وعدے کا پکا ہوتا ہے کیونکہ اسی وصف کی بنا پر نبی کی نبوت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ جو بات کہتا ہے سچی ہے...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی کردار اور سیرت طیبہ میں یہ وصف بہت عروج پر ہے۔ آپ پابندی عہد میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے، آپ نے جب بھی کسی سے وعدہ کیا پورا کیا......

حضرت عبداللہ بن ابی الحمساؓ فرماتے ہیں...... میں نے بعثت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی خرید کا معاملہ کیا اس کی کچھ رقم میرے ذمے باقی رہ گئی، میں نے آپ سے وعدہ کیا میں باقی رقم اسی جگہ لے کر آتا ہوں چنانچہ میں چلا گیا اور اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین راتیں گزرنے کے بعد مجھے وعدہ یاد آیا تو بقیہ رقم لے کر اس جگہ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے سے وہاں موجود ہیں...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی ناراضی کا اظہار نہ فرمایا...... بس فرمایا...... ''اے نوجوان! بے شک تو نے مجھے مشقت میں ڈال دیا، میں تین دن سے تیرے انتظار میں بیٹھا ہوں......''

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو مسلمان بھاگ کر مدینہ جائے گا وہ واپس کیے جانے کا پابند ہوگا...... لیکن اگر کوئی بھاگ کر مکہ پہنچ جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا...... ابھی یہ معاہدہ زیر تکمیل ہی تھا کہ حضرت ابوجندلؓ پابہ زنجیر زخمی حالت میں بھاگ کر بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچ گئے...... ان کی یہ حالت دیکھ کر مسلمان آبدیدہ ہوگئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''اے ابو جندلؓ! صبر کرو اور ثواب کی امید رکھو...... ہم بد عہدی نہیں کر سکتے...... اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے خلاصی کی کوئی سبیل پیدا کر دے گا......'' اور یوں دشمن حضرت ابوجندلؓ کو اپنے ساتھ واپس لے گئے......

☆☆☆

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دربار میں اکابر صحابہؓ موجود تھے اور مختلف امور پر گفتگو جاری تھی کہ اس دوران دو آدمی ایک خوب صورت نوجوان کو پکڑ کر اندر داخل ہوئے اور درد انگیز لہجے میں بولے...... ''یا امیر المومنین! اس ظالم نے ہمارے بوڑھے باپ کو قتل کر دیا ہے اور ہم بحکم شریعت اس سے قصاص لینا چاہتے ہیں۔''

ان کی اس بات پر تمام مجلس میں خاموشی طاری ہوگئی۔

حضرت عمر فاروقؓ نے ملزم کو مخاطب کر کے فرمایا...... ''ان کا دعویٰ تم نے سن لیا، اس کے جواب میں تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو......'' اس نوجوان نے ادب سے کہا...... ''یا امیر المومنین...... مدعی سچ کہتے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ میرے ہاتھ سے ان کا بوڑھا باپ مر گیا...... واقعہ یوں ہے کہ میرا اونٹ ان کے باغ میں چلا گیا...... ان کے والد نے میرے اونٹ کو اس طرح تاک کر پتھر مارا کہ اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی...... اور میرا اونٹ شدت درد سے بلبلا اٹھا اور سر پٹخنے لگا اونٹ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے طیش آ گیا اور میں نے بس ایک پتھر اٹھا کر بوڑھے کے سر پر دے مارا جس سے وہ مر گئے......'' حاضرین نے ملزم کا جواب غور سے سنا وہ سب کے سامنے اعتراف جرم کر چکا تھا...... لہٰذا حضرت عمر فاروقؓ نے اس کے اعتراف جرم پر یہ فیصلہ دیا کہ بحکم شریعت قصاص میں اس نوجوان کو قتل کر دیا جائے...... پھر آپؓ نے قاتل کو مخاطب کر کے فرمایا...... ''اے نوجوان......! تمہیں اگر کچھ کہنا ہے تو کہہ ڈالو...... تو نوجوان نے کہا۔ ''مجھے شریعت کے تحت امیر المومنینؓ کا فیصلہ قبول ہے لیکن ایک ضروری درخواست ہے وہ یہ کہ میرا ایک نابالغ بھائی ہے والد مرحوم نے اس کے لیے مجھے کچھ سونا دیا تھا کہ جب وہ بڑا ہو جائے تو اس کے حوالے کر دوں، میں نے وہ سونا حفاظت سے ایک مقام پر دبا دیا ہے، اس کے متعلق میرے سوا کسی کو علم نہیں...... مجھے اس بات سے ڈر ہے کہ اگر میں یہ امانت اپنے بھائی کو نہ پہنچا سکا تو قیامت کے دن اس کا ذمے دار ٹھہروں گا لہٰذا میں درخواست کرتا ہوں کہ میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے مجھے صرف تین روز کی مہلت دی جائے تاکہ میں اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو کر قصاص کے لیے حاضر ہو جاؤں......'' حضرت عمر فاروقؓ نے قدرے توقف فرمایا...... پھر بولے ''اگر تم کوئی ضامن دے سکتے ہو تو تمہیں مہلت دی جا سکتی ہے۔'' نوجوان نے امید بھری نظروں سے تمام حاضرین مجلس کی طرف دیکھا اور حضرت ابوذر غفاریؓ سے پوچھا۔ ''کیا آپ اس قاتل کی ضمانت دیتے ہیں؟'' انہوں نے کہا...... ''ہاں! میں اس کی ضمانت دیتا ہوں کہ یہ شخص تیسرے دن اسی وقت یہاں حاضر ہو جائے گا......'' حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ کی ضمانت پر فاروق اعظم مطمئن ہو گئے اور دونوں مدعی بھی رضامند ہو گئے اور قاتل کو تین روز کی مدت دے کر چھوڑ دیا گیا...... آج تیسرا دن تھا دربار خلافت میں صحابہ کرام جمع ہو چکے تھے، لوگ بھی کافی آ چکے تھے اور اس دوران دونوں مدعی بھی آ گئے...... سب لوگ نوجوان قاتل کی آمد کے منتظر تھے...... لیکن مجرم کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جوں، جوں وقت گزر رہا تھا انتظار کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ قاتل مہلت لے کر جس طرف گیا تھا تمام لوگوں کی نگاہیں بار، بار اسی طرف اٹھ رہی تھیں...... وقت قریب آ چکا تھا مگر نوجوان قاتل نہ آیا تھا۔

تمام حاضرین کو ایک ہی تشویش لاحق تھی کہ اگر وہ مقررہ وقت پر نہ آیا تو اس کے ضامن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی قصاص میں قتل کر دیے جائیں گے۔ وقت آن پہنچا سورج غروب ہونے کو تھا دونوں مدعی بے اختیار پکار اٹھے۔ ''اے ابوذر غفاریؓ! ہمارا مجرم کہاں ہے؟'' آپؓ نے کمال استقلال سے فرمایا...... ''تم کچھ فکر نہ کرو اگر مجرم مغرب تک نہ آیا تو میں قصاص کے لیے حاضر ہوں......'' یہ بات سنتے ہی کچھ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے...... اسی وقت حضرت

[illegible] اگر قاتل نہ آیا تو اس کے ضامن ابوذر غفاریؓ سے قصاص لیا جائے گا......"امیر المومنین! کا یہ اعلان سن کر سب بے قرار ہو گئے کچھ اکابر صحابہ نے مدعیوں سے کہا کہ خوں بہا قبول کر لیں۔ لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوئے اور کہا خون کا بدلہ خون...... اتنے میں دور سے غبار اڑتا ہوا نظر آیا سب کی نگاہیں اس طرف لگ گئیں کیا ایک وہ نوجوان گھوڑے پر سوار سرپٹ دوڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ عجلت سے اترا اور ہانپتا ہوا فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہو گیا...... اس نے بلند آواز سے کہا "السلام علیکم......!" پھر نوجوان نے عرض کی۔

"امیر المومنین......! میں نے بھائی کو اس کے ماموں کے سپرد کر دیا ہے اور اس کی امانت بھی ان کے سپرد کر دی ہے۔ اب میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا ہوں اور اب قصاص کے لیے حاضر ہوں، آپ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی تعمیل میں دیر نہ فرمائیں۔ ہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ سفر دور دراز کا تھا اور دشوار گزار بھی اس لیے مجھے یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی...... اس لیے میں حاضرین سے اور آپ سے معافی کا خواستگار ہوں......" تب حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا...... "یا امیر المومنین! بخدا مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ یہ کون شخص ہے کہاں کا باشندہ ہے؟ مگر جب اس نے بھری مجلس میں مجھ پر اعتبار کیا اور مجھے ضامن بنا لیا تو میں نے اس کے اعتماد کو ٹھکرا دینا خلاف مروت سمجھا میں نے بھی اس پر اعتماد کیا اور اس کی ضمانت دے دی۔"

قاتل نوجوان کے واپس آ جانے سے سب کے دل مسرور تھے...... اس کی صاف گوئی اور وعدہ وفائی کو دیکھ کر تمام حاضرین اسے داد تحسین دے رہے تھے یہاں تک کہ جوش مسرت میں دونوں مدعی بھی پکار اٹھے......"امیر المومنین......! ہم نے اپنے باپ کا خون معاف کیا۔ ہم قصاص کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے......" مدعیوں کے اس اعلان سے مسلمانوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے سب نے مل کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا...... حضرت عمر فاروقؓ کا چہرۂ مبارک بھی خوشی سے دمک رہا تھا...... آپؓ نے فرمایا...... "مدعی نوجوانوں......! ہم نے تمہارے باپ کا خوں بہا بیت المال سے ادا کر دینے کا حکم دیا ہے...... تاکہ انہیں اس احسان کا اجر بھی ملے...... مگر انہوں نے حق لینے سے انکار کر دیا۔

☆☆☆

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کسی دشمن خدا سے لڑ رہے تھے۔ اسی دوران نماز کا وقت آ گیا...... حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے لڑتے، لڑتے اس بے دین شخص سے کہا۔ "اگر تو مجھے اجازت دے تو میں نماز پڑھ لوں۔" اس نے جنگ موقوف کی اور آپ کو نماز کی اجازت دے دی۔ آپ نے نماز پڑھی اور پھر اس سے لڑنے میں مصروف ہو گئے...... تھوڑی دیر میں اس کافر شخص نے بھی آپؒ سے اجازت مانگی اور کہا کہ میں بھی اپنے مذہب کے مطابق عبادت کروں گا پھر اس سے فارغ ہو کر لڑوں گا...... آپؒ نے اجازت دے دی۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق ایک طرف جا بیٹھا اور عبادت میں مصروف ہو گیا...... آپؒ نے چاہا کہ اسے غافل پا کر قتل کر ڈالیں...... کہ اسی وقت ایک ندائے غیبی بلند ہوئی جس میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو یہ سنایا گیا۔ "خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوگو! جب تم کسی سے کوئی عہد کرو تو اسے پورا کرو کیونکہ قیامت کے روز تمہارے عہد و پیمان ضرور پوچھے جائیں گے۔" (سورۂ بنی اسرائیل) یہ ندائے غیبی سن کر آپ اس قدر روئے کہ آپ کی ہچکی بندھ گئی...... وہ شخص جب فارغ ہو کر آیا تو آپ کو روتا دیکھ کر سخت حیران ہوا اور کہا۔ "آپ روتے کیوں ہو؟" آپؒ نے اسے ندائے غیبی کا تمام ماجرا بیان کیا جس میں غیب سے اس بے دین شخص کی رعایت کی گئی تھی۔ یہ بات سن کر اس شخص نے کہا۔ "اے ابن مبارکؒ تمہارا خدا ایسا رحیم و کریم ہے کہ وہ اپنے دشمن کے لیے بھی سفارش کرتا ہے تو میں اس خدا پر ضرور ایمان لاؤں گا...... اور آج سے اس کی عبادت کیا کروں گا......" اسی وقت وہ شخص مسلمان ہو گیا...... سبحان اللہ......!

☆☆☆

جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ قلیل تھی...... اور مسلمانوں کو ایک، ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی...... حضرت حذیفہؓ اور حضرت ابوحسیلؓ یہ دو صحابی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم مکہ سے آ رہے ہیں راستے میں کفار نے ہم کو گرفتار کر لیا تھا اور اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم لڑائی میں آپ کا ساتھ نہیں دیں گے لیکن یہ مجبوری کا عہد تھا ہم ضرور کافروں کے ساتھ لڑیں گے......" حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا......"ہرگز نہیں تم اپنا وعدہ پورا کرو اور لڑائی کے میدان سے واپس چلے جاؤ ہم (مسلمان) ہر حال میں وعدہ پورا کریں گے ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔"

حضرت ابورافعؓ ایک قبطی غلام تھے جو مکہ میں رہتے تھے وہ فرماتے ہیں کہ کفار قریش نے مجھے سفیر بنا کر مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جب میں نے آپ کو دیکھا تو میرے دل میں ایمان کی صداقت پیدا ہو گئی اور میں نے عرض کی۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے اللہ کی قسم! میں کبھی ان (کفار مکہ) کے پاس لوٹ کر نہیں جاؤں گا...... بس اب میں اسلام قبول کر کے یہیں رہوں گا...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... میں عہد شکنی نہیں کرتا اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس رکھتا ہوں، تم اب واپس لوٹ جاؤ اگر وہاں بھی تمہارے دل میں صداقت اسلام قائم رہی تو واپس آ جانا۔" حضرت ابورافعؓ کا کہنا ہے کہ میں نے فوراً حضور کی تجویز مان لی اور آپ کے ارشاد کے مطابق مدینہ سے مکہ واپس لوٹ آیا...... اور پھر دوبارہ مکہ سے مدینہ پہنچا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت حاضر ہوا اور ایمان لے آیا اور آپ کا خادم بن گیا......

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مقدسہ پر نظر ڈالیں تو ایفائے عہد آپ کی ایک خاص خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے۔ چنانچہ قیصر نے اپنے دربار میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ "کیا کبھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدعہدی بھی کی ہے؟" ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا کہ نہیں......

تو ایفائے عہد زبان اور عمل کی یک رنگ سچائی کا نام ہے...... اور یہ انسانیت کے مخصوص فرائض میں سے بہت بڑا فرض ہے۔ اور اس سے معاشرت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے، کوئی بھی شخص خواہ کسی بھی طبقہ و پیشہ سے تعلق رکھتا ہو اگر وہ اپنے عہد اور ارادے کا پاسدار ہے تو اس پر سب اعتماد کرتے ہیں اور ہر معاملے میں اس کی بات کا وزن ہوتا ہے...... اور معاشرے کا قابل اعتماد فرد سمجھا جاتا ہے۔

آج اگر ہم اپنے معاشرے پر نگاہ ڈالیں تو جہاں اور بہت سے خرابیاں اور برائیاں ہمارے اندر جنم لے چکی ہیں ان میں وعدہ کی ہر درجہ ادائگی نہیں پائی جاتی بلکہ افسوس صد افسوس یہ کہا جاتا ہے کہ "وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے......" کاش آقا کے احوال کی روشنی میں اس خطرناک جملے پر غور کریں کہ ہم کیا کر رہے ہیں کیا کہہ رہے ہیں...... ہم اخلاقی طور پر کن پستیوں کی طرف جا رہے ہیں؟ اچھے اوصاف اپنانا ہر مسلمان کا اولین فرض ہے۔ خلوت ہو یا جلوت...... گھر ہو یا بازار...... امن ہو یا جنگ...... غربت ہو یا امارت ہر مسلمان کے لیے اسلام نے اخلاقی ضابطے بنا دیے ہیں اور اچھا و پکا مسلمان وہی ہے جو ان پر عمل پیرا ہو۔

تو اللہ کے پسندیدہ بندے ہمیشہ سچے، محسن متواضع، امین وعدے کے پکے، صابر اور عفو و درگزر سے کام لینے والے ہوتے ہیں۔

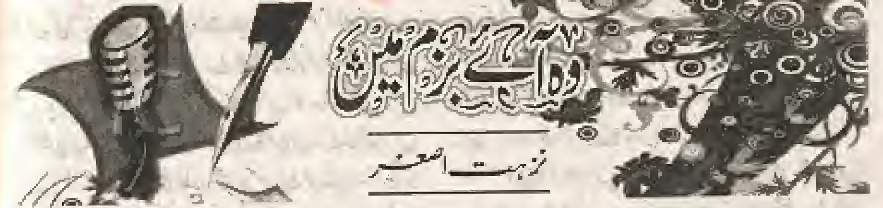
اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں ان اخلاق صالح اپنانے کی توفیق عطا فرمائے...... امین، الٰہی آمین......

☆☆☆

حرف آخر: اللہ تعالیٰ کی عظیم بارگاہ میں ڈھیر ساری احساس شرمندگی لیے اس سے معافی کی التجا کرتی ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی کوئی کوتاہی دانستہ یا نادانستہ ہو گئی ہو تو وہ میرا پیارا رب میری ان غلطیوں کو معاف فرما دے کہ وہ بہت درگزر کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔

اور میں ان تمام قابل احترام ہستیوں کی شکر گزار ہوں کہ جن کے کتب سے میں نے یہ مضامین منتخب کیے...... اور اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے...... اور ہمیں اس کا فیض عطا فرمائے...... آمین۔

☆☆☆





دلچسپ بیانیے کے ساتھ کرداروں کی نفسیات سے روشناس کراتی پُروقار، متانت سے بھرپور خوش مزاج رائٹر......

سکینہ فرخ سے خوشگوار ملاقات

پیارے، پیارے باذوق پاکیزہ قارئین کی خدمت میں تسلیمات! آپ کی اس بزم میں اس دفعہ تھوڑا وقفہ آگیا۔ جبھی آپ سب ہی بے چین ہوگئے اور رائٹرز کے انٹرویو کی فرمائشیں مسلسل آتی گئیں...... ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات بھی اس بزم میں رونق افروز ہوں سو اسی لیے یہ وقتی دوری آئی۔ کچھ رائٹرز بھی مصروف رہیں اور کچھ ہم بھی خیر آج ہماری ایک بہت پیاری نفیس، نرم خو اور

سادہ مزاج قلم کار ہمارے ساتھ ہیں جو کم کم لکھتی ہیں مگر جب بھی لکھتی ہیں بہت رواں، مؤثر اور قابلِ تعریف لکھتی ہیں...... ان کی شخصیت میں ایک وقار اور اندازِ بیان میں بہت گداز ہے۔ ہمیں ان سے فون پر بھی اور روبرو گفتگو کرنا بہت اچھا لگتا ہے تو عزیز ساتھیو! آپ بھی ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوں۔ ارے نام تو بتاتی چلوں جی ہاں سکینہ فرخ...... اپنے نام کے ساتھ اپنی گفتگو سے بھی قارئینِ پاکیزہ کو کیسا سکون پہنچا رہی ہیں یہ تو اب ان کی باتیں پڑھ کر ہی اندازہ ہوگا ناں......!

☆☆☆

پاکیزہ ✧...... جی سکینہ آپ کا بہت شکریہ...... ہماری بزم کے لیے آپ نے وقت نکالا...... آپ کیسا محسوس کررہی ہیں؟

سکینہ فرخ ✧...... آپ کا بے حد شکریہ نزہت کہ آپ نے اس قدر محبت سے یاد کیا۔ پاکیزہ سے تعلق سلور جوبلی کی شاہراہ طے کرچکا ہے جبکہ لکھنے کے سلسلے کو بھی دہائی مکمل ہوچکی ہے تو آج آپ کی بزم میں شرکت کرنا بے حد اچھا لگ رہا ہے۔ (ماشاءاللہ)

پاکیزہ ✧...... یہ بتائیں گزشتہ دو تین سالوں سے ایسی کیا مصروفیات آگئیں کہ آپ نے قلم، کاغذ ایک طرف رکھ دیا؟

سکینہ فرخ ✧...... میں بنیادی طور پر ایک گھریلو خاتون ہوں گھر، بچے، شوہر یہی میری مصروفیت ہے، بس جب اس فرنٹ پر کسی نہ کسی حوالے سے کام بڑھ جاتے ہیں تو میری مصروفیت بھی بڑھ جاتی ہے اور دل سے نہ چاہنے کے باوجود کاغذ و قلم سے تعلق عارضی طور پر منقطع ہوجاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... اچھا بات شروع کرتے ہیں آپ کے اس ہنر، شوق اور صلاحیت کے آغاز کی تو کب پہلی کہانی منظرِ عام پر آئی؟

سکینہ فرخ ✧...... میری پہلی کہانی 2001ء یا 2002ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ الحمدللہ کافی پسند بھی کی گئی تھی۔

پاکیزہ ✧...... یعنی بچپن سے شوق تھا یا کسی سے متاثر ہوئیں؟

سکینہ فرخ ✧...... بچپن سے پڑھنے کا بے حد شوق تھا...... میرا تعلیمی ریکارڈ شروع سے بہت اچھا رہا اس لیے ہر وقت رسائل اور کتابیں پڑھتے رہنے پر زیادہ روک ٹوک نہیں ہوئی۔ لکھنے کا سفر ذرا دیر میں شروع ہوا البتہ کہانیاں تب بھی دل و دماغ میں گردش کرتی رہتی تھیں بس نوکِ قلم پر آنہیں پاتی تھیں۔ (تو گویا فطرت میں یہ ہنر چھپا ہوا تھا)

پاکیزہ ✧...... آپ کی کہانیاں بہت رواں اندازِ بیان لیے ہوتی ہیں، ایسا انداز قدرتی ہے یا



اختیاری......؟

سکینہ فرخ ❖......شاید میں بولتی زیادہ ہوں اسی لیے الفاظ کی فراوانی ہے، لکھتے ہوئے بعض اوقات تو واقعات اور مکالمات اس تیزی سے ذہن میں آتے ہیں کہ ان کو تحریر میں لانا مشکل ہو جاتا ہے، (اللہ زورِ قلم وبیان اور زیادہ کرے)

پاکیزہ ❖......ماہناموں اور ڈائجسٹوں میں چھپنے والی کہانیاں محبت 'شادی' رشتے داریاں بیان کرتی ہیں مگر آپ نے اس سب کے ساتھ ایک خاص نفسیاتی عنصر بھی دیا...... رشتوں کے احساسات کی ترجمانی کی۔ کیا یہ بھی فطری اندازِ بیاں ہے؟

سکینہ فرخ ❖......بزہت میں فطرتاً انتہائی حساس انسان ہوں، گو کہ زیادہ حساس ہونا ہرگز اچھی بات نہیں...... میں وہ باتیں بھی بہت شدت سے محسوس کرتی ہوں، دوسرے جس کی پروا بھی نہیں کرتے، میں لوگوں کو، ان کے رویّوں کو بہت گہرائی میں محسوس کرتی ہوں شاید اسی لیے انسانی نفسیات کو سمجھنا مجھے مشکل نہیں لگتا...... میں جب بھی کوئی کہانی تحریر کرتی ہوں تو اس کے ہر کردار کی نفسیات اور احساسات کو خود پر طاری کرتی ہوں شاید ایسا کرنے سے ہر کردار کی تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ (یہی تو ایک ماہر قلم کار کی پہچان ہے)

پاکیزہ ❖......اچھا لکھنے کے لیے اچھا مطالعہ ضروری ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

سکینہ فرخ ❖......جی بے شک...... مطالعے کے بغیر کچھ بھی تحریر کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ (جس طرح اداکاری بھی کردار کو خود پر طاری کیے بغیر

کامیاب نہیں ہوتی ہے ناں سکینہ......!)

پاکیزہ ❖......آپ کے ادبی کلیکشن میں کون، کون سے نمایاں نام شامل ہیں...... ملکی اور غیر ملکی مصنفین کے حوالے سے بھی بتائیں؟

سکینہ فرخ ❖......میرے ادبی کلیکشن میں اشفاق احمد، ممتاز مفتی، ابن صفی کے نام نمایاں ہیں...... غیر ملکی ادب میں مجھے سب سے زیادہ متاثر او ہنری نے کیا...... او ہنری ایک باکمال شارٹ اسٹوری رائٹر تھے، ان کی مختصر کہانیاں اور اسلوب مجھے بے حد پسند ہیں۔

پاکیزہ ❖......عموماً لڑکیاں شادی کے بعد اپنے اس شوق کو ایک طرف رکھ دیتی ہیں کچھ تو چھپا ہی لیتی ہیں جبکہ آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا...... کیوں؟

سکینہ فرخ ❖......مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے لکھنا ہی شادی کے بعد شروع کیا...... اس وقت جب میرا سب سے چھوٹا بیٹا بھی اسکول جانا شروع ہو چکا تھا۔ (اچھا، پھر تو یہ آپ کے شوہر صاحب کی بھی تعریف بنتی ہے)

پاکیزہ ❖......کچھ اپنی پسند ناپسند بھی بتائیں؟
پسندیدہ لباس، موسم، ذائقہ، خوشبو، جگہ، شعر، یادگار



سکینہ فرخ کی (بیٹی) ماہین اور (داماد) دانیال

جملہ، رشتہ، وقت، کتاب، شخصیت، پھول؟

سکینہ فرخ ❖......شلوار قمیص، برسات، بارش کی سوندھی سوندھی خوشبو اور رات کی رانی کی خوشبو، ہوم سوئیٹ ہوم۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جو رشتہ رب العالمین سے ہے، صبح کاذب، قرآن پاک، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، گلاب۔

پاکیزہ ❖......آپ کے بچوں میں یہ صلاحیت کس حد تک آئی؟

سکینہ فرخ ❖......میری بیٹی کو نہ صرف مطالعے کا شوق ہے بلکہ اس کے اندر لکھنے کی بھی خداداد صلاحیت موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس میدان میں ضرور کامیابیاں حاصل کرے گی۔ (انشاء اللہ)

پاکیزہ ❖......چلیں پہلے اپنی فیملی کا مختصر تعارف کرا دیں؟

سکینہ فرخ ❖......میری فیملی کا مختصر تعارف یہی ہے کہ ماشاء اللہ ایک ساتھ نبھانے والا ساتھی اور چار پیارے، پیارے بچے...... بیٹی شادی شدہ ہے الحمدللہ...... یوں...... داماد اور نواسی بھی مل گئیں۔ (ماشاء اللہ)

پاکیزہ ❖......آج کی عورت کے حوالے سے بات کروں تو آپ کیا کہیں گی آج کی خواتین خصوصاً ہمارے معاشرے کی کس حد تک باشعور اور ہوش مند ہیں؟

سکینہ فرخ ❖......آج کی عورت خصوصاً ہمارے معاشرے سے تعلق رکھنے والی، یقیناً باشعور اور سمجھدار ہے۔ گھریلو خواتین ہوں یا ملازمت پیشہ یا کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں فی زمانہ مردوں کی نسبت زیادہ ذمے داریاں نبھا رہی ہیں۔ گھر کے اندر اور باہر کے معاملات دیکھ رہی ہیں، اپنے بچوں کو سنبھال رہی ہیں۔ تعلیمی میدان میں بھی لڑکیاں پہلے کے مقابلے میں زیادہ تعداد اور استعداد کے ساتھ موجود ہیں اور اچھی کارکردگی دکھا رہی ہیں۔ (جی یہ تو بالکل درست بات ہے آخر آبادی کا اکیاون فیصد بھی تو ہیں)



سکینہ فرخ اپنی پیاری نواسی زینب کے ہمراہ

پاکیزہ ❖......آج کے انٹرنیٹ کے دور میں جوان ہوتے بچے بچیوں کی ماؤں کی کیا ذمے داری ہے۔ پانچ پوائنٹس میں بتائیں؟

سکینہ فرخ ❖......انٹرنیٹ تو اب زندگی میں ہوا، پانی اور غذا کی مثل شامل ہو چکا ہے۔ اور اب شاید اس کو زندگی سے الگ کرنا سب کے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ اس کے فوائد سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر جس طرح ہر چیز کے اچھے برے دونوں پہلو ہوتے ہیں اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے، مجبور اور ذمے دار لوگ تو پھر

اس کا درست استعمال کر لیتے ہیں مگر خطرے کی گھنٹی اس وقت بجنا شروع ہوتی ہے جب ناسمجھ اور کم عمر بچے بچیاں ہاتھوں میں موبائل پکڑے گھومتے دکھائی دیتے ہیں جنہیں صحیح غلط اور اچھے برے کی سمجھ ہی نہیں ہو...... اس سلسلے میں سب سے اہم ذمے داری والدین پر عائد ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو اس کی خرابیوں سے بچانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں...... سب سے پہلے تو بہت چھوٹے بچوں کو ہر ممکن اس سے دور رکھیں، تھوڑا سمجھدار ہونے پر اگر انہیں انٹرنیٹ کا استعمال کرنا بہت ضروری ہے تو انہیں باقاعدہ ایک تربیت کے مرحلے سے گزاریں اور اس کے نقصانات اور فوائد اچھی طرح سمجھائیں...... وقت کی پابندی کا احساس دلائیں، جوان ہوتے ہوئے بچوں کے لیے جو بڑی کلاسوں میں آ چکے ہوتے ہیں ان کے لیے تعلیمی مقاصد کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شروع سے نظم و ضبط کے عادی ہوں گے تو آگے بھی انٹرنیٹ کا بے دریغ اور غلط استعمال نہیں کر سکیں گے۔ (یعنی ساری بات بہترین تربیت کی ہے)

جی ہاں ان پر نظر رکھیں خواہ آپ کی حیثیت کتنی اچھی کیوں نہ ہو، انہیں بہت قیمتی موبائل ہرگز لے کر مت دیں۔ جب تعلیمی دور مکمل ہو جائے قیمتی موبائل اس وقت کے لیے اٹھا کے رکھ دیں، بچوں کو آپ گھر میں قید نہیں کر سکتے...... ان کو باہر نکلنا ہوتا ہے اسکول کالج جانا ہوتا ہے اپنے ہم عمر دوستوں اور سہیلیوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔ ماں، باپ ہر وقت ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے میرے خیال میں جس طرح بچوں کو بیماریوں سے بچاؤ کے لیے حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے ہیں اسی طرح بہت چھوٹے بچوں کو جو درحقیقت ہماری سوچ سے کہیں زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں، بچپن میں اچھی تربیت اور اچھا ماحول دے کر، برا اور بھلا سمجھا کر ان کے مستقبل کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ جو کام کچی عمر میں ہو سکتا ہے وہ بڑی عمر میں جا کر کرنا بہت مشکل اور کبھی، کبھار ناممکن ہو جاتا ہے۔ (بالکل درست کہا، ایک، ایک قدم پر تو روک ٹوک نہیں ہو سکتی ہاں برے بھلے کی تمیز سکھا دیں اور ہر حالت میں بچہ ماں، باپ سے سچ بولے اس طرح بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ انشاءاللہ)

پاکیزہ ✧...... اچھا اپنے دیگر مشاغل کے بارے میں بھی آگاہ کریں؟

سکینہ فرخ ❖...... مشاغل تو شادی سے پہلے کی داستان ہے، مجھے پینٹنگ کا بے حد شوق تھا اور دوسرا شوق مطالعے کا تھا...... شادی کے بعد مشاغل کہہ لیں یا مصروفیت بس گھر، شوہر اور بچے...... وقت مل جائے تو کچھ نہ کچھ پڑھتی ضرور ہوں اور لکھنا تو مجھے سب سے اچھا لگتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... آج کی نئی رائٹرز کے لیے کیا کہیں گی...... کوئی پیغام، مشورہ......؟

سکینہ فرخ ❖...... میں تو خود کو ابھی طفلِ مکتب ہی سمجھتی ہوں مگر جو بات مجھے اتنا پڑھنے اور لکھنے کے بعد سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ ایک واقعہ کو اگر دس لوگوں سے بیان کرنے کو کہا جائے تو دس کہانیاں اور دس انداز جنم لیتے ہیں۔ یہی لکھنے یا بیان کرنے کا ہنر ہے...... سو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کہانیاں آپ کے الفاظ، انداز اور سوچ کی محتاج ہوتی ہیں، نئی رائٹرز کو یہی مشورہ دوں گی اپنے لکھنے کے انداز میں انفرادیت کو قائم رکھیں۔ (اور سب سے بڑھ کر پڑھنے کی یعنی ہر ادب کا مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیں)

پاکیزہ ✧...... شعر و شاعری سے کس حد تک دلچسپی ہے، کبھی مشاعرہ اٹینڈ کیا؟

سکینہ فرخ ❖...... میں نے یونیورسٹی کے زمانے تک بڑی شاعری کی...... مختلف رسائل اور یونیورسٹی کے میگزین میں میری شاعری شائع بھی ہوئی...... اور یونیورسٹی لیول کے مشاعرے میں انعام یافتہ بھی قرار پائی...... بعد میں کم ہوتے ہوتے شعر کی آمد ختم ہوتی گئی۔ شعرا میں مجھے غالب اور فیض پسند ہیں، افسوس کی بات ہے کہ آج کل اچھے اور باوزن اشعار سننے کو یا



پڑھنے کو نہیں مل رہے سو شاعری سے دلچسپی تقریباً ختم ہی سمجھیے۔ (ارے پھر تو اپنی گم شدہ شاعری تلاش کیجیے)

پاکیزہ ✧...... عام لوگوں کے رویّوں میں کیا خاص بات نوٹ کرتی ہیں؟

سکینہ فرخ ❖...... مجھے مصنوعی اور بناوٹی قسم کے لوگوں سے بہت الجھن ہوتی ہے...... منافقت نہ میری طبیعت میں ہے اور نہ دوسروں کی برداشت ہوتی ہے۔ تو بس یہی چیزیں ہیں جو دوسروں کے رویوں میں اگر نظر آ جائیں تو میں کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہوں (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... ایک لکھاری کی حیثیت سے کیا ہر وقت کہانیوں کی تلاش میں رہتی ہیں یا خود ہی کہانی وارد ہو جاتی ہے؟

سکینہ فرخ ❖...... ایک لکھاری کو کہانیاں آس پاس نظر آ جاتی ہیں کبھی اندر سے وارد ہو جاتی ہیں...... کتنی ہی کہانیاں ہیں جو ذہن میں آئیں اور چہل قدمی کر کے کہیں اڑن چھو ہو گئیں لکھنے کی مہلت نہ مل سکی۔ اس لیے تلاش کرنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ (ارے جلدی، جلدی کہانیاں پکڑیں کہ وہ اڑ نہ پائیں)

پاکیزہ ✧...... آج تک جو لکھا اس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟ مزید کیا موضوع تلاش کریں گی؟

سکینہ فرخ ❖...... اس اعتبار سے مطمئن ہوں کہ کم لکھا مگر جو بھی لکھا بہت دیانتداری کے ساتھ لکھا اور اس نیت سے لکھا کہ کسی کے لیے بھی مشعلِ راہ بن جائے۔ البتہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں، اس امید کے ساتھ لکھوں گی کہ اس میں اور بہتری آئے...... موضوع تو بے شمار ہیں۔ (ہاں یہ تو ہے جب تک انسانی حیات تب تک موضوعات)

پاکیزہ ✧...... رشتے داریاں میکے کی ہوں یا سسرالی کس حد تک نبھاتی ہیں؟

سکینہ فرخ ❖...... جس حد تک نبھانا میرا فرض ہے۔ فی زمانہ رشتے داریاں نبھانا ایک فن بن چکا ہے۔ پہلے قریبی رشتے داروں کے ہاں بے تکلفی سے آیا جایا جاتا تھا۔ کھایا پیا جاتا تھا۔ جانے والے کو بھی خوشی ہوتی تھی اور میزبان بھی کھلے دل اور محبت سے آنے والے کا خیر مقدم کرتے تھے کوئی بناوٹ یا دکھاوا نہیں تھا مگر جناب اب تو اگر آپ بغیر اطلاع دیے اپنے کسی انتہائی قریبی رشتے دار کے گھر بھی چلے جائیں تو بد تہذیب کہلائیں سو اب قدم پھونک، پھونک کر رکھنے کا دور آ چکا ہے۔ دکھاوا اور بناوٹ خلوص کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔ (ارے اس پر تو یہ کہا جاتا ہے ناں کہ آپ اتنی دور سے آئیں اور ہم نہ ملیں تو آپ کو ہی زحمت ہوگی اس لیے فون ضرور کر لیں۔ ویسے اتنے بڑے شہر میں اتنی مصروفیات کے ساتھ یہ ضروری نہیں ہو گیا!)

پاکیزہ ✧...... نئی نسل کو کیا نصیحت کریں گی یا عموماً کیا کرتی ہیں؟

سکینہ فرخ ❖...... نئی نسل تو ہمارے مستقبل کی

امید ہے ہمارا سرمایہ ہے میں ان کے روشن مستقبل کی دعا کے ساتھ انہیں یہی نصیحت کروں گی کہ آپ کی تربیت بے شک آپ کے والدین اور بزرگوں کی ذمے داری ہے مگر فرماں برداری کرنا آپ کا کام ہے۔ اپنے والدین اور اساتذہ کی عزت کریں۔ ان کی بات غور سے سنیں، صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ وہ علم حاصل کریں جو آپ کو آپ کے وجود سے روشناس کرائے...... آپ کے باطن کو روشن کردے...... اس علم کے بغیر ساری ڈگریاں بیکار ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آج کی نسل کیا جذبۂ حب الوطنی کے معنی جانتی ہے؟

سکینہ فرخ ✤...... جب ہماری نسل نے ہوش سنبھالا تو اپنے بزرگوں کو اور والدین کو وطن کی محبت میں سرشار پایا...... یہ حب الوطنی ہمارے اندر سے ان میں منتقل ہوئی۔

گزشتہ کچھ سالوں میں ایسا محسوس ہوا جیسے نئی نسل حب الوطنی کے معنی سمجھ نہیں پا رہی...... ان میں اس جوش اور ولولے کی کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جو پہلے کی نسلوں کی پہچان تھا...... مگر اب ایسا نہیں...... ہمارے نوجوان اور بچے اس جذبے سے سرشار ہیں...... اور اب یہ کام ہماری نسل کا ہے کہ ان کے اس جذبے کو پروان چڑھائیں اور ان کی محبت کو مایوسی میں ہرگز بدلنے نہ دیں۔ (ہاں جب بڑے ہی یہ کہیں گے کہ اس ملک میں کیا رکھا ہے، ساری عمر اسی کا کھایا مگر ناشکرے کے ناشکرے ہی رہے تو ہمارے بچے بھی تو یہی سیکھیں گے ناں۔ سراسر ہماری ہی غلطی ہے)

پاکیزہ ✧...... یہ بھی بتا دیں کہ ماہنامہ پاکیزہ سے واقفیت کب اور کیسے ہوئی؟

سکینہ فرخ ✤...... پاکیزہ سے واقفیت بہت پرانی ہے...... جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا کہ اس ساتھ کو پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے کہ جب پاکیزہ پڑھنا شروع کیا...... اور لکھنے کا تعلق گزشتہ دس سالوں سے ہے...... پرانی سہیلی ہے پاکیزہ...... اور دوستی جتنی پرانی ہو اتنی ہی لاجواب ہو جاتی ہے۔ (بالکل جی، سمندر سے گہری، ہمالیہ سے اونچی اور پکی پکی)

پاکیزہ ✧...... ہماری اس بزم پر بھی اپنی رائے ضرور دیں کہ آپ کو یہاں آنا کیسا لگا؟

سکینہ فرخ ✤...... آپ کی بزم میں شامل ہونا بے حد خوب صورت تجربہ تھا...... بہت اچھا لگا اتنی ساری باتیں کر کے...... یہ سلسلہ بھی خوب ہے اسے جاری رہنا چاہیے۔ پاکیزہ ایک خاندان کے مانند ہے، اس کے پڑھنے والے اور لکھنے والے محبتوں کی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے کے بارے میں جاننا اور ان کے خیالات کا علم ہونا اچھا لگتا ہے۔ آپ کا مجھے یاد کرنے پر بے حد شکریہ...... (یہ تو ہمارا فرض تھا بھئی)

پاکیزہ: آپ کا بھی بے حد شکریہ کچھ جوابات تشنہ رہ گئے سکینہ فرخ خیر آپ نے اپنی مصروفیات سے وقت نکالا اور بزم میں آئیں...... پھر کبھی نہ کبھی آپ کو گھیر لائیں گے، ہم کیا بلکہ ہمارے قارئین آپ کی شخصیت کے مزید پہلو جاننا چاہ رہے تھے مگر خیر، تحریر بھی تو لکھاری کی شخصیت کی عکاس ہوتی ہے۔ سو اس کے لیے شکریہ......!

☆☆☆

پیارے قارئین سکینہ فرخ کی شخصیت کی مزید خوب صورتیاں ان شاء اللہ ان کی تحریروں میں ملاحظہ کیجیے گا۔

اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ ہماری پیاری سکینہ فرخ و ان کے اہلِ خانہ کو سدا شاد و آباد رکھے اور ان کی تحریریں ہمارے پاکیزہ کو رونق بخشتی رہیں، الٰہی آمین!

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں



دائیں سے یاسمین رشید، رضوانہ پرنس، شگفتہ شفیق، دردانہ نوشین خان، شائستہ اعجاز، افسر سلطانہ، عذرا رسول، ناہید فاطمہ حسنین، نزہت اصغر

گلہائے رنگا رنگ کے درمیان ایک شام

عذرا رسول کی باغبانی کے نام

دردانہ نوشین خان

ہر ایک لفظ کو اسمِ ... بنایا ہے
وہ عکس پھر بھی غزل میں جہاں سمایا ہے

جب میں پاکیزہ بہنیں، پاکیزہ محفل، پاکیزہ رائٹرز کے الفاظ پڑھا کرتی تھی تو گل ریحان و چنبیلی کی بھینی بھینی مہک میری سانسوں میں اتر جاتی تھی۔ ماہنامے کا نام پاکیزہ یہ معطر، معتبر اور مبارک انتخاب ضرور کسی صاحبِ ایمان و ذوق کا کمال ہو سکتا تھا۔

وہ صاحبِ ایمان و ذوق معراج رسول ہیں جو 2004ء تک خونِ جگر سے عملی طور پر اس کو سینچتے رہے پھر بوجہ طبی مجبوری و بیماری پس پردہ چلے گئے اللہ انہیں سلامت رکھے آمین۔ اب تقریباً گولڈن جوبلی مکمل کرنے والا ماہنامہ پاکیزہ ان کی جواں ہمت، جواں سال، خوش خصال بیگم عذرا رسول کے زیرِ انتظام ہے اور معیار میں سرمو فرق نہیں آیا۔ ڈیفنس، مین کورنگی روڈ پر واقع ان کے دفتر ان سے ملاقات کے لیے گئی۔ (کراچی میں قیام کا کچھ سلسلہ ہو گیا تھا تو اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا جاتا) رسالے کا یہ دفتر کئی منزلہ عمارت ہے۔ یہ ایک نہیں چار جرائد کا دفتر ہے۔ ایک ہی ادارے سے جاری ہونے والے چار مقبول ترین ماہنامے پاکیزہ، سرگزشت، جاسوسی اور سسپنس کے اس عمارت میں الگ، الگ دفاتر ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر لیب، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ روم، لائبریری اور نماز کے لیے الگ ہال ہے۔

مستعد انسان اور ملک کے ہر حصے میں جانے

پہچانے پرویز بلگرامی نے بیرونی گیٹ پر میرا استقبال کیا۔ راہنمائی و تعارف کے مراحل طے کرتے ہوئے نزہت اصغر (ایڈیٹر پاکیزہ) کے کمرے تک چھوڑ گئے۔ نزہت اصغر اور آمنہ حماد (معاون پاکیزہ) سے ادبی موضوعات پر گفتگو رہی۔ اسی دوران عذرا رسول صاحبہ کی تشریف آوری کی اطلاع ملی اور ہم ان کے آفس کے وزیٹنگ روم میں آ گئے۔ ایک جانب صوفہ سیٹ اور میز ہے، دوسری جانب آفس مجلس اور منتخب کتب کی دیواری لائبریری ہے۔ فوٹو گرافی ہوتی رہی...... چائے کے دوران ادارے کے ماضی، سخت محنت اور مقام پر گفتگو ہوتی رہی۔

6 اکتوبر ہفتہ چار بجے شام عذرا رسول صاحبہ نے ناچیز کی پزیرائی و اعزاز میں سن سیٹ کلب میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔

یہاں میں اپنا تعارف کرا دوں تو قارئین کی اجنبیت دور ہو جائے۔ میری تعلیم ایم اے (انگریزی ادب، سیاسیات) ہے۔ میں نے کچھ عرصہ ماہر مضمون انگلش کی حیثیت سے پڑھایا ہے بوجوہ یہ جاب چھوڑ دی۔

میرے ایک فرزند اور تین دختران ہیں، میرے شوہر گزشتہ برس وائس پریذیڈنٹ (VP) بینک آف پنجاب ریٹائرڈ ہوئے ہیں، میری چھ کتب...... اندر جال ناول، پہلا زینہ (افسانوی مجموعہ)، ریت میں ناؤ افسانوی مجموعہ، رنگ ماہی، (افسانوی مجموعہ) پھولوں کی رفو گری، (نظموں کا مجموعہ)، ریت کے بت (ناولٹ کا مجموعہ) چھپ کر آ چکی ہیں۔ دوسرا ناول صفد (جو آج کل پاکیزہ میں سلسلے وار چھپ رہا ہے) بعد ازاں کتابی شکل میں آ جائے گا۔ انشاء اللہ ...... علاوہ ازیں چوتھے افسانوی مجموعے اور میرے ادبی تنقیدی مضامین کا بھاری مواد موجود ہے جو ایک کتب تیار کر سکتا ہے۔ میں نوائے وقت ملتان میں ادبی و سماجی موضوعات پر لکھتی ہوں۔ یہ تو ہوا میرا مختصر تعارف......

اب واپس اس یادگار دلنشیں تقریب کی طرف چلتے ہیں۔ سن سیٹ کلب کشادہ لان اور خوب صورت بینکویٹ ہالز پر مشتمل ہے۔ اس کے اندر پارکنگ کا وسیع انتظام ہے اس کے علاوہ بچوں کی تفریح کے لیے جھولے، سلائیڈز اور جمپنگ پیڈ بھی موجود ہیں جو میرے ہمراہ دُختر یہ دیباج (بڑی بیٹی) اور اس کے دو عدد شرارتی پیارے بچوں کے لیے باعثِ کشش تھے۔



دائیں سے استادہ، شگفتہ شفیق، عذرا رسول، رضوانہ پرنس، زینیا حسن
(نشستوں پر) غزالہ رشید، صبیحہ شاہ، سیما مناف اور عقیلہ حق

بالائی ہال کے زینے پر عذرا رسول، نزہت اصغر، آمنہ حماد نے پُرتپاک استقبال کیا۔ پھولوں کے گلدستے اور ماہنامہ پاکیزہ کا تازہ شمارہ اعزاز کے ساتھ پیش کیا گیا۔ عذرا رسول نے قیمتی ملبوسات کے تحفے سے نوازا۔ تحائف کا یہ سلسلہ دیگر ادیب سہیلیوں کی جانب سے بھی ہوا۔ افسر سلطانہ نے ساڑی کا روایتی تحفہ دیا۔ غزالہ رشید نے اپنی خوب صورت کتاب نہال، دوعیاں کا یادگار تحفہ دیا۔ ناہید فاطمہ حسنین نے گفٹ کے علاوہ کتب سے نوازا۔ فوٹو گرافی کا سلسلہ تو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اب تو سب کے موبائل کیمرے ہوتے ہیں اور سب ان لمحات کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ شگفتہ شفیق کی کوتک سروس نے تو دوران تقریب ہی فیس بک تک تصویری خبر بھی لگا دی۔ غزالہ رشید، رفعت سراج، صبیحہ شاہ، سیما مناف، ناہید فاطمہ حسنین، افسر سلطانہ، شگفتہ شفیق، عقیلہ حق، رضوانہ پرنس کو میں قبل ازیں جانتی ہوں میری ادبی کولیگ ہیں۔ ان سے ملاقات کا مزہ ویسا ہی تھا جیسے دور رہنے والی بہنوں سے ہوتا ہے۔ عذرا رسول کے اسکول کے زمانے کی سہیلیاں جو تا حال گہری سہیلیاں ہیں یعنی یاسمین رشید، شائستہ اعجاز سے مل کر مجھے بھی سہیلیانہ اپنائیت محسوس ہوئی۔ ہما بیگ شاعرہ صحافی اور سماجی کارکن ہیں، ان سے مل کر اچھا لگا۔ سیما رضا ریڈیو سے منسلک ہیں، انہوں نے انٹرویو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک خوب صورت سی نوجوان خاتون تصاویر اور وڈیوز بنا رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ شائستہ اعجاز کی بہو شہزادہ ہیں۔

لبنیٰ خیال (ایڈیٹر جاسوسی) افسانہ نگار بھی ہیں۔
یمنیٰ احمد شاعرہ اور مصنفہ ہیں اور ایڈیٹر سسپنس ہیں۔
واقعی عورت مرد کے شانہ بشانہ آ گئی ہے اک جاسوسی اور سسپنس عورت بھی کر سکتی ہے۔ زینیا حسن پاکیزہ کی قاری اور سماجی کارکن ہیں، میرا ناول صفد بھی پڑھ رہی ہوں گی، تبصرے کی امید کی جاتی ہے۔ افشاں آفریدی پاکیزہ کی اولین رائٹرز میں سے ہیں۔ جرمنی سے تشریف لائی تھیں۔ اور اب عذرا رسول...... ون اینڈ اونلی عذرا رسول......

قارئین نے ان کو تصاویر میں دیکھا ہوگا۔ یہ دوپٹا



دائیں سے لبنیٰ خیال (جاسوسی ڈائجسٹ) عذرا رسول (مدیرۂ اعلیٰ) یمنیٰ احمد (سسپنس ڈائجسٹ) دُردانہ نوشین خان، آمنہ حماد و نزہت اصغر (ماہنامہ پاکیزہ)۔

سلیقے سے پاکیزہ انداز میں سر پر اوڑھتی ہیں اور یہ اسٹائل ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا ہے۔ دوسری پہچان عذرا رسول کی مخروطی انگلیوں میں قیمتی اسٹون والی بڑی، بڑی انگوٹھیاں ہیں، ظاہری تاثر سے کہیں بڑھ کر عذرا رسول کا اعلیٰ اخلاقی حسن ہے۔

میں نے ادبی رسائل کے ایڈیٹرز کو بالعموم ہمہ دانی کا تفاخر مصروفیت کی بیزاری اور مغرور پایا ہے۔ میرا پاکیزہ سے عشروں پر محیط واسطہ نہیں ہے مگر عذرا رسول کا حسنِ اخلاق عشروں پر محیط واسطے پر سبقت لے گیا ہے۔ یہ تبسم یہ تکلم سب کے لیے ہو کر بھی اپنے لیے لگا۔

ملنا ملانا، گپ شپ، خوش ہونا جاری رہا۔ سب اپنی نشستوں پر براجمان ہوئے، میز کے سرے پر عذرا رسول کھڑی تھیں تو میں ان کے برابر میں تھی۔ عذرا رسول نے اپنائیت بھرا خطاب کیا۔ میں نے ان کی محبت کا شکریہ ادا کیا۔

سامعین پر نگاہ پڑتی اور ٹھہرتی رہی۔

افسر سلطانہ خاموش طبع مگر سمندر گہری ہیں، یہ انگریزی کی پروفیسر ہیں، ان کے پاس rich انگریزی ادب کا خزانہ ہے۔

صبیحہ شاہ بھی کم گو ہیں، دیکھ بھال، ناپ تول کر بولنا اچھی عادت ہے۔ وہ اپنی تحریروں کی طرح مشاہدہ اور سماعتوں کو ترجیح دیتی ہیں۔

شگفتہ شفیق اپنے نام کی طرح شگفتہ ہیں، رفعت سراج نے میرے افسانوں کی دل کھول کر داد دی۔

رفعت سراج کے ناول امانت میں دل کی بات میری کتاب ریگ ماہی کے پیش لفظ میں بھی مذکور ہے یعنی اللہ کا انس کو بارِ امانت اٹھا لینے پر ظلوماً جہولاً کہنا یوں



نزہت اصغر ادارے کی جانب سے دردانہ نوشین کو پھول اور تحائف دیتے ہوئے

لگا کہ ہم میں کسی سطح پر ہم خیالی ہے۔

رضوانہ پرنس جو اس وقت نجی چینل کے لیے سوپ لکھ رہی ہیں، اسکرپٹ رائٹنگ کا حوصلہ دلاتی رہیں، ہماری بیشتر افسانہ نگار بہنیں ڈراما رائٹر بن چکی ہیں۔ جس میں آج سیما مناف وغیرہ سرِفہرست ہیں۔

غزالہ رشید کا افسانوی مجموعہ نہاں اور عیاں زیرِ مطالعہ ہے تبصرہ بھی ہوگا۔

ڈائجسٹ ایک نرسری ہے، جس میں پنیری لگتی ہے، اگائی جاتی ہے پھر اس کے تروتازہ پودے ادب، ڈراما شاعری و دیگر قلمی شعبہ جات میں منتقل ہو جاتے ہیں اور کچھ ڈائجسٹ کی قامت بلند کرنے کے ساتھ، ساتھ قلمی ہنر ادب میں بھی دکھاتے ہیں۔

گفت و شنید کے بعد مہمان نوازی کا دسترخوان کھلا...... لمبی ڈنر ٹیبل ایک سرے سے دوسرے سرے تک نعمتوں سے سجی ہوئی تھی۔ پاستا، حلیم، سموسے، سینڈوچ، فرائز، پیسٹری، گرما گرم گلاب جامن، کولڈ ڈرنکس اور کافی، چائے...... مہمان خواتین کی بچیاں (دریہ، فاطمہ، شزہ اور ادارے کی معاونین خواتین الگ میز پر خوش گپیوں اور لذتِ کام و دہن میں مصروف تھیں۔

مغرب کے بعد مہمانوں کے رخصت ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عذرا رسول صاحبہ نے اپنی ہمراہی میں اپنی گاڑی میں ہمیں ہماری قیام گاہ شاہراہ فیصل پر ڈراپ کیا۔

الحمدللہ بہت ہی خوشگوار یادیں اور باتیں میرے ہمراہ ہیں جو مجھے سُرور دیتی رہیں گی۔

☆☆☆

تقریب کی دلہن دُردانہ نوشین......

تحریر: ناہید فاطمہ حسنین

آج سن سیٹ کلب کا جیسمین ہال لکھاری خواتین کی مدھم سُروں میں گفتگو اور کھنکتے قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ رنگ و بو کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آتا تھا۔ تقریب کی دلہن تھیں، مظفر گڑھ سے آئی مایہ ناز مصنفہ، کالم نگار، دُردانہ نوشین خان...... میری بے حد عزیز اور پرانی دوست...... ڈائجسٹ کی دنیا سے ادب کا سفر طے کرتی واپس ڈائجسٹ کی دنیا میں لوٹی ہیں۔

انہیں ادبی اور پاپولر فکشن لکھنے میں ملکہ حاصل ہے۔ نثری نظم کہتی ہیں اور بہت خوب کہتی ہیں۔ بہترین ناقد ہیں۔ ہماری اکثر فون پر گفتگو رہتی ہے۔ میری شاعری کے مجموعے پوروں پر آسمان پر لکھارن کا تبصرہ ''بیاض'' میں چھپ چکا ہے۔ آج کل ماہنامہ پاکیزہ میں صفہ کے نام سے ان کا قسط وار منی ناول توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کوئی شخصیت جو لکھاری ہو اور پاکیزہ میں چھپتی بھی ہو اس کے اعزاز میں عذرا رسول محفل نہ سجائیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ۷ اکتوبر کی شام سن سیٹ کلب میں اسی سلسلے کی گہما گہمی تھی۔

تقریب کی دلہن اگر دردانہ نوشین تھیں تو ستاروں (لکھاری) کے جھرمٹ کا چاند عذرا رسول تھیں۔ اس سے قبل دردانہ کے اعزاز میں ایک نشست عذرا اپنے آفس میں بھی رکھ چکی تھیں۔ جس میں دردانہ کو آفس کولیگز سے ملوانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تقریب میں میرے حالیہ افسانے ماماز بے بی کا چرچا رہا، جس نے میرا مان اپنی ساتھی لکھاریوں میں مزید بڑھا دیا۔ عقیلہ حق نے مہندی لگے گورے، گورے ہاتھوں میں میری بھرپور تھپکی لی۔ مجھے لگا عقیلہ کی پور، پور میرے افسانے پر مجھے داد دے رہی ہے۔ ''تم نے میرے بیٹے وجیہہ کی



دائیں سے سیما رضا ردا، افشاں آفریدی، دردانہ نوشین اور عذرا رسول



رفعت سراج، دردانہ نوشین کو چاہت بھرا تحفہ دیتے ہوئے

کہانی لکھ دی۔" عقیلہ کا محبت سے بھرا یہ جملہ مجھے مزید چوڑا کر گیا۔ اسی طرح کے جملے ایک لکھاری کے لیے ٹانک کا کام کرتے ہیں۔

نزہت اصغر ملکوتی مسکراہٹ لیے اینٹرنس پر ہی مل گئیں...... "دیکھیں ہم آپ کے انتظار میں کہاں کھڑے ہیں۔" ان کے جملے پر میں اور وہ بغل گیر ہو گئے اندر یمنیٰ اور آمنہ سب کے استقبال کے لیے مستعد کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

صبیحہ شاہ کم گو بظاہر سنجیدہ مگر کبھی، کبھی اندر کا بچہ شرارت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ غزالہ رشید چٹکلے چھوڑنے کی مشین...... سیما مناف پیاری دوست طبیعت کی خرابی کے باوجود آئیں کہ بلانے والی پُرخلوص ہستی عذرا رسول کی تھی۔ سیما رضا بلا کی سُریلی آواز بہترین شاعرہ و براڈ کاسٹر...... ہر دم مسکرانے والی شگفتہ شفیق، اسم باسمٰی، شگفتہ کے برابر میں پرنسز رضوانہ پرنس بیٹھی تھیں۔ مگر ہمیں ان کی شوخیاں نظر نہیں آئیں۔ اس دفعہ ہمیں وہ بہت سنجیدہ لگیں۔ شاید اس لیے کہ چینلز پر خوب، خوب داد سمیٹ رہی ہیں۔

دردانہ نے کچھ علمی و ادبی سوالات اٹھائے، ان کا روئے سخن خاص میری جانب تھا۔ "شاعری اور نثر میں کون سا ذریعۂ اظہار آسان ہے؟"

"نثر میں ہم زیادہ سہولت سے مدعا بیان کر لیتے ہیں، شاعری کی طرح یہاں اظہار میں پابندی، بحر، ردیف، قافیہ، وزن وغیرہ کی قید نہیں ہوتی۔" میرے جواب پر دردانہ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اور اشعار میں ہم صرف دو مصرعوں میں ایک مکمل بات کہہ لیتے ہیں۔"

ادب اور پاپولر اسٹور پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ عذرا نے لندن اردو کانفرنس کے حوالے سے اپنی فی البدیہہ تقریر کا حوالہ دیا۔ جس پر زوردار تالیوں کی گونج فضا میں پھیل گئی۔ رفعت سراج نے کہا جب تک ہمارے مطالعے میں قرآن پاک کا ترجمہ شامل نہیں ہم اچھے لکھاری نہیں بن سکتے۔ تقریب کے دیگر شرکا...... افسر سلطانہ، شائستہ اعجاز، زیبا حسن، افشاں، یاسمین رشید اور ہما بیگ نے گفتگو میں کم حصہ لیا لیکن بہت توجہ سے ایک، ایک کو سنا...... گفتگو کے لحاظ سے یہ ایک شاندار تقریب رہی۔ عذرا رسول کی مہمان نوازی میں نہ کوئی کمی آئی اور نہ ہی ان کی محبت میں...... جس کا ہر شخص قائل و گواہ ہے۔ مینیو اتنا شاندار رکھتی ہیں کہ ہر شخص داد دیتا ہے۔ آخر میں ادارہ پاکیزہ اور تمام رائٹرز کے لیے پُرخلوص دعائیں حاضر ہیں۔

☆☆☆

شادی بیاہ کے موقع پر بڑھتی ہوئی نمود و نمائش اور اس کے اثرات

شائستہ زریں

حدیث نبوی ﷺ ہے کہ "جس نے شہرت اور دکھاوے کا لباس پہنا اللہ قیامت کے دن اس کو ذلت والوں کا لباس پہنائے گا۔"

لیکن ہمارے سماج کا المیہ یہ ہے کہ ارتقا کا سفر طے کرنے کے باوجود نمود و نمائش کی جانب ہمارا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اس میں سرِ فہرست شادی بیاہ کی تقریبات ہیں۔ شادی کی تاریخ طے ہونے سے لے کر چوتھی کی رسم تک ظاہری چکا چوند نے بڑھ کر ایک ایسا سماجی مسئلہ بنا دیا ہے جو اب ایک مستقل آزار کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جہیز و بری کے جواہرات اور ملبوسات بالخصوص دلہن کے عروسی ملبوسات کے دام آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ لیکن نظروں کو خیرہ کرنے والی ان کی ظاہری شوشا اور تقریبات کی دھوم دھام ان لوگوں کی توجہ بھی اپنی جانب مرکوز کر لیتی ہے جو اس اہتمام کی استطاعت نہیں رکھتے اور وہ بھی چاند چھونے کی آرزو میں مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان ہی حوالے سے پیش نظر ہم نے ایک سروے کا اہتمام کیا اور سروے میں شریک معزز خواتین سے معلوم کیا کہ......

سوال 1۔ شادی بیاہ کے موقع پر بڑھتی ہوئی نمود و نمائش کے اثرات معاشرے پر کس طرح مرتب ہو رہے ہیں؟

سوال 2۔ آپ کے خیال میں عروسی ملبوسات کا دیدہ زیب ہونا ضروری ہے، اعلیٰ دام کا ہونا، کام معیاری اور پائیدار ہونا یا آرام دہ ہونا؟

قیصر سلطانہ
(گھریلو خاتون)

1: شادی بیاہ کے موقع پر نمود و نمائش کے اثرات کسی بھی دور میں اچھے ثابت نہیں ہوئے۔ اور اس دور میں تو صرف اللہ سے پناہ مانگی جا سکتی ہے۔ چار سے پانچ گھنٹے کے لیے پہنا جانے والا جوڑا ایک سے ڈیڑھ لاکھ میں اور پھر جو بکس میں بند ہوا تو برسوں بھی نہ کھلا۔ اسی طرح ڈھولکی، مایوں، مہندی اور الا بلا۔ کبھی غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ ہم نے نہ صرف اپنی بلکہ اُن زندگیوں کو بھی ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے... جو یہ سب افورڈ نہیں کر سکتے۔ اللہ راہِ ہدایت عطا کرے، آمین۔



2: جوڑا دیدہ زیب ہو، معیاری، آرام دہ ہو قیمتی نہ ہو کم قیمت میں بھی یہ سب مل سکتا ہے۔

طیبہ صفی
(معلمہ...... آسٹریلیا)

1: شادی بیاہ کی تقریبات میں بے جا اسراف نہ صرف لڑکی کے والدین پر اضافی بوجھ کا باعث بنتا ہے بلکہ لڑکے کے والدین بھی اس بے جا نمود و نمائش سے کہیں نہ کہیں اس اسراف کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس سے بالاتر کہ دونوں جانب کے خاندان متمول ہیں یا نہیں؟ ان اخراجات کو بھرتے، بھرتے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اگر والدین متوسط ہیں اور دو سے زیادہ بیٹیاں ہیں تو بعض اوقات اخراجات کا بوجھ والدین کے بعد بھائیوں کے کاندھے پر آ جاتا ہے دوسری جانب اگر خاندان کا کوئی فرد شادی میں بے حساب خرچ کرتا ہے تو اسی خاندان کے کم حیثیت افراد کے



لیے مقابلے کی فضا اُستوار ہو جاتی ہے جس سے بچوں کے دل اپنے والدین کی کم حیثیتی کی وجہ سے ایک جانب تو چھوٹے ہوجاتے ہیں تو دوسری طرف گھر کی فضا بھی مہینوں مکدر رہتی ہے۔ جہیز کے منفی اثرات سے تو ہم سب اچھی طرح واقف ہیں اس لعنت کی بدولت والدین قرضوں کے بوجھ تلے الگ کئی نسلوں تک جکڑے رہتے ہیں۔ جس سے معاشرے میں مایوسی اور معاشی بدحالی کے ساتھ، ساتھ انسانی ذہنی و جسمانی صحت متاثر ہوتی ہے اور اسٹریس اور ڈپریشن جیسی بیماریاں بھی فروغ پاتی ہیں۔

2: میرے خیال میں عروسی ملبوسات کی تیاری میں سب سے زیادہ خیال لڑکی کی پسند اور ناپسند کا رکھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو ماؤں کو اپنی بیٹیوں کی تربیت پر زور دینا چاہیے۔ ان کو سمجھانا چاہیے کہ بجائے اپنے باپ کا بوجھ جہیز کے ساتھ، ساتھ مہنگے ملبوسات کی خریداری سے اور بڑھائیں، سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے ایسے ملبوسات خریدیں جو خوب صورت مناسب قیمت کے بھی ہوں۔ ملبوسات ایسے ہوں جنھیں آسانی سے دوبارہ بھی پہنا جاسکے۔ لڑکیاں اس طرح اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے کپڑے خود ڈیزائن کر سکتی ہیں۔ جس سے نہ صرف بچت ہوگی بلکہ اپنے ڈیزائن کردہ کپڑے پہن کر زیادہ خوشی بھی ہوگی۔ اس سلسلے میں تھوڑی سی مارکیٹ ریسرچ کر کے ملبوسات کو دیدہ زیب آرام دہ اور معیاری بنایا جاسکتا ہے اور بے جا اسراف سے بچا کر والدین کی مدد کی جاسکتی ہے۔

سعدیہ ہما شیخ
(ایڈووکیٹ)

1: شادی بیاہ کے موقع پر روز بروز نمود و نمائش بڑھتی جارہی ہے۔ اور معاشرے پر بھی اس کے برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ جہیز اور بری کی نمائش، کھانے میں کئی اقسام کی ڈشز، بہت سا طبقہ جو افورڈ نہیں کرسکتا وہ بھی اس دوڑ میں شامل ہے۔ اور اس نمائش کی وجہ سے نکاح مشکل ہو رہا ہے اور بے راہ روی بڑھ رہی ہے۔ لاکھوں لڑکیاں جہیز کی وجہ سے گھر بیٹھے بوڑھی ہو رہی ہیں۔ والدین کا بوجھ بڑھ رہا ہے اور وہ قرض لے کر یہ رسمیں پوری کر رہے ہیں۔



2: عروسی ملبوسات کا دیدہ زیب ہونا ضروری ہے۔ مگر اتنا فینسی نہیں کہ چند دن بعد ہی الماریوں کی زینت بن جائیں۔ خوشنما کے ساتھ آرام دہ ہونا چاہیے۔ تاکہ استعمال میں آسکیں۔ رہی بات دام کی تو اپنی چادر کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔

شگفتہ یاسمین
(میڈیا پرسن)

1: ہر شخص خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ اور ہر کوئی چاہتا ہے کہ شادی کے ملبوسات خاص طور پر دلہن کا جوڑا بہت قیمتی اور ہیوی ہو۔ جو لوگ افورڈ نہیں کر سکتے وہ گوٹے کے کام کی طرف چلے جاتے ہیں لیکن اپنی سکت کے لحاظ سے سب پورا زور لگا دیتے ہیں کہ عروسی جوڑا بہت خوب صورت ہونا چاہیے اور اس کے اثرات سے لوگ قرضوں میں ڈوبتے جارہے ہیں۔ جو افورڈ کر سکتے ہیں ان کے لیے چار سے پانچ لاکھ اتنی بڑی بات نہیں۔ لیکن جو افورڈ نہیں کر سکتے اُن کے لیے پچاس ہزار بھی بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ اور شادی کا جوڑا پچاس ہزار میں بھی لینا چاہیں تو دکاندار کام کر دیتے ہیں۔ اسٹیچنگ کے لیے دیں تو ٹیلر شرارہ پانچ سے چھ ہزار تک سی کر دے گا۔ یوں خوب سے خوب تر کی تلاش میں مہنگائی ہر طرح سے معاشرے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

2: ہر دلہن کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ سب سے زیادہ منفرد، اچھی اور خوب صورت لگے۔ شادی کا جوڑا ایک ہی بار پہنا جاتا ہے یا پھر کسی بہن بھائی کی شادی میں پہن لیا جاتا ہے۔ اور اگر دو تین سال بعد پہننے کے لیے نکالیں تو وہ پہننا محال ہوتا ہے کہ اب وہ فٹ ہی نہیں آرہا اگر گنجائش ہوئی تو ڈھیلا کر لیا ورنہ قمیص تبدیل کر کے پہن لی۔ مہنگے سے مہنگا شرارہ بھی دو تین بار پہنا جاتا ہے کیونکہ وہ ڈیزائن پرانا ہو جاتا ہے۔ دلہن یہ نہ سوچے کہ میں کتنی اچھی لگوں گی؟ اور عروسی لباس سے اسٹیٹس بھی پتا چلے گا۔ کہتے ہیں آنکھیں پہلے دیکھتی ہیں تو جو آنکھوں نے دیکھ کر امیج بنالیا وہی اچھا۔ چونکہ تھوڑی دیر کے لیے پہنا جاتا ہے اس لیے آرام دہ سے زیادہ دیدہ زیب ہے کہ نہیں؟ لوگوں کے لیے اس کا ڈیزائن کتنا اہم ہے؟ اور لوگوں میں کتنا مقبول ہو رہا ہے؟ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

سیم علی
(ڈیزائنر)

1: شادی بیاہ کے موقع پر بہت زیادہ نمود و نمائش کے بہت برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اشرافیہ کے لیے ان رسم و رواج پر پیسہ پانی کی طرح بہایا جانا کوئی بڑی بات نہیں مگر اس کے اثرات جب متوسط طبقہ تک پہنچتے ہیں تو اُن کو اِن سے نبرد آزما ہونے کے لیے بڑی جان مارنا پڑتی ہے۔ اور ان تقریبات کے فرض کی ادائیگی کی خوشی سے زیادہ قرض کی ادائیگی کا غم سوار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنی چادر دیکھ کر اپنے مسائل کو...



مدِنظر رکھتے ہوئے کم خرچ بالا نشیں پر عمل کرنا چاہیے۔

2: عروسی ملبوسات کا دیدہ زیب ہونا ایک فطری تقاضا ہے۔ اور اس کا مہنگا ترین پائدار، آرام دہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ پہننے والے ملبوسات کو بس آپ کی شخصیت کو مسحور کن اور جاذبِ نظر بننے کی حد تک محدود رہنا چاہیے۔

روبی طٰہٰ
(ماہرِ تعلیم)

1: بہت نقصان دہ اثرات مرتب ہو رہے ہیں مثلاً شادی کے کارڈ کو ہی لے لیجیے۔ ہم ایک سادہ سا شادی کارڈ بنا کر بھی دعوت نامہ دے سکتے ہیں۔ لیکن اب تو



شادی کا کارڈ ہی اچھا خاصا قیمتی بننے لگا ہے جو قطعاً غیر ضروری ہے اس کے علاوہ شادی کی مختلف تقریبات کے لیے فلاور، قیمتی ڈریسز اور کھانے ان سب چیزوں سے ہمارے معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ کیونکہ جو والدین یہ سب نہیں کر سکتے۔ اُن کے بچے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے لگتے ہیں۔ وہی کام جو سادگی سے کیا جاسکتا ہے۔ کم پیسوں میں وہ ہم شوبازی کے چکر میں مہنگا کر دیتے ہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہم نے ترقی تو کر لی لیکن نمود و نمائش کا شوق آج بھی برقرار ہے جو نئی نسل کے لیے کوئی اچھا پیغام نہیں ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ان کو یہ پیغام دیا جائے کہ شادی بیاہ کی تقریبات میں بے جا اخراجات کے بجائے یہی پیسہ اپنا گھر جو بنانے جارہے ہیں اس میں لگائیں۔ شادی شدہ زندگی میں اصل اہمیت دولہا دلہن کے باہمی اخلاص اور عزت و احترام کے رویوں کی ہے۔

2: دلہن کے عروسی ملبوسات اور اس سے متعلقہ اشیا دیدہ زیب ہونی چاہئیں زیادہ مہنگی نہیں۔ کیونکہ

ملبوسات ایک مرتبہ کے بعد شاذ و نادر ہی پہنے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو زیادہ قیمتی کام بھی ایک دو سال میں خراب ہو جاتا ہے۔ سو بہتر یہی ہے کہ ایسے عروسی ملبوسات بنائے جائیں جو بعد میں بھی استعمال کیے جا سکیں۔ عروسی ملبوسات نہ صرف دیدہ زیب ہوں بلکہ اُن پر کام بھی ایسا ہو کہ رکھنے سے خراب نہ ہو۔ اور آرام دہ بھی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ لڑکی کی پسند کا بھی خیال رکھنا چاہیے کیونکہ پہننا تو اسی کو ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اُمِ راحیل

(ہربلسٹ)

1: اس کے منفی اثرات پڑ رہے ہیں اس لیے کہ ہر کوئی وہ چیز افورڈ نہیں کر سکتا جو دکھائی جا رہی ہے، جس سے متاثر ہوا جا رہا ہے۔ آج کل شادی کے جوڑے تقریباً دو دو، تین تین لاکھ کے بھی چل رہے ہیں اور ہر کسی کے لیے یہ افورڈ کرنا اتنا آسان نہیں ہے اور بچیوں کے ذہن



کچے ہوتے ہیں یا اُن میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی تو وہ اس کے لیے ضد کرتی ہیں۔ تو مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے پیرنٹس قرض لینے یا کوئی ایسا غلط کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کے بل پر وہ یہ سب خرید سکیں۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں بُرائی پروان چڑھتی ہے لہٰذا کوشش یہ کرنی چاہیے کہ نمود و نمائش سے بچا جائے اور مایوں و مہندی اور شادی کے کھانے پر جو بے تحاشا اسراف ہوتا ہے وہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسلامی طریقۂ کار کے مطابق سادگی سے مسجد میں نکاح کیجیے۔ گھر میں قریبی عزیزوں کے ساتھ ولیمے کا اہتمام کیجیے۔ اس طرح اسراف اور گناہ سے بچیں گے۔

2: آج کل کے رجحان کے مطابق عروسی ملبوسات بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اُن کو خریدنا بہت مشکل ہے۔ تو عروسی ملبوسات کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ کی حیثیت کے مطابق آرام دہ ہوں اور اُن کے دام بھی اچھے ہوں۔ کیونکہ اُسے پہن کر دلہن کو کافی دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔ ہیوی میک اپ اور جیولری ہوتی ہے اور جب ڈریس اتنا تکلیف دہ ہوگا تو دلہن بہت زیادہ بے چینی اور بے آرامی کا شکار ہو جائے گی اور یہ پریشانی اور تھکن اس کے چہرے پر آ جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ پائیداری بھی ہو۔

خوشبو

(گھریلو ملازمہ)

۱: ہم غریبوں کے لیے تو سادہ سی شادی ہی بہت مشکل کام ہے۔ ایک بیٹی کی شادی چند ماہ پہلے کی تھی اسی کا قرض ابھی تک ادا نہیں ہوا دوسری بیٹی کا رشتہ طے ہے۔ اس کی شادی کی تیاری کروں تو کیسے کروں؟ ذرا بھی دھوم دھام کریں تو زیادہ قرض لینا پڑتا ہے۔ جو اچھی بات نہیں۔

۲: شادی کا جوڑا تو خوب صورت ہی اچھا لگتا ہے، پہن کر دلہن آرام سے بیٹھے تو اور بھی اچھی بات ہے۔

غزالہ عزیز

(اسکرپٹ رائٹر، افسانہ نگار)

1: شادی ایک مقدس مذہبی فریضہ ہے اور سنت نبوی ﷺ کی پیروی بھی ہے۔ مگر بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس اہم فریضے کو دولت کی نمود و نمائش اور گلیمر کی چکا چوند نے مشکل بنا دیا ہے۔ اور نمود و نمائش کے اس رجحان کو معاشرے کے اعلیٰ طبقے اور غیر ملکی چینلز کے غیر ملکی ڈراموں اور فیشن شوز نے مزید بڑھایا جو براہ راست ہمارے معاشرے کے متوسط اور غریب طبقے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ جو اس نمود و نمائش کا حصہ بننے کے لیے اپنی حیثیت اور چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جو اب ہمارے معاشرے کے ہر طبقے کے لوگوں کا مزاج اور ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہمارے مذہب نے زندگی کے ہر معاملے میں سادگی کا درس دیا لیکن معاشرے میں بڑھتے ہوئے اس رجحان نے غریب

ماں باپ کی ذمے داریوں پر بھاری بوجھ لاد دیا ہے۔

۲: اپنی شادی پر سب سے خوب صورت دلہن نظر آنا ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ جس کے لیے وہ بہترین عروسی لباس کا انتخاب کرتی ہے۔ لیکن آج کل پرانے رجحان کے مطابق عام درزیوں سے عروسی ملبوسات سلوانے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ اب دلہن کی ہر چیز ڈیزائنڈ ہوتی ہے۔ شادی پر دلہن کا انتخاب مشہور و معروف اور مہنگے ترین ڈیزائنر کا تیار کردہ عروسی جوڑا ہوتا ہے۔ جسے پہن کر وہ خود کو کسی ریاست کی شہزادی تصور کرتی ہے۔ حالانکہ شادی کے دن صرف چند گھنٹوں کے لیے زیب تن کیے جانے والے لباس کو مہنگے ترین ہونے سے زیادہ خوب صورت، آرام دہ اور دیدہ زیب ہونا چاہیے۔

مریم عرفان

(طالبہ)

۱: شادی ایک مقدس فریضہ ہے جو بدقسمتی سے دکھاوے اور نمود و نمائش کا ذریعہ بن چکا ہے۔ ہم اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ جس نئے رشتے کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اسے مضبوط بنائیں بلکہ ہم اپنا فرض سمجھتے



ہیں کہ شادی میں فضول رسم و رواج کی دوڑ میں سب سے آگے رہیں۔ بعض گھرانوں میں تو لڑکیوں کو پیشہ ورانہ تعلیم اسی لیے دلوائی جاتی ہے تاکہ وہ ملازمت کر کے نمود و نمائش کے ساتھ شادی کرنے میں والدین کی مدد کر سکیں۔ اگر لڑکا اور لڑکی دونوں کی تربیت ایسے خطوط پر کریں کہ وہ نمود و نمائش اور دکھاوے پر دھیان دینے کے بجائے نئے بننے والے رشتے کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے پر زور دیں کہ بے تحاشا دولت خرچ کر کے بھی ہم رشتوں کو مضبوط نہیں بنا سکتے۔

۲: لباس انسان اپنے آرام، پسند اور حیثیت کو مدِنظر رکھ کر پہنتا ہے۔ لباس کو آرام دہ ہونا چاہیے پھر چاہے وہ مہنگا ہو یا سستا یہی معاملہ عروسی ملبوسات کا ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں لباس صرف ہمارا جسم ہی نہیں بلکہ ہمارے اندر کے احساسِ کمتری اور تمام عیوب کو چھپانے کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ خود اعتمادی اور شعور کا فقدان ہونے کی وجہ سے عروسی ملبوسات کی قیمت اور برانڈ کا تذکرہ کرنے اور سننے ہی میں ہم خود کو برتر محسوس کرتے ہیں۔

☆☆☆

قارئین کرام!

سرکارِ دو عالم حضرت محمد ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ "سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جس میں خرچ کم ہو"۔ شادی بیاہ میں زیادہ دھوم دھام اور نمود و نمائش ہمارے معاشرے کا عام چلن بن گیا ہے۔ کیونکہ ہماری کم نظری اسے ہی خوشی کا حاصل سمجھتی ہے جبکہ خوشی کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ سروے میں شامل بیشتر خواتین نے نہ صرف نمود و نمائش کے منفی اثرات کی نشاندہی کی ہے بلکہ سادگی و میانہ روی کو زیادہ اہمیت دی۔ دلہن کے عروسی ملبوسات پر بے تحاشا رقم خرچ کرنے کے مقابلے میں دیدہ زیب اور اعلیٰ معیار کو ترجیح دی ہے جو خوش آئند ہے۔ یوں تو ہر دم ہم قناعت، سادگی و کفایت شعاری کی باتیں کرتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو ہم نے عمل تو کم کیا ہاں زور سے آمین کی عملی تفسیر بن جاتے ہیں۔ یہ بجا کہ دلہن شادی کی ہو یا ولیمے کی سب کی نگاہوں کا مرکز نگاہ ہوتی ہے لیکن اگر دلہن کے ملبوسات دیدہ زیب اور خوش رنگ ہوں تب کم قیمت کے لباس میں بھی وہی دلہن خوب صورت و باوقار نظر آ سکتی ہے، اصل اہمیت مہنگے دام کی نہیں اس مقدس بندھن کی ہوتی ہے جس کے طفیل دلہن یہ ملبوسات زیب تن کرتی ہے۔ بلاشبہ ظاہر داری دائمی خوشیوں کی ضمانت نہیں ہوتی۔ محدود وسائل میں سادگی سے ادا کی جانے والی شادی کی تقریبات بھی دولہا، دلہن کے لیے خوشیوں کا پیغام لا سکتی ہیں۔

☆☆☆



گوشۂ ظرافت

ادارہ

> مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔
> اپنے باذوق قارئین کے لیے اس مرتبہ نامور مزاح نگار شفیق الرحمٰن کی کتاب پرواز سے اقتباس آپ کی حسِ مزاح کی نذر......

تحت الشعور اور لاشعور

تحت الشعور اور لاشعور......از حضرت فرید شعوری۔
چھاپنے والے...... بے شعور برادرز۔ قیمت، درج نہیں۔ تحت الشعور پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔

یہ ایک ماہرِ نفسیات کی معرکتہ الآرا کتاب ہے۔ ملک کی خوش نصیبی ہے کہ اب فرید شعوری جیسے حضرات نے بھی کتابیں لکھنی شروع کر دی ہیں۔ فرید صاحب ابھی ابھی یورپ سے تشریف لائے ہیں۔ یورپ میں انہوں نے کئی سال ”ڈاکٹر سگنل فراڈ (Dr Signal Fraud)“ کے ساتھ کام کیا ہے۔ فرید صاحب کے نام میں بھی ایک زبردست راز مضمر ہے۔ پہلے ان کا نام کچھ اور تھا اور لیکن فراڈ صاحب کے ساتھ رہتے رہتے فرید ہو گیا۔

ہم نے اس کتاب پر تقریباً ڈیڑھ ماہ صرف کیا لیکن ہم کچھ بھی نہیں سمجھ سکے۔ اتفاقاً ہماری نظر دیباچے پر پڑ گئی۔ قابل مصنف نے کتاب کی ترکیب استعمال دیباچے میں دے دی ہے۔ کتاب سمجھنے کے لیے اپنے تحت الشعور کو جگانا پڑتا ہے اور اپنے تحت الشعور کو جگانا ایک طویل عمل ہے۔ مصنف نے صاف، صاف لکھا ہے کہ ہر شخص کو قدرت نے ایک تحت الشعور اور ایک عدد لاشعور عطا کیا ہے۔ کئی بدقسمت انہیں کھو بیٹھے ہیں۔ ایسوں کو کہیں سے تحت الشعور ادھار مانگنا پڑے گا ورنہ وہ کتاب ہرگز نہیں سمجھ سکیں گے۔ خیر ہم نے کوشش کی اور اس کتاب کو سمجھنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئے۔

کتاب کا نصف حصہ تو بے حد دلچسپ ہے۔ اس حصے میں مصنف نے اپنے اور ڈاکٹر فراڈ کے حالات لکھے ہیں۔ چند ایک واقعات تو نہایت ہی پُرلطف ہیں، مثلاً ایک مرتبہ مصنف اور ڈاکٹر فراڈ صاحب دونوں آوارہ گردی کے سلسلے میں گرفتار کر لیے گئے۔ جب انہوں نے بیان دیتے وقت کہا کہ یہ دونوں اپنے تحت الشعور کو تازہ ہوا دینے نکلے تھے تو عدالت پر گھڑوں اور بالٹیوں پانی پڑ گیا۔

پھر ایک مرتبہ ان دونوں کو دھوکے اور فریب کے شبہ میں دھر لیا گیا۔ جب ان کی تلاشی ہو رہی تھی تو یہ مسکرا کر بولے کہ قصور تو ہمارے لاشعور کا ہے، ہمارا نہیں...... اور پولیس منہ دیکھتی رہ گئی۔

مصنف کی زندگی کے اکثر ناقابلِ فراموش لمحے اور پیاری گھڑیاں ڈاکٹر فراڈ کے ساتھ جیل میں گزری ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف نے تحت الشعور کے معنی، اس کی اہمیت اور فوائد بتائے ہیں۔ کتاب لکھنے کا خیال مصنف کو یورپ میں آیا۔ کیونکہ وہاں تحت الشعور کا رواج ہے۔

ایک مرتبہ مصنف اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک معزز شخص اپنے لڑکے کو لایا اور بولا...... ”ڈاکٹر صاحب! ذرا اس بچے کو تو ملاحظہ فرمایئے۔ پچھلے سال یہ بھلا چنگا تھا۔ اب نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے...... روز بروز اس کا تحت الشعور خراب ہوتا جا رہا ہے۔“

یہ سن کر مصنف کو اپنے ملک ہندوستان کی حالت زار پر رونا آ گیا اور وہ سچ مچ رو دیا۔ اس روز اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس اہم مضمون پر ضرور کتاب لکھے گا، چنانچہ اس نے فوراً ایک کتاب لکھ دی۔

مصنف نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے دن پھر رہے ہیں اور یہاں بھی آہستہ آہستہ تحت الشعور کا رواج ہوتا جا رہا ہے۔

آپ نے لاریوں پر لکھی ہوئی عبارت تو ضرور پڑھی ہو گی۔ جلی الفاظ میں درج ہوتا ہے۔

”آ گا وا پئی موت سے کوئی بشر نہیں۔“
”لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے۔“
”پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔“
”خدا حافظ......“ وغیرہ، وغیرہ

دراصل یہ ایک نہایت ہی لطیف اشارہ ہے تاکہ مسافروں کے تحت الشعور میں یہ بات پہلے ہی بٹھا دی جائے کہ ڈرائیور کا ارادہ خطرناک ہے اور وہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔

اسی طرح جب لوگ کسی مہمان کو رخصت کرتے وقت کہتے ہیں کہ سلامت روی و باز آئی۔“ تو ان کے دل میں دراصل یہ ہوتا ہے کہ ”تو سلامت رہے میں باز آیا۔“

سر جے سی۔ بوس نے ثابت کیا تھا کہ نباتات میں بھی جان ہے اور پودے بھی ہماری طرح جیتے جاگتے ہیں۔ لیکن فرید صاحب نے جہاں انسانوں اور حیوانوں کے تحت الشعور پر تجربے کیے ہیں وہاں بے جان چیزوں کے تحت الشعور پر بھی دھاوا بول دیا ہے۔ اس میدان میں وہ سر بوس سے چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک ذاتی مشاہدہ قلمبند کیا ہے۔

ایک مرتبہ وہ فورٹ عباس سے واپس آنا چاہتے تھے۔ وہاں ایک ٹرین شام کو پہنچتی تھی۔ رات بھر کھڑی رہتی اور علی الصباح واپس روانہ ہوتی۔ اس رات گاڑی بہت دیر سے آئی۔ کوئی ایک بجے کے قریب انجن کو فرصت ہوئی اور اسے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ منہ اندھیرے ڈرائیور نے انجن کو تیار کیا اور پلیٹ فارم پر لے آیا جہاں گاڑی کھڑی تھی۔ پورے پانچ بجے گاڑی چل پڑی۔ اگلے اسٹیشن پر رکی تو چند مسافر ڈرائیور کے پاس آئے اور گڑگڑا کر بولے۔ ”بھیا بہاول نگر کی عدالت میں آج ہماری حاضری ہے۔ یہ رہے ہمارے ٹکٹ، ہم کچھ اور بھی دیں گے ہمیں انجن میں بٹھا لے۔“

ڈرائیور نے مسکرا کر فائر مین کی طرف دیکھا اور بولا...... ”تم انجن میں بٹھا لوں؟ سبحان اللہ، یہ بھی ایک ہی رہی۔“ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مانتے ہی نہیں تو جھنجلا کر بولا۔ ”کیا مصیبت ہے آخر تم لوگ گاڑی میں کیوں نہیں بیٹھتے؟“

مسافروں نے چلا کر کہا...... ”کون سی گاڑی میں؟“

”اس گاڑی میں......“ ڈرائیور نے انجن کے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا لیکن وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ گاڑی غائب ہے۔ گاڑی پچھلے اسٹیشن پر رہ گئی تھی۔ انجن سیٹی دے کر اکیلا چلا آیا تھا۔ آخر ڈرائیور انجن لے کر واپس گیا اور گاڑی لایا۔

ذرا غور فرمایئے...... اس میں انجن کے تحت الشعور کی ہلکی سی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ گاڑی دیر سے آئی۔ انجن تھکا ہوا تھا۔ علی الصباح چپکے سے گاڑی کو چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

ہمارے خیال میں انجن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔

مصنف نے چھٹے باب میں ایک اودبلاؤ کے لاشعور کو نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ ایک اور جگہ مصنف نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ مصنف نے ایک بندر خریدا، فرصت کے اوقات میں بندر اور مصنف خوب کھیلتے کودتے۔ اس کے بعد بندر کو محلے میں چھوڑ دیا جاتا کہ وہ پڑوسیوں سے بھی ملاقات کر سکے۔ ایک روز وہ دونوں کھیل رہے تھے کہ دفعتاً مصنف کو ایک ضروری کام یاد آ گیا اور اس نے جلدی سے بندر کو ساتھ والے کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا اور خود باہر چلا گیا۔

واپسی پر اسے خیال آیا کہ دیکھیں تو سہی بندر کمرے میں کیا کر رہا ہے، چنانچہ آہستہ سے مصنف جھکا اور دروازے کے روزن کے پاس اپنی آنکھ لے گیا اور روزن میں دیکھنے لگا۔ روزن میں اسے ایک آنکھ دکھائی دی جو دوسری طرف سے دیکھ رہی تھی۔

بندر کی آنکھ...... بندر دوسری طرف سے جھانک رہا تھا جو شکوک مصنف کو بندر پر تھے وہی بندر کو مصنف پر نکلے۔ بندر کے تحت الشعور کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا دی جا سکتی ہے۔

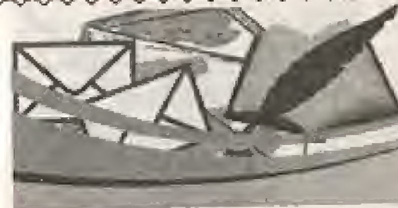
مصنف نے بچوں کے شعور پر بے شمار تجربے کیے ہیں اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ بچے گو دیکھنے میں کافی...... بے وقوف نظر آتے ہیں لیکن ان کے شعور کافی تیز ہیں۔

ایک بچے سے امتحان میں پوچھا گیا کہ خط استوا کے جنگلات کے چھ مشہور ترین جانوروں کے نام لکھو۔ بچہ جغرافیے میں کمزور تھا لیکن اس کا لاشعور بلا کا ہشیار تھا۔ چنانچہ بچے نے جواب لکھا تین چیتے اور تین شیر......

لاشعور نے بچے کی لاعلمی بھی چھپالی اور میزان بھی پورا کر دیا۔

اسی طرح ایک بچہ حساب کا ایک سوال حل کر رہا تھا۔ ہر مرتبہ جواب غلط آتا اور ایک آنے کی کمی رہ جاتی۔ ماسٹر صاحب چڑ گئے۔ چنگھاڑ کر بولے۔ ”جب تک صحیح جواب نہیں نکالو گے چھٹی نہیں ملے گی۔“ بچے کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے دو مرتبہ اور کوشش کی لیکن جواب میں ایک آنے کی بدستور کمی رہی، آخر ایسے میں اس کا تحت الشعور آڑے آ گیا۔ بچے نے جلدی سے جواب نکالا اور ایک آنہ جیب سے نکال کر سلیٹ پر رکھ دیا اور ماسٹر سے بولا۔ ”یہ لیجیے، یہ رہا وہ ایک آنہ اب مجھے چھٹی دے دیجیے۔“

☆☆☆



مدیرہ

بہنوں کی محفل

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

تمام حمد و ستائش اس ذات والاصفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ ہمارے وطن پاکستان میں امن و سکون کی فضا اور خوش حالی رہے اور تمام اہل وطن اس کی ترقی و نیک نامی کے لیے کوشاں رہیں۔ (الہٰی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو!

سلام اور پرخلوص دعائیں لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں..... پچھلے دنوں مصنفہ دردانہ نوشین خان جو پاکیزہ میں آج کل منی ناول صفحۂ تحریر کر رہی ہیں۔ مظفر گڑھ سے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے پاکیزہ کے آفس آنے اور پورے اسٹاف سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور یہاں پہنچنے کے اگلے ہی دن اپنے ہونہار داماد کے ساتھ وہ آفس چلی آئیں اور تمام اسٹاف سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ ہمیں بھی ان کا آنا اچھا لگا۔ دوران گفتگو انہوں نے کچھ رائٹرز کے نام لے کر ملنے کی خواہش کا اظہار کیا کہ ایسا ممکن ہے کہ آپ ان سب سے میری ملاقات کروا دیں تو میں نے آفس سے ان کی رخصت کے فوراً بعد ایک پروگرام ترتیب دیا چونکہ ٹائم ان کے پاس کم تھا تو ان کی بتائی ہوئی رائٹرز سے آمنہ اور نزہت اصغر نے فوری رابطہ کیا اور یوں ہفتہ 16 اکتوبر کو دردانہ نوشین کے ساتھ ایک شام منانے کا پروگرام طے کر لیا گیا۔ میں ذاتی طور پر ان تمام رائٹرز کا شکریہ ادا کروں گی جو میرے ایک ہی بلاوے پر خوشی خوشی میری محفل کو رونق بخشنے آ جاتی ہیں۔ سیما مناف کافی دنوں سے فلو بخار میں مبتلا تھیں اور ان کے آنے کی امید کم ہی تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ آئیں جس کی بہت زیادہ خوشی ہوئی۔

اللہ کریم ہماری ساری رائٹر دوستوں اور ریڈرز کو صحت و سلامتی سے رکھے اور سب یونہی خوشی ایک دوسرے سے ملتی رہیں۔ اس شام کی خوشگوار روداد دردانہ نوشین نے اپنے قلم سے لکھی ہے جو آپ پڑھیں گی، دردانہ کے خلوص اور محبت کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ انہوں نے ادارے میں آنے اور تمام لوگوں سے ملنے میں بہت دلچسپی لی اور مل بیٹھنے کا ایک اور بہانہ فراہم کر دیا۔

بہنوں باتیں تو بہت ہیں مگر کہیں میں یہ خوشخبری سنانا بھول نہ جاؤں کہ الحمدللہ میرے بیٹے ذیشان اور بہو کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ اس رب کریم کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ میری خوشیاں آپ سب سے شیئر کر کے دوبالا ہو جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں اگرچہ معراج صاحب کی طبیعت کافی خراب رہی مگر شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں علم ہو گیا اور پوتی زینب کی خوشخبری سن کر طبیعت میں کچھ بہتری آئی الحمدللہ۔ بس آپ سب دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں جو یقیناً آپ لوگ رکھتی ہیں۔ ہاں فریدہ جاوید تمہاری بیماری کی بابت پتا چلا..... اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ تمہیں جلد صحت نصیب ہو اور تم ہم سے ملنے کراچی آ سکو۔

رفاقت جاوید تمہاری خلوص بھری باتیں اور بھرپور توجہ سے کی گئی گفتگو بہت انرجی فراہم کرتی ہے سلامت رہو۔ میری ان تمام قاری بہنوں کا بھی بہت شکریہ جو فون اور پیارے، پیارے خطوط کے ذریعے مجھ سے جڑی رہتی ہیں، اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتی ہیں اور تعریف و تنقید سے ہماری رہنمائی بھی کرتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے یہاں فرداً فرداً نام تو نہیں لیے جا سکتے اور وہ بھی بہنیں جو باقاعدگی سے خطوط تو نہیں لکھتیں مگر کسی نہ کسی طرح اپنی رائے پہنچا دیتی ہیں ان سب کا بے حد شکریہ......

اچھا بہنو! اس دفعہ تو کافی باتیں ہو گئیں..... ان شاء اللہ بقیہ گفتگو اگلی نشست پر..... جب تک کے لیے اللہ حافظ......!

دعا گو عذرا رسول......!

☆☆☆

عزیز بہنو! پاکیزہ کی اس محفل میں آپ جس خلوص و محبت سے شرکت کرتی ہیں وہ قابل قدر ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہنوں کو اس محفل میں جگہ مل جائے مگر کبھی صفحات کی کمی آڑے آ جاتی ہے تو کبھی خطوط کی طوالت..... اب آپ ہی بتائیں کیا کریں.....؟ اس دفعہ بہنوں نے رسالے کی قیمت بڑھنے پر ملا جلا اظہار خیال کیا، کچھ نے بہت اچھی تجاویز دے کر ہمارا حوصلہ بڑھایا جس کے لیے بہت نوازش..... یہ حقیقت ہے کتابیں مہنگی نہ بھی ہوں تو عام رجحان اس طرف نہیں جاتا، ہاں مادی چیزوں پر تو ہم ٹوٹے پڑتے ہیں۔ خود میں بھی اپنے کو اس میں شمار کرتی ہوں۔ موبائل کے چکر سے لے کر ایک فضول کی بحث میں تو ہم پڑ جاتے ہیں مگر اپنے ذہن کے رزق کے لیے کوئی تگ و دو نہیں کرتے..... علم، معلومات، آگاہی، تعلیم ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ دماغ کو جتنا مثبت استعمال کریں گے اتنا ہی یہ روشن اور تیز ہوتا ہے اور ان حقائق سے سب آگاہ ہیں مگر عملی طور پر بھی شامل ہوں جبھی بہتری کی صورت نکلتی ہے۔ اتنے ہی لکھے کو بہت جانیں اور ہاں ماہ دسمبر دلہن نمبر ہوگا ان شاء اللہ..... اپنی نگارشات شادی کے احوال مع تصاویر بھیجنا چاہیں تو جلد از جلد بھیج دیں پھر جنوری سالگرہ نمبر ایک الگ آب و تاب کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ بس آپ کا بھرپور تعاون ہر آن درکار ہے۔

پیاری بہنو! اپنے پیغام سلام، رائے مشورے اور شکایات کے لیے بھی مندرجہ ذیل نمبر حاضر ہیں۔

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:122.107 ہیں۔

اور حسب روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالم اسلام کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے اور تمام مسلمانان عالم کو کامیابی نصیب ہو۔ (الہٰی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ رائٹر طلعت شوکت، راولپنڈی نے کلام ربانی ایک ہدایت کے نام سے 496 صفحات پر مشتمل ایک خوب صورت اور نہایت پر فیض کتاب مرتب کی ہے جس میں منتخب آیات کے تراجم اور تفسیر کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ آیات قرآنی، دوسرا دعاؤں اور تیسرا احادیث نبوی کی روشنی میں مضامین پر مشتمل ہے۔ روزمرہ زندگی کے بارے میں احکامات قرآنی یکجا کر کے قارئین کے لیے نہایت آسانی کر دی گئی ہے۔ نفیس سرورق سے سجی یہ کتاب فی سبیل اللہ فراہم کی جا رہی ہے۔ جان اللہ..... کو ہلال پرنٹنگ پریس، راولپنڈی نے چھاپا ہے۔

☆ پاکیزہ رائٹر، شاعرہ اور ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ نے آل پاکستان مقابلۂ مضمون نویسی بعنوان عظمت والدین میں شرکت کر کے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ سعدیہ کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ غازی ہیومن رائٹس ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) پاکستان کے زیر اہتمام منعقدہ پہلی قومی رائٹرز تربیتی ورکشاپ جو خانیوال میں ہوئی اس میں شاعرہ کی حیثیت سے خصوصی ایوارڈ حاصل کیا اس کے علاوہ پاکستان رائٹرز ونگ کے بینر تلے سعدیہ ہما کو ان کی علمی، ادبی، سماجی و صحافتی خدمات پر فروغ ادب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ (بے حد مبارک باد، اللہ آپ کو بلند اقبال کرے، اس کے علاوہ سعدیہ آپ کے وکالت کے شعبے میں بھی بے حد کارہائے نمایاں ہیں۔ ماشاء اللہ) اور سعدیہ کے حوالے سے سب سے نمایاں خبر یہ ہے کہ انہوں نے قرآن پاک کے ترجمہ، تفسیر و تجوید کے سلسلے میں دروس کی کامیابی سے تکمیل کر لی ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ مصنفہ رفاقت جاوید کے بہو، بیٹے اور پوتے، آسٹریلیا سے اسلام آباد آئے ہوئے ہیں۔ آج کل وہ اپنے بچوں کی خاطروں میں لگی ہوئی ہیں۔ (ماشاء اللہ، رفاقت! اللہ آپ کو اور آپ کی فیملی کو صحت و سلامتی سے رکھے، آمین)

☆ مستقل قاری رفیعہ ابدالی، کراچی آج کل اپنے بھائی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ (رفیعہ کی شادی کے لیے بھی سب بہنیں ضرور دعا کریں)